

اک دُعا نے اپجالیہا

نگہت محمد اللہ



اک دُعا نے بچا لیا

نگہت عبداللہ

عبداللہ کی طرح

انکم مارکیٹ - اردو بازار، لاہور

فہرست

7	تمام رستے لہو و طلب ہیں	❖
83	حنا کی مہک	❖
149	اک دُعا نے بچالیا	❖
218	سب موسموں کا ساتھی ہو	❖

تمام رستے لہو و طلب ہیں

”دیکھو سونیا! اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہوں اور تم جانتی ہو جب لڑکے کمانے والے ہو جائیں تو پھر ان کی ماؤں پر بس ایک ہی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ یعنی جلدی سے چاندی بہولے آئیں۔“

وہ سنجیدگی سے بات کرتے کرتے اچانک شوخی سے بولا تو سونیا بے ساختہ ہنس پڑی۔
 ”حالانکہ گھر میں ایک چاندی بہو پہلے ہی موجود ہے۔“ اس کے چونک کر دیکھنے پر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”میں بھابھی کی بات کر رہا ہوں اور اب اماں کے ساتھ ساتھ بھابھی بھی صبح و شام ہی ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔“
 ”پھر“

”پھر یہ کہ کچھ کرو، میرا مطلب ہے، مجھے بتاؤ کہ میں کب اماں اور بھابھی کو تمہارے گھر بھیجوں۔“

”میں اپنا مسئلہ تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔
 ”یار! میں اس عذر کو تسلیم نہیں کرتا۔“

”یہ عذر نہیں ہے عمر۔“ اُس کے لہجے کی عاجزی محسوس کر کے وہ کچھ کہتے رہ گیا اور وہ پوچھنے لگی۔

”کیا اب گھر میں تمہارا نمبر ہے، میرا مطلب ہے اگر تم سے چھوٹی بھی کوئی بہن ہے تو

”یہ تم نے اچھا کیا۔“ وہ امانے بغیر بولی، پھر گھڑی دیکھنے لگی۔
”اب تم گھر جانے کی بات کرو گی؟“

”ظاہر ہے۔“

”لیکن میرا مسئلہ تو وہیں رہ گیا۔“

”تمہارا کوئی مسئلہ نہیں ہے عمر عباس!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”تم کوئی لڑکی نہیں ہو، جو والدین کے کہنے پر مجبور ہو کر سر جھکا دو، اگر تم واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت میں اپنی مجبوریوں کی داستان سنانے میرے پاس مت آنا۔ کیونکہ میں ہر بات کا یقین کر سکتی ہوں لیکن ایک اسی بات کا نہیں کہ کوئی مرد مجبور ہو سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے۔“

”ہاں، میرا یہی مطلب ہے جو تم سمجھے ہو۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا تم ناراض ہو کر جا رہی ہو،“ اُس نے اتنی سادگی سے پوچھا کہ وہ بے ساختہ مسکرائی۔

”نہیں، ابھی میرے اندر جینے کی اُمنگ باقی ہے۔ تم سے ناراض ہو گی تو ساری اُمٹکیں دم توڑ..... جائیں گی۔“

وہ جاتے جاتے اپنی چاہت کا ایک اور اعتراف اس کی جھولی میں ڈالتی گئی تھی، جسے وہ پوری شدتوں کے ساتھ محسوس کرتا رہا اور جب وہاں سے اُٹھ کر گھر آیا تو بڑا مسخور سا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ ثوبیہ نے اُس کے بدلے ہوئے انداز دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا، تو وہ دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر بولا۔

”بس کیا بتاؤں بھانج! ابھی ابھی اُس سے مل کر آ رہا ہوں، جب ہی ہوش میں نہیں ہوں۔“

”اماں کو بتاتی ہوں، وہی تمہارے ہوش ٹھکانے لگائیں گی۔“

”ارے..... ارے“ اُس نے بڑھ کر ثوبیہ کی کلائی تھام لی۔

”ایسا غضب مت کیجیے گا۔“

”پھر جلدی سے اُس کا نام بتاؤ۔“

”مانی گاؤں سونیا! تم کیسی لڑکی ہو؟“ وہ باقاعدہ سر پیٹ کر بولا۔

”کتنی بار میں تمہیں اپنے گھر کے ایک ایک فرد کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا ہوں، تم کیسے بھول جاتی ہو، جب کہ کوئی اتنا لمبا چوڑا کنبہ بھی نہیں ہے۔“

”ہاں تم نے بتایا تو تھا کہ.....!“ وہ ہنسوچ انداز میں اُس کی طرف دیکھے گئی پھر الجھ کر بولی۔

”مجھے نہیں پتا! اصل میں مجھے غائبانہ تعارف یاد نہیں رہتے۔“

”تو چلو ملو دیتا ہوں سب سے۔“

”نہیں بھئی۔“ وہ فوراً بولی۔

”کیوں؟“

”بس ابھی نہیں۔“

”ویسے میں نے بھی خاص طور سے تمہارے بارے میں نہیں بتایا حالانکہ بھابھی بہت کر دیتی ہیں۔“

”ہاں تم اپنی بھابھی کا بہت ذکر کرتے ہو، کیسی ہیں وہ.....؟“

”بہت اچھی، بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ ہمارے گھر کی چھوٹی بڑی ساری خوشیاں ان ہی کے دم سے ہیں۔ اُن کا ہر روپ ہی مثالی ہے۔ اچھی بیوی، اچھی بہو، اچھی ماں، اچھی بھابھی، بہترین دوست، یقین کرو، اماں نے اتنی دُعا میں اپنی اولاد کو نہیں دی ہوں گی، جتنی بھابھی کے لیے اُن کے دل سے نکلتی ہیں۔ وہ ہیں اتنی پیاری۔“ وہ اُس کے منہ سے بھابھی کی اتنی تعریفیں سُن کر بولی۔

”پھر تو مشکل ہو گئی۔“

”کیسی مشکل۔“ وہ بالکل نہیں سمجھا۔

”یعنی تمہاری اماں دوسری بہو میں بھی ایسی ہی خوبیاں تلاش کریں گی۔“

”یہ تو ہے۔“ پھر اُسے چھیڑنے کی غرض سے بولا۔

”ویسے تم فکر مت کرو، میں پہلے ہی اماں کو یقین دلا چکا ہوں کہ بھابھی جیسی کوئی دوسری لڑکی اس پوری دنیا میں کہیں نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی بھیا جیسا خوش نصیب ہو سکتا ہے۔“

”نام..... نام پوچھنا تو میں بھول ہی گیا۔“ وہ یوں بولا جیسے اُسے خود بہت افسوس ہو رہا ہو۔

”اچھی بات ہے، تم روز نام بھول جاتے ہو، لیکن میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ اماں جس سے تمہاری بات چلانے کا سوچ رہی ہیں۔ اُس کا نام شبنم ہے۔“

”ٹوبیہ نے مزے لے کر بتایا، جب کہ وہ اپنا جگہ اُچھل پڑا۔

”کیا؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صاف منع کر دیں اماں کو، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“

”وجہ بتاؤ۔“ ٹوبیہ کا لہجہ پھر مشکوک ہو گیا۔

”آپ بھی عجیب ہیں بھائی! اگر میں جھوٹ موٹ عشق کی داستان سُنا دوں تو آپ فوراً یقین کر لیں گے۔“ وہ مذاق میں ٹالتے ہوئے بولا۔

”انداز تو تمہارا۔“ جھوٹ موٹ والے نہیں ہیں اور اُس روز تم نیند میں بڑبڑا بھی رہے تھے میں۔“ صاف سُنا تھا۔

”کیا نا تھا۔“ وہ ٹھٹھک گیا۔

”سوئی، سوئی پکار رہے تھے۔“

”اچھا اُس روز۔“ وہ بھی اپنے نام کا اَلب ہی تھا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

”وہ تو اُس روز میں سوئی مہینو ال نا تھا۔ پڑھ رہا تھا۔ خواب میں کچے گھڑے پر بیٹھی نظر آئی۔“

”ہا..... ہا..... ہا.....! ٹوبیہ پورا منہ کھول کر ہنس رہی تھی کہ جنید آگئے۔

ایک نظر اُس پر ڈال کر بیوی۔ پوچھنے لگے۔

”کیا بات ہے؟“

”کچے گھڑے سے پوچھیں۔“ وہ اُسی طرح ہنستے ہوئے بولی۔

”کچے گھڑے سے۔“ جنید حیران ہوئے اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ شپٹا کر

بولا۔

”اُن کا مطلب ہے، چکنا گڑا اور اشارہ آپ کی نظر ہے۔“

”کیا کیا؟“ وہ اُس کی چالائی پر چیخا اور اُس سے پہلے ساری بات جنید کو بتاتی وہ رفو

چکر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اماں کے پاس بیٹھا بحث کر رہا تھا۔

”آخر آپ اس گھر کے سکون کے درپے کیوں ہو گئی ہیں؟ کیا آپ کو یہ ہنستا ہوتا ماحول اچھا نہیں لگتا، جو میری شادی کا سوچنے لگی ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ زندگی کو اسی طرح چین سے گزرنے دیں۔ میری بیوی آگئی تو پھر سارا چین رخصت ہو جائے گا۔ ہر دوسرے دن بھابھی اور اُس کی لڑائی اور ان دونوں کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ میں اور بھیا.....!“

”بس بند کرو اپنی بکواس۔“ اماں نے ڈانٹ کہ اُسے چپ کرایا۔ پھر کہنے لگیں۔

”ٹوبیہ کی عادت نہیں ہے لڑائی جھگڑے کی اور مجھے تو شبنم بھی ایسی نہیں لگتی۔“

”یہ شبنم کہاں سے آگئی۔ اچھی بھلی تو چلی گئی تھی بنگلہ دیش۔“

”ہائیں۔“ اماں کیا سمجھتی، سچ مچ حیران ہو گئیں۔

”تمہیں کیسے پتا؟“

”مجھے سب پتا ہے۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا اور ٹوبیہ کو آتے دیکھ کر فوراً اُس نے تصدیق کروانے لگا اور کچھ اس انداز سے کہ ٹوبیہ یہی سمجھی کہ وہ فلمسٹار شبنم کی بات کر رہا ہے۔

”کیوں بھابھی! وہ شبنم بنگلہ دیش نہیں چلی گئی تھی؟“

”ہاں، اور دوبارہ آ بھی تو گئی ہے۔“

”دوبارہ جانے کا چانس ہے۔“

”اچھا!“ اماں جو باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھیں، پوچھنے لگیں۔

”لیکن بیٹا! بنگلہ دیش میں اُس کا کون ہے؟“

”کوئی بھی ہوا ماں! ہمیں کیا؟“ ٹوبیہ موضوع ختم کرنے کی غرض سے بولی تو وہ فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

”ہاں ہمیں کیا، کوئی بھی ہو ہمیں کیا۔“

”میں پوچھوں گی اُس کی اماں سے۔“ اماں نے کہا تو ٹوبیہ چونک کر دیکھنے لگی اور اُس سے پہلے کہ کچھ سمجھتی، وہ فوراً بول پڑا۔

”بھرجانی! آپ بیٹھنے کی کوشش مت کرنا۔“

”کیوں؟“

”ایمان سے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔“

”کھانا بالکل تیار ہے، جا کر نکالو، ہم بھی آرہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟ یعنی کھانا میں نکالوں؟“

”اب کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ بے چاری سارا دن تو لگی رہتی ہے۔“ اماں باقاعدہ ڈانٹنے لگیں تو وہ ٹوبیہ کو گھورتے ہوئے کچن کی طرف چلا گیا۔

اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ اس گھر کی چھوٹی بڑی ساری خوشیاں ٹوبیہ کے دم سے ہیں۔ دو سال پہلے جب جنید بھائی کی شادی نہیں ہوئی تھی تو تین افراد کی موجودگی کے باوجود گھر میں ہر دم خاموشی چھائی رہتی تھی۔ جنید بھائی صبح کے گئے رات کو لوٹتے تھے اور وہ یونیورسٹی کے بعد اکثر دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا۔ گھر جانے کے خیال سے ہی اُسے وحشت ہوتی تھی۔ جہاں اماں اپنے مخصوص تخت پر بیٹھی کچھ نہ کچھ سیتی رہتی تھیں۔ البتہ سال میں ایک آدھ بار کبھی آپا اپنے بچوں کے ساتھ آ جاتیں تو کچھ رونق ہو جاتی تھی۔

آپا، جنید بھائی سے بڑی تھیں اور تقریباً دس سال قبل بیاہ کر اسلام آباد گئی تھیں تو اب تک وہیں تھیں، اور وہ آپا کے ساتھ تو فری نہیں تھا، البتہ اُن کے بچوں کے ساتھ خوب اودھم مچاتا تھا اور اب جب کہ آپا بچے اسکول جانے والے ہو گئے تھے تو وہ اور بھی کم آنے لگی تھیں۔

دو سال قبل جب جنید بھائی کو ایک اچھی فرم میں جاب ملی تھی تو آپا ہی نے اماں کو ان کی فوری شادی کا مشورہ دیا تھا، اور ابھی اماں، جنید بھائی کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں کہ حیدر آباد سے اُن کی کسی پرانی اور گہری سہیلی کا خط آ گیا۔ انھوں نے اماں کو فوراً بلایا تھا۔ اماں اُسی روز جنید بھائی کے ساتھ چلی گئیں۔

اُن کی سہیلی کافی عرصے سے بیمار تھیں بے چاری بیوہ عورت اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں۔ بس ایک بیٹی ٹوبیہ تھی جسے اماں کے حوالے کر کے اطمینان سے ابدی نیند سو گئیں۔

اس وقت تو اماں کو جوان جہاں لڑکی کی ذمہ داری اٹھانا انتہائی مشکل لگا اور کافی دن تک وہ بوکھلائی ہوئی سی بھی رہی تھیں، پھر جب انھیں دوبارہ جنید بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے کا خیال آیا تو اُس وقت اُن کی نظر ٹوبیہ پر جا پڑی تھی، جو بالکل مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس سے پہلے انھوں نے ٹوبیہ کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ چودہ پندرہ سال کی شوخ و چنچل لڑکی تھی اور

اک دُعا نے بچالیا

اب یقیناً اُسے حالات نے سہا کر رکھ دیا تھا۔

اُس رات اماں نے یکسوئی سے سوچا کہ جب ٹوبیہ کی ذمہ داری اٹھائی ہے تو بھائی بھی ہے اور اس سے بہتر انداز سے وہ ہرگز نہیں نبھا سکتیں کہ اُسے اپنی بہو بنالیں۔ پھر نہ انھوں نے فیصلہ کرنے میں دیر کی اور نہ عمل کرنے میں اور حالات کی ستائی ہوئی وہ لڑکی ٹوبیہ، اُسے جب اجنبیوں کے دلیں میں اچانک بے پناہ اپنائیت اور محبت ملی تو وہ کھل اُٹھی۔ پیار کرنے والی شفیق اماں، ہر دم اُس کا دم بھرنے والا شرارتی دیور عمر عباس اور جان چھڑکنے والا شوہر جنید عباس۔ اتنی محبتوں کے لیے اُسے اپنا دامن تنگ نظر آنے لگا۔ بہر حال ان محبتوں کے عوض وہ اپنی جان دینے کو تیار تھی۔

دنوں میں اس گھر کی خاموشی کو اس نے یوں توڑا کہ درود پوار تک مسکراتے نظر آنے لگے تھے۔ اماں تو سارا گھر اس کے حوالے کر کے مطمئن سی ہو گئی تھیں اور اب اُن کی یہ آرزو تھی کہ اللہ جلد ٹوبیہ کی گود ہری کر دے۔

دو سال ہو گئے تھے شادی کو۔ اس دوران اماں خود کئی بار اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں اور ڈاکٹر نے ہر بار اُمید افزا جواب دیا تھا۔ ویسے دو سال کوئی اتنا زیادہ عرصہ بھی نہیں تھا، اس لیے کوئی تشویش نہیں تھی۔ البتہ اب انھیں عمر عباس کی طرف سے کچھ تشویش ہونے لگی تھی، جو شادی کے ذکر کا مذاق میں اُڑا دیتا تھا۔

☆☆☆

”پتا ہے سونیا! میں جس روز تم سے مل کر گھر جاتا ہوں تو جانے کیسے بھابھی کو شبہ ہو جاتا ہے۔“ وہ اُس کے ساتھ چلتے ہوئے بتانے لگا۔

”کس بات کا؟“

”بس یہی کہ تم سے مل کر آ رہا ہوں۔“

”لیکن اُس روز تو تم کہہ رہے تھے کہ تم نے کسی سے میرا ذکر نہیں کیا؟“

”میں واقعی ابھی کسی کو تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔ بھابھی نہیں پھر بھی!.....!“

پھر اُسے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

”مجھے لگتا ہے تمہاری شبیہ میری آنکھوں میں ٹھہر جاتی ہے، جو بھابھی مجھے دیکھتے ہی معنی خیزی سے مسکراتے لگتی ہیں۔“

وہ جیسے جبراً مسکرائی اور خدا حافظ کہتی ہوئی اسٹاپ کی طرف چل دی۔
لحہ بھر کُاُس نے سوچا۔ ٹوبیہ کا کام کل پر چھوڑ کر اُسے پکار لے، لیکن پھر ٹوبیہ کی خفگی کے خیال سے خود کو باز رکھا اور بایک اشارت کرنے لگا۔
رات میں حسب معمول جب ٹوبیہ دودھ کا گلاس لیے اُس کے کمرے میں آئی تو وہ سیدھا لیٹا آنکھیں بند کیے بہت دھیمی آواز میں گنگنا رہا تھا۔

اُن کا ہی تصور ہے، محفل ہو کہ تنہائی
ٹوبیہ نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر کھانس کر متوجہ کرتے ہوئے بولی۔
”ایمان سے تم شکل سے اتنے سیدھے لگتے ہو، یقیناً نہیں آتا کہ ان چکروں میں بھی پڑ سکتے ہو۔“

”کن چکروں میں؟“ وہ میسرانجان بن گیا۔
”تم اچھی طرح جانتے ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ ٹوبیہ نے دودھ کا گلاس اُسے تھمایا،
پھر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آخر تم اعتراف۔ کیوں نہیں کر لیتے۔“

”کس بات کا؟“

”کہ تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“

”ہاں میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے آپ سے بڑی شدید قسم کی محبت ہے۔“

”بکومت، میں اپنی بات نہیں کر رہی۔“

”پھر؟“

”تمہارا سرا!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کے ہاتھ سے خالی گلاس لیتے ہوئے بولی۔

”میرا کیا ہے مت بتاؤ، میں صبح اماں سے کہہ دوں گی کہ تم شبنم سے شادی کے لیے راضی

ہو۔“

”کون شبنم؟“

”وہی جسے تم بنگلہ دلش بھیج چکے تھے۔“ اس کے ساتھ ہی ٹوبیہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

گلاس میں بچا ہوا ذرا سا دودھ اُس کے منہ پر پھینکتے ہوئے بولی۔

”اُس روز تم نے خوب چکر دیا تھا۔ میں بھی بلا سوچے سمجھے تمہاری ہاں میں ہاں ملا گئی

”اچھا!“ وہ ذرا سانس ہی پھر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی، لیکن ہمیشہ کی طرح بس ایک ہل کو ہی دیکھ سکی۔ اس کی آنکھوں میں جانے کا سحر تھا۔ شب اماں کی ساری سیانہ جیسے ایک ذرا سے دائرے میں مقید کر دی گئی ہو..... پھر پاسبانی کو کمان ابرو اور اس ایک ہل میں ہی سونیا کو لگتا، جیسے گھوراندھیرے میں اس کا وجود ختم ہو گیا ہو۔

”تم شاید مذاق سمجھ رہی ہو۔“ وہ اُس کے ہنسنے پر بولا۔

”نہیں۔“

”پھر تم بتاؤ، انہیں کیسے شبہ ہوتا ہے۔؟“

”یہ تم اپنی بھابھی سے ہی پوچھنا۔“ وہ موضوع ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

”اچھی بات ہے، اُن ہی سے پوچھ لوں گا لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ اماں جو میرے لیے لڑکیاں دیکھنے کا سوچ رہی ہیں، انہیں کیسے..... روکوں۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ وہ اتنے اطمینان سے بولی کہ وہ کتنی دیر تک اُسے دیکھتا رہ گیا۔
پھر گہری سانس لے کر بولا۔

”بے نیازی تمہارا حق ہے سونیا، جانتی جو ہو کہ میں تمہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔“

”ہاں۔“ وہ صاف گوئی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی تھی۔

”تمہاری محبت نے مجھے بے نیاز ہی نہیں بے پروا بھی کر دیا ہے اور پتا ہے عراب میں بڑی آپا اور چھوٹی آپا کو دیکھ کر خوف زدہ بھی نہیں ہوتی۔ میرے اندر اطمینان ہی اطمینان ہے کہ خواہ کتنے ہی برس بیت جائیں، تم میرے پاس ضرور آؤ گئے ہے ناں؟“ آخر میں اُس نے اتنے مان سے پوچھا کہ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”اب چلو دیر ہو رہی ہے۔“

”ہاں چلو، لیکن آج میں تمہیں ڈراپ نہیں کر سکوں گا۔“

”کیوں؟“

”اصل میں بھابھی نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں، مجھے مارکیٹ جانا ہے، البتہ اگر تم

میرے ساتھ مارکیٹ چلنا چاہو تو.....!“

”نہیں، اس طرح تو اور دیر ہو جائے گی۔ خیر، کوئی بات نہیں، میں بس سے چلی جاؤں

گی۔“

”یہ مسئلہ تو ہر دوسرے گھر کا ہے، لیکن اب میں نے دیکھا ہے کہ اکثر بڑوں کی موجودگی میں چھوٹیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ تم سو نیا سے بات کر کے تو دیکھو۔“

”میں اُس سے بات کر چکا ہوں اور اُسی نے بتایا ہے کہ اس کے والدین اس معاملے میں وہی پرانی سوچ رکھتے ہیں۔“

”پھر تمہارا کیا ارادہ ہے، میرا مطلب ہے اگر اُس کی بہنوں کی شادیوں میں چار پانچ سال لگ جائیں تب؟.....؟“

”میں انتظار کر سکتا ہوں اور میں نے سو نیا سے وعدہ بھی کیا ہے۔ بس آپ اماں کو کسی طرح راضی کر لیں کہ وہ میری شادی کے لیے اتنی جلدی نہ کریں۔“

”اس کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اماں کو بھی سو نیا کے بارے میں بتا دو۔“

”نہیں بھابھی! اس طرح تو اماں ہر وقت ایک ہی سوال کیا کریں گی کہ کیا ہوا اُس کی بہنوں کا، کوئی رشتہ آیا یا نہیں جیسے میں دفتر جانے کے بجائے رشتے ڈھونڈنے نکلا ہوا تھا۔“

”تمہاری مرضی۔“ ”ٹوبیہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔“

پھر جاتے جاتے ایک دم رُک کر بولی۔

”سو نیا کیا کرتی ہے؟“

”اسی سال اُس نے بی اے کیا ہے اور اب جاب کرنے کا سوچ رہی ہے۔“

”اور اُس کی بہنیں؟“

”وہ بھی کسی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔“

”اچھا! بہر حال مسئلہ ایسا ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ البتہ دُعا ضرور کروں گی، تم بھی مصلیٰ لے کر بیٹھ جاؤ۔“ آخر میں شرارت سے بولی تو وہ بھی ہنس پڑا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ٹوبیہ کو بتانے کا اتنا فائدہ ہوا کہ اب اماں جب بھی اس کی شادی کا ذکر چھیڑتیں، ٹوبیہ اس کی طرف داری کرتے ہوئے کہتی۔

”اتنی جلدی کیا ہے اماں! ابھی کچھ وقت اسے آزاد رہنے دیں، پھر بال بچوں میں گھر کر بندہ بہت پابند ہو جاتا ہے۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا! لیکن میں چاہتی ہوں، اپنی زندگی ہی میں اس کا گھر آباد کروں۔“

اس کے بعد پتا ہے کیا ہوا؟ اماں نے بڑی سادگی سے شبنم کی امی سے پوچھ لیا کہ سنا ہے شبنم بنگلہ دیش گئی ہوئی ہے۔ وہ تو اچھا ہوا میں وہاں موجود تھی اور فوراً تمہاری کبھی بات بھی یاد آگئی تو میں نے جلدی سے بات سنبھال لی تھی۔“

”اچھا!“ وہ محظوظ ہو کر بولا۔

”تو پھر میں اماں کو تمہاری رضامندی دے دوں ناں؟“

”نہیں بھابھی!“ وہ فوراً بولا۔

ٹوبیہ کچھ دیر تک یونہی اُسے دیکھتی رہی پھر دوبارہ بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”سو تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے اُس لڑکی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے جسے تم پسند کرتے ہو؟“

”ہائیں!“ وہ پوری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھنے لگا۔ ”یعنی آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ رہی ہیں۔“

”غلط کہہ رہی ہوں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ سر جھکانے لگا۔

ٹوبیہ نے بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولی۔

”سنا ہے، ایسے معاملوں میں کسی راز دار کی بھی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔“

”بہت چالاک ہیں آپ!“ اُس نے جیسے ہتھیار ڈال دیے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

”ان باتوں سے قطع نظر کہ سو نیا سے میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی، بس آپ یہ جان لیں کہ وہ میری محبت ہے اور میں اُسے پورے خلوص کے ساتھ اپنا نا چاہتا ہوں، وہ بہت اچھی لڑکی ہے بھابھی! یقیناً آپ کو اور اماں کو بھی پسند آئے گی، لیکن اس سے فوری شادی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے بڑی دو بہنیں ہیں، جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور اُس کا کہنا ہے کہ جب تک اس کی بڑی بہنوں کی شادیاں نہیں ہو جاتیں، اس کے والدین اس کے لیے کبھی بھی ہامی نہیں بھریں گئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔“

وہ بڑی جلدی بات ختم کر کے ٹوبیہ کی طرف دیکھنے لگا تو وہ کہنے لگی۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! آپ کو صرف میرا ہی نہیں، میرے بچوں کا گھر بھی آباد کرنا ہے۔“ وہ فوراً کہتا۔

یوں دونوں مل کر اماں کو بہلا لیتے۔ اس وقت وہ ٹوبیہ کا مشکور ہوتا۔ اُنھی دنوں تقریباً ڈھائی سال بعد ٹوبیہ اُمید سے ہوئی تو قدرتی طور پر اماں کا دھیان آپ ہی آپ بٹ گیا۔ وہ بے حد خوش تھیں اور ننھے مہمان کی آمد کی تیاریوں میں مصروف ساتھ ساتھ گھر کا کام بھی خود کرنے لگی تھیں۔ اُن کی کوشش ہوتی کہ ٹوبیہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے دیے بھی ٹوبیہ کچھ اتنی سست ہو گئی تھی کہ جنید کے چھوٹے موٹے کام بھی مشکل سے کر پاتی۔ لیکن اسے احساس ضرور تھا۔ کتنی بار بچن میں اماں کے پاس آتی کہ اُن کا ہاتھ بٹائے گی۔ لیکن کمزوری کے باعث اس سے کھڑا نہ رہا جاتا۔

اس وقت بھی وہ بچن سے نکلی تو برآمدے میں رکھے تخت پر ہی لیٹ گئی تھی کہ اسی وقت اسلام آباد سے آپا اپنے چار بچوں سمیت آ گئیں۔ ایک دم سے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ شور سُن کر اماں بھی بچن سے نکل آئیں اور اتنے عرصے بعد بیٹی اور نو اسے، نو اسیوں کو دیکھ کر خوشی کے ساتھ اُن پر بوکھلاہٹ بھی سوار ہو گئی۔

”جنید اور عمر کہاں ہے؟“

آپا جب اطمینان سے بیٹھیں تب اُنھیں بھائیوں کا خیال آیا۔

”ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی کہ عمر بھی ماشاء اللہ کام سے لگ گیا ہے۔“

پھر بغور ٹوبیہ کو دیکھ کر پوچھنے لگیں

”تم کیوں اتنی کمزور ہو رہی ہو؟“

”خیر سے اللہ نے خوشی کے دن دکھائے ہیں۔“ ٹوبیہ سے پہلے اماں نے خوشخبری

سنائی۔

”اچھا بھئی مبارک ہو، مجھے تو اب سچ سچ بہت تشویش ہونے لگی تھی۔“

”تشویش کا ہے کی، دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔“

اماں اُٹھتے ہوئے بولیں۔

”تم آرام سے بیٹھو، میں ذرا آٹا گوندھ لوں۔“

”اماں آپ!“ آپا نے اسی قدر کہا تھا کہ اماں نے ٹوک دیا۔

”ٹوبیہ کا جی اچھا نہیں ہے۔ ابھی میں خود اسے کام نہیں کرنے دے رہی، ورنہ تو یہی

بے چاری سب کچھ کرتی ہے۔“

”ہاں پچھلی بار جب آئی تھی تو میں نے دیکھا تھا اور سچ اماں اس کے بعد میں بہت

مطمئن رہی کہ ٹوبیہ کے دم سے آپ کو بہت آرام ہے۔“

”مجھے واقعی بہت آرام ہے۔“ اماں یہ کہتے ہوئے بچن میں چلی گئیں۔

آپا اس سے پوچھنے لگیں۔

”کس وقت آتے ہیں جنید اور عمر؟“

”بس آتے ہی ہوں گئے۔“ اُس نے بتایا پھر آپا کے بچوں کو قریب بلا کر اُن سے

باتیں کرنے لگی۔

پھر پہلے جنید آئے، اُن کے بعد وہ حسب معمول دروازے ہی سے بھاوج.....

بھاوج چلاتا ہوا آیا لیکن جب آپا پر نظر پڑی تو ایک دم خارج ہو گیا اصل میں آپا سے کافی

چھوٹا ہونے کے باعث ان سے کچھ دیتا تھا اور آپا بھی خوب تھیں۔ اب بھی اُسے اپنے رعب

سے آزاد کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

”کیوں بھئی اتنے بڑے ہو گئے، اب بھی بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہو؟“

آپا اُٹھ کر اُس سے ملیں، ساتھ ہی ٹوکنا بھی فرض سمجھا۔ تو وہ جھل سا نظر آنے لگا۔ تب

ٹوبیہ اس کی حمایت کرتے ہوئے بولی۔

”اصل میں گھر میں سب سے چھوٹا ہے ناں، اس لیے.....!“

”اماں کہاں ہیں؟“ وہ آپا کے مزید کچھ کہنے سے پہلے اماں کا پوچھتا ہوا بچن کی طرف

بڑھا۔ تو دونوں بھانجیوں ہنی اور ردا کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا آیا۔

”کیا تم لوگ اپنی امی کے بغیر نہیں آ سکتی تھیں؟“ ہنی اور ردا جیسے ہی اُس کے پیچھے

آئیں، اُس نے دونوں کو دائیں بائیں بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا۔

اماں نے فوراً متوجہ ہو کر ٹوکا۔

”ہائیں! یہ کیا کہہ رہے ہوں؟“

”کچھ نہیں کھانے میں کتنی دیر ہے؟“ اُس نے پوچھا۔

”بس تیار ہے، یہ دو چار روٹیاں ڈالنی ہیں۔“

”چلیں، جب تک آپ روٹی ڈالیں، میں کھانا لگا دیتا ہوں۔ چلوئی اور ردا تم یہ برتن لے جاؤ لیکن خیال سے، تو رمت دینا۔“

”چھوٹے ماموں! ردا کو مت دیں، یہ توڑ دے گی“ اور تم۔“ وہ پلٹیں اُس کی طرف بڑھانے سے پہلے پوچھنے لگا۔

”میں جان بوجھ کر نہیں توڑتی۔ ہنسی کے معصومیت سے کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

☆☆☆

جو موضوع وقتی طور پر دب گیا تھا، اُسے آپا نے نئے سرے سے چھیڑ کر اُسے ایک بار پھر چلا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اماں کی طرح آپا کو کبھی بھی بہلایا نہیں جاسکتا اور نہ ہی انھیں قائل کیا جاسکتا ہے، جب کہ آپا بڑی خوب صورتی سے اماں کو قائل کر رہی تھیں۔

”آج کل صرف لڑکیوں کا مسئلہ نہیں ہے اماں! لڑکوں کی بھی عمر میں زیادہ ہو جائیں تو سو طرح کے مسئلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر لڑکوں کے بگڑنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ وقت پر لگام ڈال دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو، میں خود بھی چاہتی ہوں کہ جلد عمر کی شادی کر دوں، لیکن وہی نہیں مانتا۔“

”کیا کہتا ہے؟“

”کچھ نہیں، بس جب شادی کی بات چھیڑو ہنسی میں اُڑا دیتا ہے، کیوں ٹوبیہ؟“ اماں نے خاموش بیٹھی ٹوبیہ سے پوچھا تو وہ یونہی سر ہلانے لگی۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اماں! آپ اس سے سنجیدگی سے بات کریں، بلکہ میں خود پوچھتی ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی آپا نے اُسے وہیں سے آواز دے ڈالی۔

وہ اُن کے چھوٹے بیٹے کو کندھے پر اٹھائے ہوئے آگیا۔

”اسے اُتار دینیچے۔“

”جی!“ اُس نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچے کو فوراً اماں کی گود میں دے دیا اور یوں واپس پلٹنے لگا جیسے آپا نے اُسے صرف یہی کہنے کے لیے بلایا ہو۔

”جا کہاں رہے ہو؟ بیٹھو یہاں؟“

”جی!“ وہ فوراً بیٹھ گیا۔

ٹوبیہ نے بے ساختہ مسکرائی۔ اُسے اس کی اتنی سعادت مندی پر حیرت کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آرہی تھی۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

وہ بالکل نہیں سمجھا کہ آپا کیا کہہ رہی ہیں، جب ہی ٹوبیہ کی طرف دیکھنے لگا۔

(آپا سے وضاحت طلب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی)

تو وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

”آپا کا مطلب ہے، تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہا رہے؟“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ اُلٹا آپا سے پوچھنے لگا۔

”اماں باری ہیں، تم شادی کی بات ہنسی میں اُڑا دیتے ہو۔“

”تو اس سے آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں سرے سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ

بلا ارادہ کہہ گیا، لیکن پھر فوراً سنبھل کر اور سوچ کر بولا۔

”بس فی الحال میں ایسا نہیں چاہتا۔“

”کیوں؟“ آپا کے جرح والے انداز پر وہ اندر ہی اندر جربز ہو کر بولا۔

”اس لیے کہ ادھر میرے ٹرانسفر آرڈر آئے ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے، چند روز بعد

میں بہاولنگر چلا جاؤں ویسے وہاں زیادہ کام نہیں ہے، بس چھ آٹھ مہینے۔ اس کے بعد پھر

یہیں آ جاؤں گا۔ دوسرا میں چاہتا ہوں کہ پہلے میری پردوشن ہو جائے۔“

”ہاں تم کون سا ابھی تمہارے سر پر سہرا باندھ رہے ہیں۔ اتنا عرصہ تو بات چلنے اور

طے ہونے میں بھی لگ جاتا ہے، کیوں اماں؟“

”بس آپ کوئی لڑکی دیکھیں اور جیسے ہی یہ بہاولنگر سے آئے، شادی کی تاریخ تجرھ دیں۔“

آپا نے اپنے طور پر فیصلہ سُنا دیا تو اُس نے مدد طلب نظروں سے ٹوبیہ کی طرف دیکھا

اور اُس کے آہستہ سے نفی میں سر ہلانے پر کچھ خفا سا ہو کر وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں

آگیا۔

اُسے آپا پر بہت غصہ تھا، جواب بھی اس گھر پر اپنی اجارہ داری رکھے ہوئی تھیں۔ اس

کا خیال تھا کہ وہ اپنے گھر بار والی ہیں، اس لیے انھیں اس گھر کے کمینوں کے معاملات میں دخل دینے کا قطع کوئی حق نہیں ہے اور جب اس نے یہی بات ثوبیہ سے کہی تو وہاں سے سرزنش کرتے ہوئے بولی۔

”وہ تمھاری بڑی بہن ہیں۔ اور انھوں نے ایسی غلط بات بھی نہیں کی جو تم انھیں اس گھر سے یکسر بے دخل کیے دے رہے ہو۔“

”نہیں، آخر انھیں میری شادی کی کیا فکر ہے؟“

”کیا نہیں ہونی چاہیے؟“ وہ اُلٹا اُس سے پوچھنے لگی تو وہ منہ مھلا کر بولا۔

”یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ انھوں نے سونیا کا نام نہیں لیا، ورنہ اگر وہ یہ کہہ دیں کہ وہ ابھی تمھاری سونیا سے شادی کروا سکتی ہیں تو تم جی جان سے تیار ہو جاؤ گئے۔“ اُس کے نظروں سے دیکھنے پر بولی۔

”اگر کہو تو انھیں سونیا کے بارے میں بتا دوں؟“

”خبردار! ایسی غلطی مت کیجیے گا۔ آپ کو نہیں پتا، وہ میری پکی دشمن ہیں۔“

”خیر ایسا تو مت کہو، اتنا پیار کرتی ہیں تم سے۔“

”پتا ہے مجھے۔“ اُس کا انداز ہنوز زوٹھا ہوا تھا پھر رازواری سے پوچھنے لگا۔

”ویسے کب تک یہاں رہیں گی؟“

”جب تک بھی رہیں۔“

”ارے واہ! باپ کا گھر ہے کیا؟“

اُس کے بلا سوچے سمجھے کہنے پر ثوبیہ ہنسی تو ہنستی چلی گئی۔

وہ پہلے تو سمجھا نہیں، لیکن جب اپنی بات پر غور کیا تو خود بھی ہنسنے لگا۔

اسی وقت آپا کے بچے شور مچاتے ہوئے آ گئے

”ماموں! امی کہہ رہی ہیں، ہمیں اُس کریم کھلانے لے جائیں۔“

”امی بھی جائیں گی کیا؟“ وہ فوراً پوچھنے لگا۔ نہیں اُن کے سر میں دروہ، وہ لیٹی ہوئی

ہیں۔“ روانے بتایا تو وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بولا۔

”سر میں ورد تو ہو گا ہی، اتنا بولتی جو ہیں۔“

”ابو بھی یہی کہتے ہیں۔“

”ہاں بیٹا! تمھارے ابو بہت اچھے ہیں، ان ہی کا حوصلہ ہے جو.....!“

”عمر!“ ثوبیہ نے ٹوک دیا۔

بچوں سے تو ایسی باتیں نہ کرو۔“

”حقیقت بتا رہا ہوں انھیں۔“

”بکومت۔“

”اچھا چلیں، آپ کو بھی اُس کریم کھلا لاؤں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”میرے لیے نہیں لیتے آنا۔“

”ساتھ کیوں نہیں چلتیں۔“

”مجھے ابھی جنید کے ساتھ جانا ہے۔“

”تو پھر اُس کریم بھی اُنھی کے ساتھ کھا لیجیے گا بلکہ اور بھی جو کہیں گی، لا لی گئے، کیونکہ

آج کل بڑے مہربان ہیں آپ پر۔“ اُس کی معنی خیز مسکراہٹ پر وہ جھینپ کر بولی۔

”جی نہیں، وہ ہمیشہ سے مہربان ہیں۔“

☆☆☆

پہلے اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کی ٹرانسفر رک جائے، لیکن اب اُسے بہاول نگر جانا ہی مناسب لگا۔ گو کہ چھ آٹھ مہینے کی بات تھی، پھر بھی اُس نے سوچا کہ اس طرح وہ اماں کو سہولت سے راضی کر لے گا کہ جب تک وہ واپس نہ آجائے اس کی شادی کی بات نہ چھیڑی جائے۔ یوں اس کی پس و پیش دیکھتے ہوئے جو دفتری کاروائیاں رُکی ہوئی تھیں، وہ اس کی رضا مندی ملتے ہی فوراً مکمل کر لی گئیں۔ اسی شام وہ سونیا سے ملا۔

”میں کل بہاول نگر جا رہا ہوں۔“

”کتنے دنوں کے لیے؟“ وہ قدم روک کر پوچھنے لگی۔

”دنوں نہیں، مہینوں کے لیے غالباً سات آٹھ مہینے لگ جائیں گئے۔“

”اچھا“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی اور قدم بھی آگے بڑھا دیے۔

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اُس کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”سُنو! میں نے تمھارے بارے میں بھابھی کو بتا دیا ہے اور اُن کا کہنا ہے کہ تمھارے

والدین سے بات کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ ہو سکتا ہے ہم انہی قائل کر لیں۔“
 ”نہیں عمر! میرے والدین کو کوئی قائل نہیں کر سکتا اور پھر بھی خود بھی اسے مناسب نہیں سمجھتی کہ میری بہنیں خوابوں کی راہگور پر بیٹھی رہ جائیں اور میں.....!“ وہ قصداً خاموش ہو گئی۔

”ایسا کیوں سوچتی ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تقدیر میں اسی طرح لکھا ہو۔“
 ”نہیں، اور پلیز جب یہ طے ہو چکا ہے کہ تم مجھے مجبور نہیں کرو گے تو پھر کیوں اس موضوع کو چھیڑ رہے ہو؟“

”آئی ایم سوری!“ اُس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے موضوع تبدیل کر دیا۔

”یہ بتاؤ، مجھے خط لکھو گی؟“

”اگر تم کہو گے تو ضرور لکھوں گی، لیکن تم جواب مت لکھنا۔“
 ”کیوں“

”اس لیے کہ اگر تمہارا خط کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔“
 ”جیسے تمہاری مرضی۔“ اُس نے ہلکے سے کندھے اُچکا کر کہا۔

پھر جیب سے ایک کارڈ نکال کر اُس کی پشت پر ایڈرس لکھ کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہارے خط کا انتظار رہے گا۔ البتہ کوئی جواب طلب بات مت لکھنا ورنہ مجھے یہاں آنا پڑے گا۔“

وہ ہنس پڑی، پھر گھڑی دیکھ کر بولی۔

”اب چلنا چاہیے۔“

”اوکے، پھر یہیں ملاقات ہو گی۔“

وہ بایک اشارت کرنے لگا۔ پھر ہمیشہ کی طرح مخصوص جگہ پر اُسے اتار کر گھر چلا آیا۔
 جب سے آپا آئی تھیں، وہ بہت خاموشی سے گھر میں داخل ہوتا تھا۔ اس وقت بھی دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ سامنے سے جنید بھائی آ گئے۔ اُسے اتنی خاموشی سے آتے دیکھ کر پتا نہیں کیا سمجھ کر اشارے سے پوچھا کہ کیا بات ہے، تو وہ سرگوشی

”آپا کہاں ہیں؟“

”آپا تو غالباً آج صبح سے اماں کے ساتھ عزیزوں رشتے داروں سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔“

جنید بھائی نے بتایا تو وہ گہری سانس کھینچ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

”کیوں ہنس رہے ہو؟“ جنید بھائی خاصے حیران ہو کر پوچھنے لگے۔

”بس یونہی“

”یونہی“

”اب کیا بتاؤں بڑے بھائی! جس روز سے آپا آئی ہیں، سانس بھی آہستہ لے رہا ہوں کہ کہیں اس پر بھی پابندی نہ لگا دیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا اُنھوں نے ہنسنے پر پابندی لگائی ہے؟“

”ہر بات پر بھائی..... ہر بات پر۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”اُن کا کہنا ہے کہ اب میں بچہ نہیں رہا، مجھے عمر کے حساب سے خاصا سنجیدہ ہونا چاہیے۔“

”یہ تو واقعی زیادتی ہے“ جنید بھائی اُس پر ترس کھاتے ہوئے بولے۔
 ”اور کیا اتنے دنوں سے اپنے گھر میں خود کو اجنبی محسوس کر رہا ہوں اور اسی لیے کل

یہاں سے جا بھی رہا ہوں۔“

”کیا مطلب؟ کہاں جا رہے ہوں؟“

’بہاول نگر، میں نے آپ کو بتایا بھی تھا ناں کہ میرا سفر ہونے والی ہے تو بس ہو گئی۔“

وہ جنید بھائی کے ساتھ چلن ہوا برآمدے میں آ بیٹھا اور انھیں تفصیل سے اپنے جانے

کے بارے میں بتانے لگا۔

”چلو اچھا ہے، کچھ آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی۔“ جنید بھائی اُس کی پوری سُن کر

بولے۔

”ہاں!“ پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”کیا بھابھ بھی گھر پر نہیں ہیں؟“

”ٹو بیہ ابھی تو یہیں تھی، میرے خیال ہے چائے بنا رہی ہے۔“

اسی وقت ٹوبہ چائے لے کر آگئی تو اُس نے جلدی سے اٹھ کر اُس کے ہاتھ سے بڑے لے لی اور اپنے سامنے رکھ کر پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔

”تم نے سنا ٹوبہ! عمر کل بہاول نگر جا رہا ہے۔“

”واقعی؟“ ٹوبہ تصدیق کے لیے اُس کی طرف دیکھنے لگی اور اُس کے اثبات میں سر ہلانے پر بولی۔

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم ٹرانسفر کو لانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”ہاں، لیکن پھر سوچا اٹھ مہینے کی تو بات ہے۔“

”چھ اٹھ مہینے؟“ ٹوبہ معنی خیزی سے مسکرائی تو وہ اس خیال سے کہ کہیں جنید بھائی کے سامنے ہی وہ سونیا کا ذکر نہ چھیڑ دے، فوراً بولا۔

”اگر آپ کی زحمت نہ ہو تو پلیز میرا ایک سوٹ کیس تیار کر دیجیے گا؟“

”میں خود کر لوں گا۔“ وہ جلدی سے چائے ختم کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات میں آپا خواہ خواہ اس پر بگڑتی رہی کہ جب تک وہ یہاں ہیں اُسے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہفتے بھر کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ رہا اور وہ ایسا کر سکتا تھا، لیکن اُن کے سامنے مذرترا اشتار ہا کہ بہت سخت آرڈر ہیں، مجھے وہاں فوراً پہنچنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

”مجھے لگتا ہے، تم آپا کی وجہ سے جا رہے ہو۔“

ٹوبہ جب اُس کا سوٹ کیس تیار کر رہی تھی تو تاسف سے بولی۔

”ایسی بات نہیں ہے بھابھو! جب جانا ہی ہے تو خواہ خواہ چھٹی لے کر کیوں بیٹھو؟“

”خیر چھوڑو، یہ بتاؤ، سونیا کو اپنے جانے کا بتا آئے ہو۔“

”ہاں۔“

”اُس نے تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کی؟“

”وہ ایسی فضول لڑکی نہیں ہے۔“

”اچھا!“ ٹوبہ زور سے ہنسی۔

”اس کا مطلب ہے ہم سب فضول ہیں؟“

”یہ میں نے کب کہا؟“

”کہہ بھی دو گئے تو ہم بُرائیاں نہیں مانیں گئے۔“ ٹوبہ نے اُس کے ہاتھ سے شیونگ بکس لے کر سوٹ کیس میں رکھا پھر کہنے لگی۔

”اگر تم مجھے اُس سے ملوادیے تو تم دونوں کا فائدہ ہوتا۔“

”جب واپس آؤں گا تو سب سے پہلا کام یہی کروں اور اب یہ بتائیے آپ کے لیے کیا لاؤں؟“

”ارے واہ! تم تو یوں پوچھ رہے ہو جیسے امریکہ یا لندن جا رہے ہو۔“

”امریکہ اور لندن اپنے بہاول نگر کے سامنے کیا بیچتے ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہیں اور اب اچھی طرح سوچ لو، کوئی چیز رہ گئی ہو تو بتا دو۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ اُس نے بڑھ کر سوٹ کیس بند کر دیا۔ پھر ٹوبہ کے ساتھ ہی کمرے سے نکلا تو اماں کے پاس آ بیٹھا۔ اماں کی وہی باتیں تھیں۔

”اپنا خیال رکھنا۔ بازار کے کھانے پر مت گزارا کرنا کہ ایک وقت کھالیا، دو وقت ٹال دیا۔ جاتے ہی کھانا پکانے کے لیے کوئی ملازم رکھ لیتا۔“

”اسی لیے میں اس کی شادی پر زور دیتی ہوں۔“ آپا کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔

”اگر شادی ہوگئی ہوتی تو اب بیوی کو ساتھ لے جاتا۔“

”اچھا اماں! اجازت دیجیے۔“ وہ آپا کے طویل لنگر سے بچنے کی خاطر اٹھ کھڑا ہوا اور سب سے مل کر جنید بھائی کے ساتھ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

بہاول نگر ایک تو چھوٹا شہر، دوسرے یہاں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ اس کی رہائش بھی آفس سے ملحقہ ایک کمرے میں تھی۔ صبح اٹھتا تو کمرے سے نکل کر آفس میں آ بیٹھتا اور شام میں آفس سے اٹھ کر کمرے میں آ جاتا۔

شروع کے وقت چند دن اس کی یہی روٹین رہی جس سے وہ یہ سمجھنے لگا کہ وہ ان ہی دو کمروں کے درمیان محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ جب ہی اُکتانے لگا اور یہاں سے فرار کی بھی سوچنے لگا تھا، لیکن اتفاق سے ایک مارکیٹنگ افسر دونوں کے دورے پر آیا تو بجائے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کے اُس کے پاس رُک گیا۔ غالباً مجاہد حسین نے اسی کا ہم عمر ہونے کے باعث اس کے پاس رہنے کو ترجیح اس لیے دی تھی کہ اس کی کمپنی اچھی رہے گی، لیکن وہ خاصا

”رہنے دلا تو میں خاص میانوالی کا ہوں، لیکن آج کل پیلاں میں ہوتا ہوں۔ بڑی اچھی جگہ ہے پیلاں۔ کسی ویک اینڈ پر آنا میرے پاس۔“

”ہا.....ہا.....!“ مجاہد حسین کا ہنسا اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہونقوں کی طرح اُسے دیکھنے لگا۔ وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”یہ نالنے والی بات ہوتی ہے، آؤں گا۔“

”نہیں، نہیں، میں ضرور آؤں گا۔“ اب کے وہاں لہجہ کو بٹاش بنا کر بولا۔

”بھلا کہاں؟“

”پیلاں۔“

”ہاں پیلاں میرا خیال ہے، تم نے پہلی بار اس جگہ کا نام سنا ہوگا۔“

”خیر، ایسی بات بھی نہیں ہے۔“ وہ فوراً بولا۔

”میں پیلاں کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔ کیونکہ کسی زمانے میں میرے والد وہاں ایک ٹیکسٹائل میں ملازم تھے۔ وہ جب اپنا گزرا زمانہ یاد کرتے تو خاص طور سے پیلاں اور پیلاں کے ساتھ ہی ڈاکٹر عزیز جان کا ذکر ضرور کرتے تھے۔“

”ڈاکٹر عزیز جان اب بھی وہیں ہوتے ہیں۔“

”پھر تو میں ضرور آؤں گا۔“

”اب میں تمہاری بات پر یقین کر سکتا ہوں۔ خیر یہ بتاؤ شادی شدہ ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر تو مزے ہیں تمہارے، آزاد پنچھی ہو، کہیں بھی بسیرا کر سکتے ہو۔“

مجاہد حسین نے اُسے شوخ نظروں سے دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا شاہ! میں ذرا مارکیٹ کا چکر لگا آؤں اور ہاں میں نے چوکیدار کو بیٹر لانے کے لیے بھیجا ہے۔ وہ آئے تو اُس سے کہنا اپنی گھر والی سے پکوا کر رکھے۔“

اُس نے مسکرا کر سر ہلایا اور اس کے جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔

مختلف فائلیں دیکھتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ جب چوکیدار نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تو اس نے پہلے مجاہد حسین کے بارے میں پوچھا پھر اُس کے آنے کا انتظار کرنے کو کہتا ہوا کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے اٹھا ہی تھا کہ پوسٹ مین آ گیا۔ اُس

مپیوس اور بے زار سا تھا۔

رات مجاہد حسین رات دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور اس کی بے زاری محسوس کرنے کے ساتھ کسی حد تک بے زاری کا سبب بھی جان گیا تھا۔ جب ہی علی الصبح جب خود اٹھا تو اُسے بھی زبردستی اٹھا دیا۔ ویسے تو وہ صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا۔ لیکن یہاں آ کر کچھ سُست سا ہو گیا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ افس کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑتا تھا۔ بہر حال مجاہد حسین کے اٹھانے پر وہ اٹھ تو گیا، لیکن کہے بغیر رہ نہیں سکا۔

”اتنی جلدی اٹھ کر کیا کریں گئے؟“

”شاہ (دوست) یہی تو اصل وقت ہے آؤ باہر چلیں۔“

”باہر!“ اُس نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔

دھیرے دھیرے اندھیرے کی چادر کھینچتا ہوا اجالا بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ دور کہیں سے چکی کی آواز دل پر قدموں کی دھمک محسوس ہونے لگی۔

”میں منہ ہاتھ دھو لوں، وہ پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے بولا۔

”چھوڑ شاہ، باہر ہی کہیں دھولیں گئے۔“ مجاہد حسین اُسے کھینچتے ہوئے باہر لے آیا۔

اچانک کمرے سے نکل کر باہر کی فضا میں اُسے کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کچی سڑک تقریباً آدھے فرلانگ پر ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر طرف ہریالی دیکھ کر روح تک سرشار ہو گئی۔ وہیں ٹیوب ویل پر دونوں نے منہ ہاتھ دھویا اور تقریباً ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد واپس پلٹنے لگے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔

”مجھے سخت بھول گئی۔“ اُس نے کہا۔

مجاہد حسین راستہ بدل کر اُسے بازار کی طرف لے آیا۔ وہیں ایک جگہ بیٹھ کر انھوں نے حلوہ پوری سے ناشتا کیا اور لسی پی کر واپس آ گئے۔

”میں مانتا ہوں، تم بڑے شہر سے آئے ہو، لیکن دوست! چھوٹے شہر کے کا بھی اپنا حُسن ہوتا ہے۔“ مجاہد حسین تیار ہو کر اُس کے پاس افس میں آ کر بیٹھا تو کہنے لگا۔

”یہاں قدرتی حُسن ہے۔ نہ فضا میں آلودگی، نہ شور نہ ہنگامہ، جتنے دن یہاں ہو، خوب انجوائے کرو، تمہاری صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”تم کہاں ہوتے ہو؟“ اُس نے پہلی بار مجاہد حسین سے اس کے بارے میں پوچھا۔

نے جلدی سے ڈاک وصول کی اور دوبارہ وہیں بیٹھ کر دونوں لفافوں کو دیکھنے لگا پھر پہلے ٹوبہ کا خط کھولا۔ اُس نے سب کی خیریت سے آگاہ کرنے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا سچ دیور! تمہارے جانے سے گھر میں ایک دم سناٹا چھا گیا ہے۔ بالکل دل نہیں لگتا۔ جب تک آپار ہیں تب تک زیادہ محسوس نہیں ہوا، لیکن اب تو گھر کا نئے کو دوڑتا ہے۔ اماں بھی تھیں بہت یاد کرتی ہیں۔ تم پلیز کسی طرح جلد اپنی ٹرانسفر دوبارہ ہمیں کروالو۔ اور سٹو! اپنے ساتھ کسی میاں کو لے کر مت آ جانا۔ سنا ہے وہاں کی میاںیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔

”ہوتی ہوں گی۔“ وہ محظوظ ہو کر بڑبڑایا اور دوسرا لفافہ کھولنے لگا۔

سونیا نے اپنے روز و شب کا احوال لکھا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق کوئی جواب طلب بات نہیں پوچھی تھی۔ اس کے باوجود اُس کا دل چاہا۔ وہ بھی اس کی طرح اپنے لمحوں کا احوال لکھے۔ خصوصاً اُن لمحوں کا جب وہ شدت سے یاد آتی ہے، لیکن اُس نے جو پابندی لگا دی تھی، اُسے وہ خواہش کے باوجود توڑ نہیں سکا اور ٹوبہ کو پھر کسی وقت اطمینان سے جواب لکھنے کا سوچتا ہوا وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور ابھی جوتے موزے اتار کر لیٹنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ مجاہد حسین آ گیا۔ وہ اُسے دیکھ کر کھل کر مسکرایا اور چوکیدار کو بلا کر کھانا لانے کے لیے کہا۔

”تم نے ابھی کھانا نہیں کھایا؟“ مجاہد حسین گھڑی دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”نہیں، میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

”سوری! اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں جلدی آ جاتا۔“

”کوئی بات نہیں، ویسے بھی مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے سخت بھوک لگی ہے۔“

”بس کھانا آرہا ہے، تم جلدی سے منہ ہاتھ دھولو۔“ مجاہد حسین ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا تو وہ نیچے فرش پر کھیس بچھانے لگا۔

پھر اگلے روز مجاہد حسین جانے سے پہلے اُسے کچھ مقامی لوگوں سے متعارف کروانا

گیا، جن کی بدولت اُس کا وقت بہتر کٹنے لگا۔

صبح کی سیر اور شام میں اُنھی لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کو اس نے معمول بنالیا۔

جب کہ رات میں سونے سے پہلے کبھی اماں کو خط لکھتا، کبھی جنید بھائی کے نام اور کبھی ٹوبہ کو

اور جب تکیے پر سر رکھتا تو بہت خاموشی سے سونیا غلوی اس کی بند آنکھوں کے اندر جھانکنے چلی آتی۔ پھر نیند کی وادیوں میں پہنچنے تک وہ اس کے ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔

اُس روز وہ سونیا کا خط پڑھ کر بہت خوش تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ اُس کی بڑی آپا کی شادی ہو گئی ہے اور وہ اُسے تو مبارکباد کے دو لفظ نہیں لکھ سکا البتہ ٹوبہ کو لکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ جواب میں اُس کی شوخ سی تحریر موصول ہوئی۔

میں اب سبھی عمر عباس کہ تم اچانک بہاول نگر کیوں چلے گئے۔ تنہائی میں وظیفہ جلد اثر دکھاتا ہے۔ شاباش وظیفہ جاری رکھو تا کہ تمہاری واپسی تک سونیا کی دوسری بہن بھی اپنے گھر سدھار چکی ہو، لیکن سٹو! اس چکر میں کہیں تم نے داڑھی تو نہیں بڑھالی۔ خیر کوئی بات نہیں داڑھی میں بھی تم اچھے لگو گے۔ بس چشمہ مت لگانا کیونکہ تمہاری شخصیت کا سارا حسن تمہاری آنکھوں میں ہے اور سچ بتاؤ ان آنکھوں سے کتنی میاںوں کو گھائل کر چکے ہو۔

”تم سے تو میں وہیں آ کر نہٹوں گا بھانج! وہ کتنی دیر تک ہنستا رہا تھا۔“

پھر جیسے تیسے وقت گزر رہی گیا اور کراچی جانے سے پہلے اس نے پندرہ دن کی چھٹی لے لی۔ پہلے مجاہد حسین کے پاس پیلاں گیا۔ جن دنوں ابا یہاں ملازمت کر رہے تھے، اُس وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ آپا اور جنید بھائی تھے اور آپا کو تو یاد بھی تھا۔ بہر حال مجاہد حسین کے پاس وہ دودن رہا۔ اس کے بعد آپا سے ملنے اسلام آباد چلا آیا۔ غالباً وہ تلافی کرنا چاہتا تھا کہ جب وہ کراچی آئی ہوئی تھیں تو وہ اُن کا خیال کیے بغیر چلا گیا تھا۔ دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ کراچی جا کر پھر کہیں جانے کے بارے میں بندہ صرف سوچتا ہی رہ جاتا ہے، اس لیے اس نے سوچا یہ ہمیں سے اُن سے ملتا ہوا جائے۔

آپا اُسے دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔ اس کا ارادہ بس دودن ہی رہنے کا تھا، لیکن دولہا بھائی نے بہت اصرار سے روک لیا۔ وہ دولہا بھائی کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ تھے بھی بہت اچھے۔ یوں اُن کی وجہ سے پانچ چھ دن اُسے وہیں رہنا پڑا۔ اس کے بعد بھی دولہا بھائی روکنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن وہ عاجزی سے بولا۔

”اگر میں گھر سے آیا ہوتا تو ضرور رُکنا۔ تقریباً آٹھ ماہ سے گھر سے دور ہوں۔ اب مجھے اماں کے پاس جانے دیں، وہ میری واپسی کے دن گن رہی ہیں۔ پھر بھیا اور بھابھی بھی ہیں۔“

”ہاں اور اب تو ننھا مہمان بھی ہونے آنے والا ہے۔“
آپا کہنے لگیں۔

”ہو سکتا ہے، جیسے ہی تم جاؤ، تمہیں خوشخبری سننے کو ملے، بلکہ دیکھنے کو.....!“
”اچھا!“ اُس نے ذرا دیر کو ٹوبیہ کی گود میں بچے کا تصور کیا اور پھر اُسے حقیقت میں دیکھنے کے لیے فوراً رختِ سفر باندھ لیا۔

☆☆☆

اُس نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ ٹیکسی سے اترتے ہوئے سوچا بہت خاموشی سے اماں کے سامنے جا کر اُنھیں چونکا دے۔ اس سوچ کے ساتھ ہی بہت غجلت میں میٹر دیکھ کر کرایہ ادا کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر دروازے تک آیا، لیکن تالا دیکھ کر سخت مایوس ہوا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ پلٹ کر دیکھا ٹیکسی بھی جا چکی تھی۔ بہت بد دل ہو کر سوٹ کیس وہیں شیخ دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر ابھی سلگائی رہا تھا کہ اسکوٹر کی آواز پر یونی پلکس اٹھا کر دیکھا اور جنید بھائی پر نظر پڑتے ہی فوراً سگریٹ پھینک کر اُن کی طرف لپکا اور وہ پتا نہیں کس خیال میں تھے۔ اُسے دیکھ کر بھی جیسے نہیں دیکھا تھا۔ بہت غجلت میں دروازہ کھولنے لگے۔

”جنید بھائی!“ اُس نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو وہ بُری طرح چونکے۔
”ارے تم کب آئے؟“ وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

وہ پہلے حیران ہوا، پھر اُن کے پیچھے بھاگا۔

”کیا ہوا ہے بھائی؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

”ہاں وہ.....!“ وہ اسی قدر کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔

”اماں اور بھابھی کہاں ہیں؟“

”تمہاری بھابھی صبح ہاتھ روم میں گر گئی تھیں۔“ جنید بھائی الماری کا سیف کھولتے

ہوئے بتانے لگے۔

”ٹوبیہ کی حالت تو ٹھیک نہیں ہے، فوری خون چاہیے۔ وہاں اسپتال میں صرف ایک بوتل مل سکی اب بلڈ بینک جارہا ہوں۔“ اُسے جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس پھٹی پھٹی

آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

سیف سے پیسے نکال کر جیب میں رکھتے ہوئے جنید بھائی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اسی طرح اُن کی آواز کی لرزش بھی دل دہلائے دے رہی تھی۔

”اچھا! میں چلتا ہوں۔“ جنید بھائی جیسے ہوا میں اڑنا چاہتے تھے کہ اُس نے بڑھ کر اُنھیں کندھوں سے تھام لیا۔

”کیا بھابھی کی حالت بہت خراب ہے۔“

”ہاں!“ بس سہارا چاہیے تھا۔ جنید بھائی رو پڑے اور وہ ایک دم جیسے اُن سے بڑا ہو گیا۔ اُنھیں اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر زور سے بھیج کر بولا۔

”حوصلے سے کام لیں بھائی! بھابھی اچھی ہو جائیں گی۔“

”ہاں، اُسے اچھا ہونا چاہیے۔ میں اپنی زندگی اُس پر قربان کر دوں گا۔“

”چلیں، میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔“

”جلدی چلو۔“ جنید بھائی کو پھر وقت کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے ہی باہر نکل آئے اور جب تک وہ دروازہ لاک کرتا، وہ اسکوٹر اسٹارٹر کر چکے تھے اور شاید اُسے چھوڑ کر چلے جاتے کہ وہ جب لگا کر اُن کے پیچھے بیٹھ گیا۔

پھر جس طرح جنید بھائی ٹریفک کی پروا کیے بغیر اسکوٹر بھاگ رہے تھے، اس سے وہ مزید پریشان ہو گیا۔ اُن کے کندھوں پر گرفت مضبوط کر کے بار بار اُنھیں سنبھلنے کے لیے کہتا، لیکن وہ جیسے کچھ سُن ہی نہیں رہے تھے۔

”بھائی!“ سامنے سے آتی تیز رفتار ویگن کو دیکھ کر وہ پوری قوت سے چیخا تھا، لیکن اس کی آواز اس دھماکے میں دب کر رہ گئی، جس نے اُسے گیند کی طرح ہوا میں اُچھال کر پتھر کی زمین پر شیخ دیا تھا۔ بس چند لمحوں کو ہی اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا، پھر فوراً وہ اٹھ کر اُس طرف بھاگا جہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔

”کیسا معجزہ ہے یا؟“ کوئی اُسے دیکھ کر بولا تو اُس ٹھہرا ہوا دل زور زور سے دھڑکنے

لگا۔

”کون تھا تمہارا؟“ پھر کسی نے پوچھا۔

”کون تھا؟“ اس کی ساری حمیت یک لخت بیدار ہو گئیں اور وہ پاگلوں کی طرح سب

کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ چیخ بھی رہا تھا۔

”میرا بھائی ہے، میرا بھائی ہے“ اور وہ لاکھ کہے جنید عباس میرا بھائی ہے۔

لوگ تاسف سے کہہ رہے تھے۔ ”تمہارا بھائی تھا اور کتنا فاصلہ تھا“ ہے اور تھا۔ میں جسے وہ مرکز ہی مٹا سکتا تھا۔

”بھائی!“ اُس نے وہیں گھٹنے ٹیک دیے اور بھائی کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

”دیکھو بھاجو! بھائی تمہارے لیے اپنا سارا خون بہا گیا۔“ ضبط کی ساری حدیں ختم ہو چکی تھیں۔ دور سے ایسبولینس کا سائرن سنائی دینے لگا تو لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔

وہ سارا منظر دُھندلائی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا

”تم جاؤ عمر! تمہاری بھاجو کو خون کی ضرورت ہے۔“ جنید بھائی کے جسم سے ٹپکتا قطرہ قطرہ خون فریاد کر رہا تھا۔

اُس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر سر اُچھا کر کے آسمان کی طرف دیکھنا چاہا، لیکن نظریں بلڈ بینک پر ٹھہر گئیں۔

”کہاں لے جائیں گئے؟“ اُس نے ایسبولینس میں موجود شخص سے پوچھا۔

”پوسٹ مارٹم کے لیے۔“

”میں بھی پیچھے آ رہا ہوں۔“ اُس نے کہا اور تقریباً بھاگتے ہوئے بلڈ بینک چلا گیا۔

وہاں سے خون لے کر نکلتا تو ایسبولینس جا چکی تھی۔ ونکیسی روک کر اُسیں بیٹھ گیا اور

جب خون کی بوتل لیے اماں کے سامنے آیا تو اُنھیں خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اتنے دنوں کے بعد آیا ہے، اُسے دیکھتے ہی کہنے لگیں۔

”مبارک ہو عمر! اللہ نے جنید کو بیٹی دی ہے اور شکر ہے پروردگار کا کہ ثوبیہ کی حالت بھی خطرے سے باہر ہے۔“ اُس کے ہاتھ سے بوتل گر گئی اور فرش یہاں سے وہاں تک سُرخ ہو گیا۔

”ارے!“ اماں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

”کیا خطا ہوئی تھی، اماں، ہم سے کہہ دو پروالے نے جان کے بدلے جان بخشی؟“

اُس کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ کر نکلے اور اگلے بل وہ اماں کے سینے سے لگا کر پھوٹ

ٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

قیامت ہی تو ٹوٹی تھی اس گھر پر۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔

تیسرے دن دولہا بھائی نے اُسے سمجھایا کہ اس گھر میں اب وہی ایک مرد ہے۔ اُسے حوصلے سے کام لینا چاہیے۔

”اماں کو سہارا دو عمر! اور وہ ثوبیہ، تین دن سے ہاسپٹل میں اکیلی پڑی ہے۔ کوئی اس کا

پُرساں حال نہیں۔ کیا تم بھاجو کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ دو گئے؟“

”تو جاؤ اس کے پاس لیکن ابھی اُسے کچھ مت بتانا۔“

یہ کام واقعی بہت مشکل تھا۔ وہ اپنے دل پر بے پناہ بوجھ محسوس کرنے لگا۔ بمشکل خود کو

ثوبیہ کا سامنا کرنے پر آمادہ کر سکا تو شام میں کسی کو بتائے بغیر ہاسپٹل چلا آیا۔ ثوبیہ کو الگ

کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ سسٹر سے پوچھ کر اس کے کمرے میں آیا تو دروازے کے

پاس ہی ٹھک کر رُک گیا۔ وہ بالکل سیدھی لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں چھت پر مرکوز ہو کر جیسے

ساکت ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ اتنا سہا ہوا تھا کہ اُس منظر سے گھبرا کر زور سے کھانسا اور اس

کے وجود میں حرکت ہوتے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آیا۔

”تم کب آئے؟“ وہ اُسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن نقاہت کے باعث

ٹھیک سے بول بھی نہیں سکی۔

”جس روز آپ یہاں آئی تھیں۔“

”اچھا! میں کب یہاں آئی ہوں؟“ وہ خود ہی سوچنے لگی۔ پھر یاد نہیں آیا تو سر ہلا کر

بولی۔

”ابھی کوئی گھنٹا بھر پہلے مجھے ہوش آیا ہے۔ سسٹر کی زبانی معلوم ہوا کہ اماں گھر گئی ہیں۔“

”ہاں! میں اُنھیں چھوڑ آیا ہوں۔ اصل میں وہ بہت تھک گئی تھیں۔“

”اور جنید کہاں ہیں؟“ اور وہ اس لمحے سے خوف زدہ تھا۔ اب اُسے کیسے بتائے کہ

بھائی اپنی زندگی تمہیں دان کر گئے ہیں۔ قصداً اُن سنی کر کے بے بی کا کی طرف دیکھ کر

پوچھنے لگا۔

”بچی کہاں ہے؟“ اسی وقت سسٹر بچی کو لے کر آگئی تو وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور بچی

کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

”یہ بچی کا باپ۔“ سسٹر ثوبیہ سے پوچھ رہی تھی اور اگر وہ دل پر سانحہ لیے نہ کھڑا ہوتا تو

نے اپنی تنخواہ ڈوبیہ کے ہاتھ پر رکھی تو وہ گھبرا کر اُسے دیکھنے لگی۔
”مجھے کیوں دے رہے ہو؟ اماں کو دو۔“

”اماں کی حالت آپ دیکھ رہی ہیں۔ انھیں کسی بات کا ہوش نہیں اور پھر انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔“
”لیکن عمر۔“

”لیکن وہ لیکن چھوڑیں بھابھ! بس یوں سمجھ لیں جیسے میں اچانک بھیا بھتا بڑا ہو گیا ہوں، آپ اماں جتنی۔ ڈوبیہ رونے لگی۔
”تم پر بہت بڑا بوجھ آ پڑا ہے۔ ناں عمر؟“
”کیسا بوجھ؟“

”حقائق کو مت جھٹلاؤ۔ کیا میں نہیں جانتی کہ اب تم اپنے بارے میں سوچنے لگے تھے۔“
”تھے سے کیا مطلب؟“ نہ ڈوبیہ کو ایسے کسی احساس سے نکالنے کی خاطر اُسے گھور کر بولا۔
”بھئی میں اپنے بارے میں ضرور سوچوں گا۔ لیکن اس کا وقت تو آئے۔“
”سو نیا کیسی ہے؟“ وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھنے لگی تو وہ افسردگی سے مسکرایا۔

”ٹھیک ہی ہوگی۔“

”کیا مطلب؟“

”اصل میں ابھی تک اس کے پاس گیا نہیں ہوں۔“
”کیوں؟“

”جاؤں گا اور یہ آپ جرح کیوں کر رہی ہیں؟“

”جرح نہیں کر رہی لیکن تم جاؤ ضرور۔ وہ انتظار کر رہی ہوگی۔“

”ہوں۔“ اس نے گہری سانس کھینچی۔ پھر کہنے لگا۔

”اصل میں میں اماں کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ کسی اور طرف و حیان ہی نہیں جاتا۔ اماں ٹھیک ہو جائیں پھر اُس سے ملوں گا۔“

”اماں کی طرف سے واقعی پریشانی ہے۔ تم انھیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔“

”اُن کا علاج ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔ بھابی ایک تو بڑھا پا دوسرے اتنا بڑا سانحہ۔“

میں تو اُن کی متلاشی نظروں سے ہونے لگتا ہوں اور سچ بھابی زندگی میں پہلی بار میں اپنے رب سے شاکا ہوا ہوں۔ اگر جان ہی لیتی تھی تو میری لیتا۔“

”بس کرو عمر۔“ آپ روایت کریں۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

”کیسے نہ روؤں۔ یہ آنسو تو اب عمر بھر کے ہیں۔ تمہیں کیا پتا عمر! مجھے کیسے اندھیرا لگتا ہے۔ پتا نہیں میری زندگی میں خوشی اتنی مختصر مدت کے لیے کیوں آتی ہے۔“ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”چھوٹی سی تھی تو اب اچلے گئے۔ اُن کے بعد میں نے اور اماں نے بڑا کھٹن وقت گزارا۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ہم ماں بیٹی جین کی نیند سوئے ہوں۔ جب میں چھوٹی تھی تو اماں جوان اور اماں بوڑھی ہوئیں تو میں جوان۔ ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا۔ پھر زندگی کا دوسرا رخ میں نے یہاں آ کر دیکھا۔ محبتیں چاہئیں۔ کھلکھلاتی ہنسی۔ مجھے لگا جیسے میں جنت میں آ گئی ہوں۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی میری جنت کو؟ وہ اور شدت سے رونے لگی۔
”بھائی پلیز، اب ہم اوپر والے سے تو نہیں لڑ سکتے۔“ اسی وقت اماں کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈوبیہ کو پکار رہی تھیں۔

”دیکھیے اماں آپ کو پکار رہی ہیں؟“

”تم چلے جاؤ۔“ اُس نے بازوؤں میں چہرہ ٹھپا لیا تو وہ اُٹھ کر اماں کے پاس آ گیا۔

”ڈوبیہ کہاں ہے؟“ اماں اُسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”وہ ندا کے پاس ہیں۔ کوئی کام ہے تو بلاؤں؟“

”نہیں۔“ اماں نے اُسے روکا پھر پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”یہ

بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ ڈوبیہ کے دل بہلانے کا سامان کر دیا ہے۔ ورنہ تو بے چاری بے موت مر جاتی۔ پھر بھی مجھے اس کی بڑی فکر ہے۔ کیسے کاٹے گی۔ پہاڑی زندگی۔ ابھی تو تمہیں اس کا خیال ہے لیکن جب اپنے گھر یا روالے ہو جاؤ گئے تو۔“

”اماں!“ وہ فوراً۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“

”غلط نہیں کہہ رہی بیٹا اب تو عالم یہ ہے کہ اپنے سگے رشتوں کی پہچان نہیں رہی اور وہ

پھر غیر لڑکی ہے۔“

”وہ غیر نہیں اماں! میرے بھائی کی بیوی ہے اور ندا میری بھینجی۔ میرا اپنا خون۔ میں

اسے کبھی خود سے جُدا نہیں کر سکتا۔ آپ خدا کے لیے ایسا مت سوچیں۔ ٹوبیہ کی فکر مت کریں۔ میں ہوں ناں۔“

اس کا لہجہ بوجھ گیا۔ ہونٹ بھیجنے تو آنکھوں میں پانی اُترتا چلا آیا۔ جسے اماں سے چھپانے کی غرض سے گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اسی طرح اُٹھ کر باہر نکلا ٹوبیہ ابھی تک وہیں بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس کے اندر کی دکھن پہلے شدید ہوئی پھر وہ پھٹ پڑا۔

”خدا کے لیے بھاج! اپنا نہیں تو میرے بھائی کا خیال کرو۔ یہی سوچ لو کہ تمہاری آنکھ کا ایک آنسو اُسے کس طرح ترساتا تھا۔“ وہ ایک دم سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔ ضبط کی کوشش میں چہرے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو گئی تھیں۔

وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا لیکن محض اماں کے خیال سے نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے لیا لیکن آنسوؤں کو چھلکنے سے کسی طرح نہیں روک سکا۔

”نہیں عمر! تم مت روؤ۔ میں تمہیں ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔“

وہ کھڑی ہوئی، عاجزی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی اور پھر پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہ اپنی بے بسی پر کڑھنے لگا۔ کوئی تو ہو جو اُسے سہارا دے۔

”پروردگار! میں تو بہت حقیر اور عاجز بندہ ہوں پھر اتنی کڑی آزمائش کبھی میرے مقدر میں۔“

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اماں کی آواز نے اُسے نیند میں چونکا دیا۔ وہ پتا نہیں کب سے نکار رہی تھیں۔ اس خیال کے تحت وہ فوراً اُٹھا اور لائٹ جلا کر اماں کے قریب آکر پوچھنے لگا۔

”کیا بات ہے اماں؟“

”بیٹا! مجھے سیدھا کرو۔ میرا بدن سُن ہو گیا ہے۔“ انھوں نے کہا تو اس نے بہت احتیاط سے اُنھیں سیدھا لٹایا پھر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے میرا یہ بازو بدن کے ساتھ ہے ہی نہیں۔“ اماں اپنے بائیں ہاتھ سے دایاں بازو ٹٹولتے ہوئے بولیں تو وہ قدرے پریشان ہو گیا۔

”آئیوڈکس سے مالش کروں۔“

اس نے پوچھا اور کوئی جواب نہ پا کر اُن کا چہرہ دیکھنے لگا۔ شاید اُن پر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ اُس نے سوچا ٹوبیہ کو نکال لائے لیکن پھر اپنے خیال کو نفی کرتا ہوا آئیوڈکس اُٹھا لایا اور اماں کے بازو کو بار بار حرکت بھی دے رہا تھا۔ اسی اثنا میں فجر کی اذان ہونے لگی اور کچھ دیر بعد ہی برآمدے میں ٹوبیہ کی قدموں کی چاپ سُنائی دی تو وہ بہت آہستہ سے اماں کے پاس سے اُٹھ کر کمرے سے نکل آیا۔ ٹوبیہ، ندا کا فیلڈر لیے کچن کی طرف جا رہی تھی۔ وہ وہیں کھڑا ہو گیا اور جب وہ فیلڈر دیکھا تو واپس آئی تو ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہوا بولا۔

”صبح بخیر۔“

”جیتے رہو۔“ بڑے دنوں بعد وہ ہلکے سے مسکرائی۔

”آج جلدی کیسے اُٹھ گئے؟“

”وہ.....“ وہ اماں کے بارے میں بتاتے بتاتے رُک گیا۔

”اگر تم نماز پڑھ رہے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ یہ فیڈرندا کو دے دو۔ میں نماز پڑھ لوں۔“

اُس نے خاموشی سے ٹوبیہ کے ہاتھ سے فیڈرلی اور ندا کے پاس چلا آیا۔ تین ماہ کی منہمی سی بچی بڑے صبر سے انتظار کر رہی تھی۔

”منہمی گڑیا! ہم تمہارے ناز بھی نہیں اُٹھا سکے۔“

وہ دل ہی دل میں اُسے مخاطب کر کے بولا۔ پھر اُسے گود میں لے کر فیڈرنا اس کے منہ سے لگائی تو تاسف سے سوچنے لگا۔

”کنٹے خود غرض ہیں ہم جو اس منہمی سی جان پر توجہ ہی نہیں دے رہے۔ بھیا ہوتے تو کیا یہ یوں الگ تھلک سی پڑی رہتی۔“

”ارے تم نے اسے گود میں کیوں لے لیا۔“ ٹوبیہ نماز پڑھ کر آئی تو یونہی کہہ گئی اور وہ جو بچی پر جھکا کبھی اس کا ہاتھ ہونٹوں سے اور کبھی آنکھوں سے لگا رہا تھا۔ ذرا سا سر اُونچا کر کے دیکھا تو سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا اداس چہرہ کسی مصور کا شاہکار لگا۔ پتا نہیں وہ شروع سے ایسی حسین تھی یا ابھی ابھی اُترے اجالے کا روپ پڑا لائی تھی۔ وہ فوراً نظریں پُرا گیا اور دوبارہ بچی کا ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

”کیا میں اسے گود میں نہیں لے سکتا۔“

”کیوں نہیں لے سکتے۔ میرا مطلب ہے اگر تم اسے بستر پر ہی فیڈر دے دیتے تو یہ

پیتے پیتے سو جاتی۔“

”اب نہیں سوئے گی؟“

”نہیں۔ اب یہ کھیلتا چاہے گی۔“

”تو میں کھیلوں گا ناں اس کے ساتھ۔“

”اچھی بات ہے پھر میں چائے بنا لاؤں۔“ ٹوبیہ وہیں سے پلٹ گئی تو وہ فیڈر ایک طرف رکھ کر باقاعدہ بچی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ جواب میں اُس کی غوں غاں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ جس سے اس کے اندر کی کھٹن اور بوجھل پن دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ ساتھ ہی وہ بار بار ہنس بھی رہا تھا۔ جب ٹوبیہ چائے لے کر آئی تب اُس نے بچی کو اس کی جگہ پر لٹایا پھر بیڈ سے اتر کر اس کے ہاتھ سے مگ لے کر کرسی پر آ بیٹھا۔

”میں نے اماں کو دیکھا ہے۔ بے خبر ہو رہی ہیں۔“ ٹوبیہ، بچی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اُٹھایا نہیں۔“

”اچھا کیا۔ نہیں اُٹھایا۔ رات وہ ٹھیک سے سو نہیں سکیں۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اُن کی؟“ ٹوبیہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ وہ جس بات سے پریشان تھا اس کا اظہار کر گیا۔ ”بتا رہی تھیں، اُن کا بدن سُن ہو گیا اور مجھے ڈر ہے بھابی، کہیں فالج کا ایک نہ ہو۔“

”اللہ رحم کرے۔“ وہ فوراً بولی۔

”ہاں اللہ رحم کرے۔“ وہ گہری سانس لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آفس جانے سے پہلے انھیں ڈاکٹر کو دکھا جاؤں گا۔ بس آپ دُعا کریں۔ مزید کوئی پریشانی نہ ہو۔“

”پریشانیوں نے تو لگتا ہے اس گھر کا رستہ دیکھ لیا۔“

”ماپوس مت ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

پھر جب ڈاکٹر نے آکر اماں کے بارے میں اس کے بچے کی تصدیق کر دی کہ انھیں فالج کا ایک ہوا ہے تو وہ واقعی بے حد پریشان ہوا لیکن ٹوبیہ کے سامنے اس نے زیادہ اظہار نہیں کیا بلکہ اس سے یہی کہا کہ وہ اماں کا کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائے گا اور اُس وقت تو

ٹوبیہ نے بھی اس کی بات کا یقین کر لیا لیکن جب تین چار دن گزر گئے اور اس نے کسی ڈاکٹر سے رابطہ نہیں کیا۔ تب وہ سمجھ گئی اور اسی رات جب وہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھا تو ایک رومال اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”سنو۔ ویسے بھی اب یہ زہر میرے کسی کام کے نہیں۔ تم پلیز اماں کا علاج کراؤ۔“ وہ کھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ٹوبیہ نے اس کے سامنے رومال رکھا تو اس نے یونہی نظروں کا زاویہ بدل کر اس پوٹلی کو دیکھا اور اس کی بات سُن کر کتنی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پتا نہیں اُس کی بات ٹھیک سے سُنی نہیں یا سمجھا نہیں تھا۔

”سوچنے میں وقت برباد مت کرو عمر! مجھے اماں کی ضرورت ہے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر جانے لگی کہ اُس نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی تھام لی۔

”میرے بھائی کو آپ کی سوئی کلائیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔“

”پھر بھی وہ سوئی کر گیا۔“ ایک پل میں اس کا لہجہ بھیک گیا۔

”پلیز بھابی! یہ اُٹھالیں۔ میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“

”نادان مت بنو عمر۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اماں کا وجود کتنا اہم ہے۔ خدا نخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو ہمارے لیے زندگی کے راستے تنگ ہو جائیں گئے۔“ وہ بہت عاجزی سے کہنے لگی۔ ”میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں گی۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ اس کی بات نہیں سمجھا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو عمر۔ میں تمہاری بھانج ہوں اور رشتے کو لوگ اس وقت تک تسلیم کریں گئے جب تک اماں ہیں۔“

اس نے بہت آہستہ سے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اُسے تیز قدموں سے اماں کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنے آپ سے اُلجھنے لگا۔

”میں کیا کروں۔“ بے بسی ہی بے بسی تھی۔ وہ غلط نہیں کہہ گئی تھی۔ اسی نہج پر سوچ رہا تھا کہ وہ پکارنے لگی۔

”عمر یہاں آؤ۔“ وہ اُٹھ کر اماں کے کمرے میں آیا تو اُسے دیکھ کر بولی۔

”اماں بٹا رہی ہیں؟“

”جی اماں!“ وہ اماں کے پاس بیٹھ گیا۔ دوسری طرف وہ سامنے ہی اماں کے

سرہانے بیٹھی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔
”بیٹا!“ اماں بہت آہستہ آواز میں بولیں۔

”مجھے تم سے زیادہ ٹوبیہ اور ندا کی فکر ہے۔ یہ بات مناسب تو نہیں لگتی۔ پھر بھی اگر تم ٹوبیہ سے شادی کر لیتے تو.....“

”اماں!“ اس نے شپٹا کر ٹوبیہ کی طرف دیکھا اور یقیناً خود اس کی طرح ٹوبیہ کے بھی گمان میں نہیں تھا کہ اماں ایسی بات کریں گی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی اور وحشت کے ساتھ ہی ڈھیر سار پانی اتر آیا تھا۔ یوں اُچھل کر کھڑی ہوئی جیسے بچھوں نے کاٹ لیا ہو اور تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ جب کہ وہ بالکل غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ ساتھ نظروں کا زوایہ بدلتا گیا تھا اور جب اس کے قدموں کی آواز معدوم ہو گئی۔ تب اماں کی طرف متوجہ ہوا اور اتنی سی دیر میں اماں پر غنودگی چھا چکی تھی۔

”اماں!“ اُس نے آہستہ سے انھیں دو تین آوازیں دیں اور کوئی جواب نہ پا کر آہستہ سے اُن کے پاس سے اُٹھ کر آیا۔ اچانک اندر کہیں آگ سی آگ دھک اُٹھی تھی۔ تن من شلگنے لگا۔

فرق کو کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور اس کو منہ لگا کر ایک ہی سانس میں پی گیا اور اندر جلن تھی کہ بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی جا رہی تھی اضطراب الگ، جسے کم کرنے کی خاطر برآمدے میں ادھر ادھر ٹھیلنے لگا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ ایک بار یونہی ٹوبیہ کے کمرے کے سامنے رکا لیکن پھر فوراً آگے بڑھ گیا۔

اچانک اماں نے جانے کیسی دیوار کھڑی کر دی تھی کہ وہ اس کا سامنا کرنے سے ڈر رہا تھا۔ گویا وہ عمر میں اٹن سے زیادہ بڑی نہیں تھی یا ہو سکتا ہے اسی کی ہم عمر ہو لیکن بڑے بھائی کی بیوی ہونے کے ناتے شروع دن سے اس کا بڑی بڑی بہنوں جیسا رہا تھا اور وہ خود اس کا دل سے احترام کرتا تھا۔

اس لیے ڈر رہا تھا کہ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اماں کی بات کو محسوس نہ کرے۔ یہ سوچ کر دوبارہ اس کے دروازے پر زکا اور اس تمام عرصے میں پہلی بار دستک دی۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ دوسری اور تیسری دستک کے جواب میں بھی خاموشی۔ تب وہ دروازہ دھکیل کر اندر چلا آیا اور وہ جو سامنے ہی غالباً شش و پنج

میں کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر فوراً پیٹھ موڑ لی۔ لیکن اتنی سی دیر میں ہی وہ اس کی آنکھوں میں اُتری لالی دیکھ چکا تھا۔ یقیناً وہ اب تک رورہی تھی۔ اُسے ڈکھ ہوا۔ دروازے کے پاس ہی رُک کر بولا۔

”پتا نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن پلیز بھابی! آپ اماں کی بات کا خیال مت کیجیے اور پھر آپ تو جانتی ہیں کہ میں۔“ وہ یونہی خاموش ہو گیا اور وہ اچانک کسی خیال کے تحت فوراً اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

”سونیا! تم سونیا کی بات کر رہے ہوتاں“ اور کبھی کبھی کوئی لمحہ کتنا غالم ہوتا ہے۔ وہ ایسے ہی لمحے کی طرف گرفت میں آ گیا۔ نہ اثبات میں سر ہلا سکا نہ انکار میں۔ اپنا ہوش کہاں تھا۔ سامنے دو آنکھیں تھیں۔ بھیگی بھیگی سی اور جن میں اُتری لالی گو کہ شمت گریہ کی مرہون منت تھی؛ لیکن شفق کو مات دیتی لگی۔ پھر زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا۔ ان آنکھوں میں ستارے ناچتے تھے۔ ایک بار اُس نے جنید بھائی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

”تمہاری بہنتی ہوئی آنکھوں میں کاجل بڑا دُفرب لگتا ہے ٹوبیہ۔ ایک نظر میں ہی بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔“

اور اب نہ تو ان آنکھوں میں ستارے رقصاں تھے نہ ہنسی تھی اور نہ کاجل۔ پھر بھی پتا نہیں کیسی بے بسی تھی کہ وہ اپنے اندر چھن محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے کوئی دھیرے دھیرے اس کے دل کو مل رہا ہو۔

”عمر!“ وہ اس کا بازو دھلا کر بولی۔ ”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ بنا ہونٹ ہلائے اس نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔

اس کے اندر جو اچانک اور غیر متوقع طوفان اُٹھا تھا۔ اُسے دبانے کی کوشش میں وہ کتنی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر قصد اُسونیا کے بارے میں سوچنے لگا اور ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ تصور میں اُسے دیکھنا چاہتا اور اس کی جگہ دو آنکھیں سامنے آ جاتیں۔

”میرے خدا!“ اس نے بار بار سر جھٹکا کر اور تکیہ نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ نیند تو نہیں آرہی تھی اور اسی طرح آنکھوں میں پوری رات کٹی۔ پہلے فجر کی اذان ہوئی اور کچھ دیر بعد ہی برآمدے میں ٹوبیہ کے قدموں کی آواز سُنائی دینے لگی۔ وہ اس خیال سے اُٹھ گیا کہ جب تک وہ نماز پڑھے گی۔ وہ ندا کے پاس جا بیٹھے گا لیکن ابھی وہ دروازے تک ہی گیا تھا کہ

کہ اپنی بچی کو ہی دیکھ لیتا۔“ اماں کے آنسو آنکھوں کے کناروں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے اور وہ چپ چاپ اُن کے پاس سے اُٹھ آیا۔

”سُنو!“ وہ اُس کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ ٹوبہ اس کے پاس آ کر بولی۔ ”آج تم سونیا کے پاس ضرور جانا۔“

”کیوں؟“ وہ جھک کر جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا۔ اسی طرح..... اپنے کام میں مصروف رہا کر بولا۔

”بس میں جو کہہ رہی ہوں۔“ اُس کے لہجے میں ہلکا سا تحکم تھا کہ اُس نے ذرا سا سر اُونچا کر کے اُسے دیکھا پھر دوبارہ سر جھکا لیا۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟“

”کس کا؟“ وہ جوتوں پر ایک برش پھیر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”یعنی میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں۔“

”جواب دینا ضروری ہے کیا؟“

”جواب دو یا نہ دو لیکن جو میں نے کہا ہے وہ ضرور کرنا۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ افسردگی سے مسکرایا ”اور کوئی حکم؟“

”نہیں۔“ وہ جانے لگی لیکن اچانک یاد آنے پر پلٹ کر بولی ”اور ہاں سُنو اماں کے لیے کسی اسپیشلسٹ کا ضرور پتا کرنا۔“

”لیکن آج کی تاریخ میں تو ایک ہی کام ہو سکے گا۔ یا سونیا کے پاس جاؤں یا۔“

”تم دونوں کام کرنا۔ نہیں تو ابھی طے کر لو کہ تم ان دونوں میں سے کون سا کام کر سکتے ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم سونیا کے چلے جانا اور میں اسپیشلسٹ کا پتا کر لوں گی۔“

”آپ؟“

”کیوں۔ کیا میں نہیں کر سکتی؟“

”خیر آپ فکرت مت کریں میں دونوں کام کر لوں گا۔“

”سچ کہہ رہے ہوں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اُسے خدا حافظ کہہ کر باہر

اماں نے پکار لیا۔

”جی اماں!“ وہ پلٹ کر اُن کے پاس بیٹھ گیا۔

”تمہاری آپائیں آئیں؟“ اماں کو صبح ہی صبح پتا نہیں آپا کیسے یاد آگئی تھیں۔

”نہیں تو۔“

”خط لکھ کر بلاؤ اُسے۔“

”لیکن اماں! ابھی تو وہ گئی ہیں۔ اتنی جلدی کیسے آسکیں گی۔“

”ہاں!“ اماں نے کچھ دیر آنکھیں بند کیں پھر اُسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ ”تم کام پر تو جا رہے ہوں ناں۔“

”جی!“

اسی وقت ٹوبہ ندا کو لے کر آگئی۔

”کیسی طبیعت ہے اماں کی؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اماں نے خود ہی جواب دیا۔

”بس اماں! آپ جلدی سے اچھی ہو جائیں۔“ پھر ندا کو اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

”دیکھو۔ آج یہ نہیں سوئی۔ اب تم اسے پکڑو۔ میں ناشتا بنا لوں۔“

”ابھی تو بہت سویرا ہے۔“

”اچھا ہے ناں۔ جلدی فارغ ہو جاؤں گی پھر مجھے کچھ اور کام ہے۔“

”کیا کام؟ اُس نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ تو وہ جان گیا کہ وہ بے تکلفی کا انداز

اپنا کر محض یہ جتانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اُس نے اماں کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

”ضروری ہے کہ تمہیں ہر کام کی تفصیل بتائی جائے۔“ وہ ندا کو اس کی گود میں ڈال کر

قدرے عجلت سے کمرے سے نکل گئی۔ تو وہ بچی کو اماں کے برابر لٹاتے ہوئے بولا۔

”دیکھیے اماں! آپ کی پوتی۔“

”ارے بیٹا! ایسے کیا دیکھوں۔ میرا دل چاہتا ہے اسے گود میں لوں۔ سینے سے لگاؤں

”کتنی پیاری ہے اور اتنی ہی.....“

”بس اماں!“ وہ ٹوک گیا۔ ”کوئی غلط بات منہ سے مت نکالے گا۔“

”کیا کروں۔ اسے دیکھتی ہوں تو اپنا بچہ یاد آتا ہے۔ پروردگار اُسے اتنی مہلت تو دیتا

نکل آیا۔

آفس میں ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کو اماں کی بیماری کا پتا کر کسی اچھے ڈاکٹر کے لیے مشورہ مانگا تو ایک دن ڈاکٹر اعظم کا نام لیا۔ اُس نے انھی کا ایڈولس نوٹ کر لیا۔ البتہ سونیا سے وہ فی الحال نہیں ملنا چاہتا تھا۔ ایک تو اماں کی بیماری کے سبب دوسرے ابھی بھائی کا غم تازہ تھا۔ لہذا اُس نے سوچا۔ وہ ٹوبینے سے کوئی بھانا کرنے گا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ آفس سے نکلا تو سونیا سے سرراہ ملاقات ہو گئی۔ پہلے سونیا نے ہی اُسے دیکھا اور پکار لیا۔

”کیسی ہو؟“ اب جب وہ سامنے آگئی تھی تو وہ کسی طرح بھی اس سے نظریں نہیں پڑا سکا۔ بلکہ رات اماں کی بات سے جو اچانک اس کے اندر ایک طوفان سا اٹھا تھا۔ وہ بھی ختم گیا۔

”ٹھیک ہوں اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ اس کا ہٹا ہوا چہرہ دیکھ کر بولی۔

”دُکھ تو یہی ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔“

”کیا مطلب؟“

”چلو۔ کہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔“

”چلو!“ وہ بانیگ پر اس کے پیچھے بیٹھ گئی اور جب ایک کیفے کے صاف سترے

ماحول میں اس کے سامنے بیٹھا تو پہلے اس سے پوچھنے لگا۔

”تم بتاؤ، کیا کرتی رہی ہو؟“

”تمہارا انتظار۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔

”اور گھر میں سب ٹھیک ہیں۔“

”ہاں، ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو میں نے تمہیں خط لکھا تھا۔ کیا تم اسے پڑھ کر آئے

ہو؟“

”خط!“ فوری طور پر وہ سمجھا نہیں۔ سو جتنی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھے گیا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ چونکا اور سر جھٹک کر پوچھنے لگا۔

”کیا تم ابھی تک مجھے بہاول نگر خط لکھتی رہی ہو۔“

”ہاں۔ کیا تمہیں میرے خط نہیں ملے۔“

”نہیں۔ میرا مطلب ہے جب تک میں وہاں تھا تب تک تمہارے خط ملے اور یہاں آنے کے بعد تو ظاہر ہے۔“

”کب آئے ہو تم؟“

”کافی دن ہو گئے بلکہ مہینے۔“

”اچھا“ وہ غالباً ہرٹ ہوئی تھی۔ عجیب سی ہنسی کر چُپ ہو رہی۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اور وہ خود ہی بتانے لگا جس روز وہ آیا تھا اسی وقت سے تو اس کے ساتھ قسمت کا چکر شروع ہو گیا تھا۔ وہ خود پر اور اپنے گھر پر گزرنے والی ساری قیامتوں کا ذکر کر کے آخر میں کہنے لگا۔

”میں نے بار بار تمہارے پاس آنے کا سوچا لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔ ذمہ داریاں الگ اور پریشانیاں الگ۔ نہ بھابھ کی حالت دیکھی جاتی ہے اور نہ اماں کی۔“

”مجھے بہت دُکھ ہو رہا ہے لیکن عمر! تم کم از کم مجھے بتاتے تو سہی۔“ سونیا نے دُکھ کا اظہار اور شکوہ ایک ساتھ کیا۔ ”تم اتنے بڑے سانچے سے گزرے اور اگر اب بھی میں تمہیں نہ دیکھ لیتی تو شاید تم مجھے ابھی بھی نہ ملتے۔“

”نہیں۔ آج تو مجھے تمہارے پاس آنا ہی تھا۔“

”منہ دیکھنے کی بات مت کرو۔“

”میرا یقین کرو کیونکہ آج صبح بھابی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے ضرور ملوں۔“

”بھابی کے کہنے پر ناں۔ تمہیں خود تو خیال نہیں آیا۔“

”مجھے خیال تھا سونیا! بس یہ چاہتا تھا کہ پہلے اماں ٹھیک ہو جائیں لیکن اماں کی تو وہی بات ہے کہ مرض بڑھتا گیا۔ جوں دوا کی۔ مجھ سے زیادہ بھابی پریشان ہیں۔ بیچاری سارا دن اماں کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور جب سے اُن پر فالج کا ٹیک ہوا ہے تب سے تو۔ تم سمجھ سکتی ہو۔ کیا حالت ہو گئی۔“

وہ گہری سانس ہونٹوں کے اندر ہی دبا کر خاموش ہو گیا۔

”اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ وہ اُسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”تم حوصلہ نہ ہارو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اصل میں، میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اب احساس ہوتا ہے کہ بھائی کتنا

بڑا سہارا تھے۔“ معاکھڑی پر نظر پڑی تو کہنے لگا۔

”کافی دیر ہوگئی۔ بھابی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو میں تعزیت کے لیے تمہاری بھابی کو کہلواسکوں۔

البتہ میرا سلام ضرور کہہ دینا اور شکریہ بھی۔“

”شکریہ کس بات کا؟“

”کہ انھوں نے مجھے مزید انتظار کی اذیت سے بچالیا۔ تمہیں میرے پاس بھیج کر۔“

ایک پھکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گھر میں داخل ہوا تو ثوبیہ واقعی اس کے انتظار میں تھی۔ لپک کر اُس کی طرف آتے

ہوئے بولی۔

”اتنی دیر کیوں کر دی تم نے؟“

”دیر ہوتی تھی۔ آپ نے دودو کام جو سر پر ڈال دیے تھے۔ ویسے آپ اتنی پریشان

کیوں ہیں؟“

”دوپہر میں اماں کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔“

”پھر کیا کیا آپ نے؟“

”کلینک سے ڈاکٹر کو لے آئی تھی۔ اس کی دوا سے کچھ فرق تو پڑا لیکن سارا وقت الٹی

سیدھی باتیں کرتی رہیں۔ بار بار آپا کو بلانے کا اصرار بھی کر رہ تھیں اور میں تو کہتی ہوں عمر، تم

آپا کو فون کر دو۔ اُن کے آنے سے ہماری ڈھارس بھی بندھ ہو جائے گی۔“

”اماں جاگ رہی ہیں؟“ وہ اس کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلا کر پوچھنے

لگا۔

”نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی سوئی ہیں۔“ وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا کمرے

میں آیا اور کھڑے کھڑے اماں کو دیکھ کر دوبارہ برآمدے میں آ بیٹھا۔ کچھ دیر بعد ثوبیہ چائے

لے آئی اور گگ آسے تھماتے ہوئے بولی۔

”تم بھی کیا سوچے ہو گئے گھر میں داخل ہوتے ہی۔“

کس کے گھر میں؟“ وہ فوراً ٹوک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ صبح جو دودو کام کہے تھے وہ کیسے۔“

i

”ہاں! یہ رہا ڈاکٹر کا ایڈریس۔“ اس نے جیب سے کارڈ نکال کر میز پر رکھا۔ ”آفس

سے دودو کی چھٹی بھی لے لی ہے۔ کل ہی ڈاکٹر اعظم سے مل کر معلوم کر لوں گا کہ

اماں کا علاج گھر پر کریں گے یا انھیں اُن کے کلینک میں ایڈجسٹ کرنا پڑے گا۔“

”اور سونیا سے ملے؟“

”اس سے بھی ملا ہوں۔“

”کیا حالت ہے اس کی۔ میرا مطلب ہے، اس کی دوسری بہن کی شادی ہوگئی؟“

”ہنا نہیں۔ یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔“

”تو پھر میں نے کس لیے تمہیں اس کے پاس بھیجا تھا؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟“ وہ بھی جھنجھلا گیا۔

”میں جلد تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا۔ اُسے جیسے یقین نہیں آیا۔“ آپ کا دماغ ٹھیک ہے۔ ان حالات میں میری

شادی کا سوچ رہی ہیں۔“

”تم میری بات سمجھو۔“

”بس کریں بھابی! حد کرتی ہیں آپ بھی۔ ابھی بھابی کا کفن میلا نہیں ہوا۔ ماں بستر

مرگ پر پڑی ہے اور میں سر پر سہرا سجالوں۔ ناممکن۔“ وہ خفا ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات میں وہ اماں کے پاس سوتا تھا اور ثوبیہ سے کیونکہ خفگی کا اظہار کر چکا تھا۔ اس لیے

کھانا کھاتے ہی بہت خاموشی سے اپنی جگہ پر آ لیٹا۔ ورنہ روزانہ تو کچھ دیر کے لیے ندا کے

ساتھ کھیلتے ہوئے ثوبیہ سے ادھر ادھر کی باتیں کر لیتا تھا۔ ابھی اس کا دل چاہا۔ چپ چاپ

سو جائے۔ کچھ تھکا ہوا بھی تھا۔

لیکن اماں کے ہلکے ہلکے خراٹے سونے نہیں دے رہے تھے۔ پھر وقفے وقفے سے وہ

کچھ بڑبڑانے بھی لگتی تھیں پوری بات تو نہیں لیکن کوئی کوئی لفظ صاف سُنائی دے جاتا اور

کافی دیر بعد اس نے غور کیا کہ صاف سُنائی دینے والا لفظ ثوبیہ ہے۔ تب وہ اس خیال سے

اٹھ کر بیٹھا کہ شاید اماں ثوبیہ کو بتا رہی ہیں۔ اپنے پنگ سے اتر کر اماں کے پاس آ بیٹھا اور

ن کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پوچھنے لگا۔

”کیا بات ہے اماں۔ کچھ چاہیے تو مجھے بتائیں۔“

”ٹوبیہ اکیلی ہے۔“ اماں کی آنکھیں بند تھیں۔ غنودگی میں بول رہی تھیں۔

”کیا کہوں گی جنید سے۔ ٹوبیہ کو کس کے حوالے کر آئی ہوں۔“

”اماں!“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ”میں ہوں ناں۔ میں ہوں ناں اماں۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ بھابی اکیلی نہیں ہیں۔ ندا ہے اُن کے پاس اور میں۔“ اُس نے یقین دلایا اور اگر اُسے معلوم ہوتا کہ اماں یقین کی ڈوری تھامتے ہی جنید بھائی کے پاس پہنچیں گی تو وہ کبھی اُنھیں یہ یقین نہ دیتا۔ کتنی دیر تک ساکت بیٹھا اُنھیں دیکھے گا۔ شاید وہ کچھ کہیں گی لیکن وہ کہنے سننے کی حد سے دور جا چکی تھیں۔

”بھادج!“ پہلے اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی پھر اتنی زور سے چیخا کہ وہ دہل کر بھاگی آئی تھی۔

☆☆☆

چند مہینوں میں یہ دوسرا سانحہ تھا۔ جس نے گھر کے درود یوار تک کو ہلا دیا تھا اور اس بار دسویں ہی دن آپا جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ تو وہ کچھ نہیں بولا۔ البتہ ٹوبیہ ان کی منت کرنے لگی۔

”پلیز آپا! آپ نہ جائیں۔ ہم اکیلے ہو جائیں گے۔“

”جانا تو ہے ہی۔ چاہیے پانچ دن اور رُکوں یا دس دن۔ البتہ تم میرے ساتھ چلو تو۔“

”نہیں۔“ ٹوبیہ سے پہلے وہ بول پڑا۔ ”بھابی کہیں نہیں جائیں گی۔“

تو میں کیسے رُک سکتی ہوں۔ تمہارے دو لہا بھائی پہلے ہی چلے گئے ہیں۔“

”ہم آپ کو مجبور نہیں کر سکتے آپا۔ آپ ضرور جائیں۔“ اس نے کہا اور اشارے سے

ٹوبیہ کو بھی منع کیا کہ وہ اُنھیں زیادہ مجبور نہ کرے۔“

آپا چلی گئیں تو گھر ایک دم خالی ہو گیا اور اب تو جیسے کرنے کو بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ اماں خواہ بیمار تھیں۔ ایک کمرے میں پڑی رہتی تھیں۔ پھر بھی اُن کے اتنے کام ہوتے تھے۔ جنہیں کرتے ہوئے خود اپنے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ ادھر اماں کی دوا کا وقت ادھر ندا کو دودھ دینا ہے۔ مصروفیت بڑی نعمت تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی چلتے اور ذہن بھی۔ اب یوں لگتا جیسے بالکل بیکار ہو گئی ہو۔ کہیں کوئی غلت نہیں تھی۔ ست رومی سے کچن میں جانی۔ ایک وقت کھانا پکانی تو تین وقت چل جاتا۔ وہ بہت خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ آخر اُس روز

ٹوک دیا۔

”بھادج! اس طرح تو ہم بہت جلدی تھک جائیں گے۔ جب ہم مرنے والوں کے ساتھ مرنے نہیں گئے اور یہ طے ہے کہ جب تک ہماری زندگی ہے ہمیں زندہ رہنا ہے تو پھر خود کو زندہ کی قطار سے الگ کیوں کریں یہ تو نہیں کہ ہم بالکل تہی دامن ہیں۔ آپ کے پاس ندا ہے اور میرے سامنے دونوں۔ ہم تنہا نہیں ہیں اور یہ جو اس گھر پر آرزو گیوں کے بادل چھائے ہیں یہ خود سے نہیں چھٹیں گے۔ جب تک کہ ہم کوشش نہ کریں، ہم خود نہ چاہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو لیکن کیا کروں۔ دل کسی بات پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔“

”آمادہ کریں اسے۔ چلیں، میں آپ کو باہر لے چلتا ہوں۔ ندا بھی خوش ہوگی۔“

”نہیں عمر!“

”انکار نہیں۔ چلیں اُنھیں۔“

اُس نے زبردستی اُسے اٹھایا اور جب تک وہ چادر اوڑھنی کو اٹھاتی وہ بایک باہر نکال چکا تھا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ گھر کی فضاؤں میں رچی بسی ادا سیوں کو بھگانے میں کامیاب ہو رہا تھا اور اس کوشش میں وہ جتنے جتن کر رہا تھا وہ سب اس کے لیے الزام بن گئے۔ لوگوں میں پہلے چیمگیوئیاں شروع ہوئیں۔ اشارے بازی اُسے دیکھ کر معنی خیزی سے مسکراتا اور پھر ایک روز باقاعدہ اُسے روک لیا گیا۔

”یہ شریفوں کا حملہ ہے۔ یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ کیا لگتی ہے وہ تمہاری جسے روز سیر سپاٹے کے لیے لے جاتے ہو۔“

”بھادج“

”کیسی بھادج؟ جب بھابی ہی نہیں رہا۔ نکالو اُسے کچھ نہ ہم بھی بھادج بنا کر رکھیں گے۔“

وہ غصے سے کاٹنے لگا۔ دل چاہا ایک یا ک کا منہ نوچ لے۔ بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے اندر آیا تو سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا بدن ابھی تک کانپ رہا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ بات اگر صرف اُس کی ذات کی ہوتی تو وہ کبھی پرانہ کرتا۔ لیکن ظالموں نے اس کے ساتھ ٹوبیہ کو بھی گھسیٹ لیا تھا اور گو کہ وہ کمزور نہ تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ کبھی کبھی طاقت کا استعمال خود اپنے لیے مسائل کھڑے کر دیتا ہے۔

”عمر!“ ثوبیہ اُسے لکارتے ہوئے آگئی۔ ”اتنی خاموشی سے آئے ہو۔ ہتا بھی نہیں چلا اور پُچپ چاپ کیوں بیٹھ گئے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟“

”ہاں! بس کچھ تھک گیا ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھنے بغیر بولا اور فوراً جھ کر جوتے اُتارنے لگا۔

”چائے لاؤں یا پہلے کھانا کھاؤ گئے؟“

”بھوک بالکل نہیں ہے۔ بس چائے پی لیں گا۔“ اس کے ساتھ ہی اُٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ کتنی دیر تک منہ اور سر پر پانی ڈال رہا پھر کپڑے بدل کر نکلا تو وہ چائے لیے کھڑی تھی۔

”ندا کہاں ہے؟“ اُس کے ہاتھ سے لگ لیتے ہوئے پوچھا۔

”اُسے میں برآمدے میں بٹھا آئی ہوں۔ اصل میں اب وہ کھلی جگہ چاہتی ہے۔“

اُس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کھڑے کھڑے تین چار گھنٹہ میں گ خالی کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اگر آپ کو باہر کا کوئی کام ہو تو بتا دیں ورنہ پھر میں سو رہا ہوں۔“

”اتنی جلدی۔ ابھی تو سات ہی بجے ہیں۔“

”نیند آرہی ہے۔ اگر فوراً نہیں سویا تو پھر بہت دیر تک جاگتا رہوں گا۔ جب کہ صبح مجھے جلدی جانا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ سو جاؤ۔“ وہ چلی گئی تب وہ احتیاط سے دروازہ بند کر کے بیڈ پر آ بیٹھا۔ نیند کا تو بس بہانا تھا۔ اصل میں وہ تنہائی چاہتا تھا اور تنہائی ملی تو وہ بکھرنے لگا۔

حالات نے عجیب دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا اور ثوبیہ کی کبھی بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے عمر! کہاں کا وجود کتنا اہم ہے۔ خدا خواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو ہمارے لیے زندگی کے راستے تنگ ہو جائیں گئے۔“

”پھر اب میں کیا کروں؟“ وہ اپنی بے بسی پر کڑھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”بھابی اور ندا میری ذمہ داری ہیں۔ انھیں میں نہیں چھوڑ سکتا اور لوگوں کی زبانیں پکڑنا بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ اگر بھابھ کو ان باتوں کا علم ہو گیا تو انھیں کتنا دکھ ہوگا۔ پھر کیا کروں۔“

اسی پل اُسے سونیا کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوچوں کو ایک نیا کنارہ مل گیا۔

اگلے دن پہلی فرصت میں اُس نے آپا کو فون کیا اور کیونکہ ان سے وہ فری نہیں تھا۔ اس لیے بہت سوچ کر بولا۔

”آپا! اماں کے بعد میں اور بھابھ اکیلے ہو گئے ہیں اور میں چاہتا ہوں اس سے پہلے کہ لوگ غلط قسم کی باتیں کریں۔ میں۔“ وہ انھیں سونیا کے بارے میں بتاتے ہوئے کچھ جھجک گیا۔

”ہاں عمر! میں خود تم سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہی تھی۔“ آپا فوراً بول پڑیں۔ ”میرا خیال تھا تمہیں سمجھانا پڑے گا لیکن اللہ کا شکر ہے تم خود سمجھ گئے ہو ویسے اتنی جلدی یہ سب مناسب تو نہیں لگتا لیکن کیا کریں۔ حالات ہی ایسے ہیں۔ بہر حال زیادہ دھوم دھڑکے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سادگی سے ثوبیہ سے نکاح کر لو۔“

”جی!“ وہ ایک دم سناٹے میں آ گیا اور آپا اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہے گئیں۔

”میں تمہارے دولہا بھائی سے بات کر دیتی ہوں۔ اگر انھیں فرصت ہوئی تو پھر ہم دونوں آجائیں گئے ورنہ تم محلے کے کچھ معزز لوگوں کو بلانا کر یہ کام کر ڈالو۔ سمجھ رہے ہونا۔“

ہیلو عمر۔ ہیلو۔ ہیلو۔“

وہ قوت گویا کی کھوپکا تھا اور آپا نے مایوس ہو کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس شام وہ یونہی سرٹکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ کبھی خود کو لوگوں کے جھوم میں گم کر دیتا اور کبھی ایک دم تنہا ہو جاتا۔ شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے اور پھر تاریکی پر پھیلا دیے۔ گو کہ پورا شہر روشنیوں سے جگمگانے لگا تھا۔ لیکن اُسے اپنے راستے پر روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آئی۔ گھر جانے کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی۔ پھر بھی گھر تو جانا ہی تھا اور وہ اس وقت گھر آیا جب اس کے خیال میں ثوبیہ نیند میں سے اُٹھ کر دروازہ کھولے گی اور پھر فوراً جا کر دوبارہ سو جائے گی۔ لیکن اُسے اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھ کر وہ بے حد نادام ہوا۔

”آپ سو جاتیں۔“

”کیسے سو جاتی اور یہ تمہیں اتنی دیر کہاں ہو گئی۔ پلیز جلدی آ جایا کرو۔ شام کے بعد مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”آپ ڈرتی بھی ہیں؟“

”اب تو دل میں صرف ڈر ہی رہ گیا ہے۔ بہر حال یہ بتاؤ کھانا کھاؤ گئے یا۔“
”کچھ بھی نہیں۔ آپ سوئیں جا کر۔“

وہ جلدی سے اُسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور لباس تبدیل کر کے اپنی جگہ پر لیٹا تو غائبانہ تھکن کے باعث فوراً نیند بھی آ گئی۔

صبح چھٹی تھی۔ جب ہی معمول کے مطابق اذان کی آواز کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی۔ لیکن وہ دوبارہ سو گیا۔ اس کے بعد ٹوبیہ نے اُسے اٹھایا۔ وہ سامنے کھڑی بہت آہستگی سے اس کے پیر کا انگوٹھا ہلا رہی تھی اور وہ نیند سے بیدار ہو رہا تھا۔ بلا ارادہ اس کی انگلی اپنے پیر کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان جکڑ گیا کہ وہ ہلکے سے چیخی اور فوراً اپنا ہاتھ کھینچ کر پیچھے ہٹ گئی۔

”سوری!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بس ایک لمحے کو ہی اس کی طرف دیکھ سکا۔ پھر وہی ظالم لمحہ تھا کہ اندر کہیں آگ دکھ اٹھی تھی۔ جس سے تن من سلگنے لگا۔

”چلو۔ اب جلدی سے آکر ناشتا کرلو۔“ وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی اور وہ اپنے آپ سے لڑنے لگا۔ بمشکل خود کو سمجھا کر اٹھا اور منہ..... ہاتھ دھو کر کمرے سے نکل آیا۔ وہ برآمدے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ اس کی آمد محسوس کر کے بولی۔

”ناشتا ٹیبل پر رکھ دیا ہے۔“

”آپ کر چکیں؟“

”ہاں“

وہ اس کا جواب سن کر آگے بڑھ آیا۔ پھر ناشتے کے دوران وہ سوچتا کچھ اور چاہتا تھا لیکن آپا کی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔

”تم سادگی سے ٹوبیہ سے نکاح کرلو۔“

دماغ تا نید کر رہا تھا۔ کچھ دیر کو دل نے بھی ساتھ دیا لیکن پھر ہبک گیا۔ غالباً ظالم لمحے نے اُسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ پھر بھی کچھ اثر باقی تھا۔ جب بھی اُس کے پاس آکر بیٹھا تو کہنے لگا۔

”ایک بات بتائیں۔ سارا دن آپ اکیلی ہوتی ہیں۔ کام کے علاوہ جب فراغت

سے بیٹھی ہیں تو کیا سوچتی ہیں۔“

”کوئی ایک سوچ تو نہیں۔ بہت ساری سوچیں ہیں۔“
”مثلاً؟“

اور وہ سادگی اور صاف گوئی سے بتانے لگی۔

”کبھی گئے دنوں کا خیال آتا ہے کہ جنید کی محبت نے مجھے کتنا مطمئن اور آسودہ کر دیا تھا۔

پھر اپنے حال پر نظر ڈالتی ہوں تو شکوہ یوں نہیں کرتی کہ جنید نظر سے اوجھل ہوئے ہیں۔ دل میں تو اسی طرح موجود ہیں۔ پھر اُن کی نشانی ندا میرے سامنے ہوتی ہے اور تم ہو۔ آج کل مجھے زیادہ فکر تمھاری ہے۔ میں چاہتی ہوں تم شادی کرلو۔“
”کس سے؟“ وہ بلا ارادہ کہہ گیا۔

”کیا مطلب؟ سو نیا کے علاوہ بھی کوئی لڑکی ہے۔“

وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔ پھر فوراً خود ہی بولی۔ ”ایسی چھپوری حرکتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی آج سو نیا کے گھر جانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہوں۔“
”آج۔“ اس کا انداز سوچتا ہوا سا تھا۔

”ہاں آج شام میں چلیں گئے۔ میں نے آپا کو بھی خط لکھ کر انھیں سو نیا کے بارے میں بتا دیا ہے اور یہ بھی کہ ان حالات میں تمھاری فوری شادی ناگزیر ہے۔“ پھر رمان سمجھاتے ہوئے بولی۔

”دیکھو ناں عمر! لوگوں کی ذہنیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ گو کہ آس پاس کے سب لوگ ہمارے گھر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جنید کی عادت کا تو تمھیں پتا ہی ہے۔ سب سے ملتے تھے اور اماں بھی اور اب جب کہ وہ دونوں نہیں رہے تھے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں کب کون کسی بات کر جائے اور ہم کسی کو روک تو نہیں سکتے ناں۔“

وہ قصداً خاموش رہا کہ کہیں غلطی سے اُسے بتانہ جائے کہ لوگ ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔

”پھر آج چل رہے ہوتا؟“

”جی! لیکن آپ نے اپنے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔“

”کیا؟“

”یہی کہ اپنے بارے میں کیا سوچتی ہیں۔“ وہ ہنسی سے کہتا تھا۔
 ”پہلے میں اپنے ہی بارے میں تو بتایا ہے کہ میں جنید کی محبتیں اور مہربانیاں سوچتی ہوں۔“

”میں گئے دنوں کی نہیں آنے والے دنوں کی بات کر رہا ہوں۔“

”اور میں آنے والے دنوں کا بھی بتا چکی ہوں کہ خدا اور تمہارے لیے سوچتی ہوں اور مزید کوئی سوال کرنے سے پہلے سن لو کہ تم اور خدا مجھ سے الگ نہیں ہو۔ میری ساری اُمیدیں، ساری خوشیاں تم دونوں سے وابستہ ہیں۔ سمجھ تم۔“
 وہ بس اُسے دیکھ کر رہ گیا۔ پتا نہیں کیسے ایک بے نام سی خلش نے دھیرے سے دل کا واٹن تھام لیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے دل کا معاملہ سمجھ میں نہیں پایا۔ کہاں تو سو نیا کو پانے کے لیے چلتا تھا اور اب جب وہ اس کی زندگی میں آگئی تھی تو یوں خاموش تھا جیسے احتجاج پُا پ سا وہ لی ہو۔ دھڑکنوں میں نہ کوئی ہلچل تھی نہ کوئی بے ترتیبی۔ پُ سکون ندی کی مانند ٹھہرا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اپنی کیفیت خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بہت خاموشی سے اُن لمحوں کو آواز دینے لگا جنہیں اُس نے اس ملن رُت کے حوالے سے رنگین کیا تھا۔ لیکن کوئی ایک لمحہ بھی گرفت میں نہیں آیا۔ تب وہ سر جھٹک کر خدا کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جارہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ اُسے تھپکنے لگا۔ ٹوہیہ غالباً سو نیا کو نئے سرے سے سنوارنے میں مصروف تھی۔ کچھ دیر بعد آئی تو خدا کی نیند کے خیال سے سرگوشی میں بولی۔
 ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلادیا تو ٹوہیہ ایک نظر خدا پر ڈال کر کچن کی طرف چلی گئی اور اس نے وہاں سے اُٹھنے میں بھی کافی دیر لگا دی۔ پُر بھی اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ٹوہیہ کے پیچھے کچن میں آگیا اور اُسے منہ چھپائے روتے دیکھ کر اس کے اندر کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

”بھادوچ!“ بمشکل اُسے پکار سکا اور وہ جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”آپ رورہی ہیں؟“ وہ دیکھ چکا تھا پھر بھی
 ”نہیں تو۔“

”یہ آنسو۔“ وہ اس کی پلکوں پر ٹھہرے قطرے اپنی انگلیوں پر سمیٹ کر بولا۔
 ”بس یونہی چھٹک آئے۔“

”یو اُچی اُنھیں بھادوچ۔ سچ بتائیں کیا بات؟“
 ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ سو نیا انتظار کر رہی ہے۔“
 ”چلا جاؤں گا۔ پہلے میری بات کا جواب دیں۔“
 وہ اُڑ گیا۔

”اب تم اتنے نادان تو نہیں ہو عمر!“ وہ عاجز ہو کر بولی۔ ”آج تمہاری شادی ہوئی اور کوئی شور شرابا نہیں ہے۔ ہم ایسا تو نہیں سوچا تھا اور پتا ہے، جنید کو اتنا ارمان تھا تمہاری شادی کا اور اماں اُن کے پاس تو آخر وقت میں صرف یہی موضوع رہ گیا تھا۔ اگر وہ دونوں ہوتے تو۔“

آنسوؤں کے سبب اس کی آواز ساتھ چھوڑ گئی۔ تو اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

”بھلا ایسی بھی کوئی خوشی ہوتی ہے جس پر ہم ہنس نہیں سکے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد نہیں دے رہے۔ اس کے برعکس گھٹن کا احساس ہو رہا ہے۔“

”ہاں گھٹن تو ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولا پھر بغور اُسے دیکھ کر پوچھا۔
 ”گھٹن کیوں ہے بھابی؟“

”شاید اس لیے کہ اندر سے ہم اب بھی خوف زدہ ہیں اتنے بڑے بڑے دکھ اٹھا کر ہمارے دل ڈرنے لگا۔“

”ہاں شاید یہی بات ہے۔“ اُس نے جیسے خود کو بہلایا۔ پھر اس سے کہنے لگا۔

”بس آپ روئیں مت۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے۔“

”میں کہاں رورہی ہوں اور یہ تم ابھی تک یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔“ پھر خود پر قابو پا کر ہلکے سے مسکرائی۔

”جاؤ عمر! کل کا سورج تمہارے لیے ڈھیر ساری خوشیوں کی نوید لے کر طلوع ہو گا۔“

”جاؤ میرے لیے کیوں؟“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

”نادان لڑکے! تمہاری خوشیوں ہی سے تو ہماری خوشیاں وابستہ ہیں۔“

وہ اُسے کچن سے باہر دھکیلے ہوئے بولی تو وہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا اور کمرے کی ند تو آرائش کی گئی تھی اور نہ ہی نیا پن پیدا کرنے کے لیے ترتیب ہی بدلی گئی تھی پھر بھی ایک مہکتے وجود نے اتنا سحر پیدا کر دیا تھا کہ پہلے مرحلے پر اس کے اندر کا سناٹا ٹوٹا پھر دھیرے دھیرے گھٹن کا احساس بھی زائل ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹھہرے ہوئے دل میں ہلچل ہوتے بھی دیر نہیں لگی تھی۔

حسب معمول فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ تو پہلے پہلو میں سوئی سوینا کو دیکھ کر غالباً یہ یقین حاصل کیا کہ رات اُس نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ پھر آپ ہی آپ اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ اسی وقت برآمدے میں ٹوبیہ کے قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ اٹھ بیٹھا اور سوینا کے بالوں کو ہلکے سے جھٹکا اُسے پکارا تو وہ ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھنے لگی۔

”اٹھ جاؤ۔“ وہ پیار سے بولا۔

”اتنی جلدی، ابھی تو صبح بھی نہیں ہوئی۔“

”صبح ہو چکی ہے اور میں چاہتا ہوں۔ جب تک بھابی نماز پڑھیں ہم اُن کے لیے زبردست قسم کا ناشتا تیار کر لیں۔“

”ہوں۔“ سوینا کا ہر سوچ انداز پھر وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ وہاں سے نکلی تو وہ اُسے اپنے ساتھ کچن میں لے آیا اور ابھی فریج میں سے انڈے نکال کر اس کے سامنے رکھ رہا تھا کہ ٹوبیہ آگئی۔ اُن دونوں کو دیکھ کر بے حد حیران ہو کر بولی۔

”یہ تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہوں۔“ اس کی آواز پر وہ تیزی سے اس کی طرف پلٹا جب کہ سوینا اس کی اوٹ میں ہو گئی۔

”بس بھادج! آج سے آپ کے لیے ناشتا ہم بنایا کریں گئے۔“

”بکومت۔ چلو نکلو یہاں سے۔“

”جی نہیں! آپ اندر جائیں۔“

”عمر۔“ رعب جمانے کی کوشش فسنول ہے۔“

”ٹھیک ہے تم بناؤ ناشتا اور سوینا تم میرے ساتھ آؤ۔“ اُس پر اثر ہوتے نہ دیکھ کر ٹوبیہ نے سوینا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے سوینا کو اندر لے گئی تو وہ بے حد جھنجھلا لیکن اب ناشتا اُسے ہی بنانا تھا اور یہ اس کے لیے کوئی نیا اور مشکل کام نہیں تھا پھر بھی اب بہت مشکل لگ رہا تھا۔

☆☆☆

اُس کی شادی سے اتنا فائدہ ضرور ہوا تھا کہ ایک تو لوگوں کی زبانیں بند ہو گئی تھیں۔ دوسرے گھر پر جو مسلسل اداسیوں کے بادل چھائے تھے۔ وہ بھی دھیرے دھیرے چھٹنے لگے تھے۔ اس میں زیادہ حصہ یقیناً سوینا کا تھا۔ جس کی بے ساختہ ہنسی اچانک خاموشیوں کا سینہ چاک کر دیتی اور چوڑیوں کی جھنکار سے ماحول میں خوب صورت ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اور ٹوبیہ جیسے مدتوں سے ان آوازوں کو ترس رہے تھے۔ پہلے چونک کر سوینا کو دیکھتے پھر مسکرانے لگتے اور وہ تو پہلے ہی اس ماحول کو بدلنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن لوگوں کی باتوں سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور اب ایسا کوئی خوف نہیں تھا۔ اس لیے سوینا کے ساتھ مل کر ہلا گلا چائے رکھتا اور زیادہ اُسے ٹوبیہ کا خیال تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی بھادج کے سامنے ابھی طویل زندگی ہے اور اگر وہ اسی طرح اندر ہی اندر کھپتی رہی تو بہت جلد تھک جائے گی جب کہ ندا کے لیے اُسے زندہ رہنا ہے۔ اس لیے وہ اس کی خوشی کی خاطر ماحول کو خوشگوار بنائے رکھتا۔ پھر اپنے انداز میں پہلے جیسی بے تکلفی بھی لے آیا تھا۔

شادی کے بعد وہ آج آفس گیا تھا۔ واپسی پر اپنے مخصوص انداز میں دروازے میں دروازے ہی سے پکارتا ہوا آیا۔

”بھادج۔“

ٹوبیہ اندر تھی جب کہ سوینا برآمدے میں کھڑی تھی اور پتا نہیں وہ اُسے دیکھ نہیں سکیا دیکھ کر بھی نظر انداز کرتے ہوئے ٹوبیہ کی طرف بڑھا جو اس کی آواز سن کر کمرے سے نکلی تھی اور اس کی گود سے ندا کو لے کر وہاں اچھالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میری زوجہ کہاں ہے؟“

اور پہلے ہی مرحلے پر سوینا کو اپنا یوں نظر انداز کیا جانا، سخت ناگوار گزارا پھر بھی بظاہر کھلکھاتی ہوئی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ”ہیلو عمر عباس!“

تب اُسے کہنا پڑا۔

”اصل میں یہ اس وقت کہیں باہر جانے کے موڈ میں ہے۔“

”تو لے جاؤ ناں۔“

”آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اتنا میں تھکا ہوا ہوں۔“

”کوئی تھکے ہوئے نہیں ہو، چلو جاؤ۔“ ثوبیہ نے اس کے سامنے سے کپ اٹھا لیا تو وہ

چینا۔

”چائے تو پینے دیں۔“

”سونیا کے ساتھ ہی پیٹا۔“

”بڑی ظالم ہیں آپ۔“ وہ جھلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہو۔ پھر پہلے وہ یونہی مختلف سڑکوں پر بانیک دوڑاتا رہا۔ جب شام کے سائے گہرے ہو کر اندھیرے سے ہم آغوش ہو گئے، تب وہ اُسے ایک اوپن ریوٹورٹ میں لے آیا۔ لان کے اطراف لگی باڑھ میں ننھے ننھے ققمی سائن بورڈز کی جگمگاتی روشنیوں میں مرجھائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ گہری سانس لے کر اُسی کی پشت سے سرنکا کر قدرے آرام سے بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔

”صرف چائے یا کچھ اور بھی لوگی؟“

”پہلے چکن پھر چائے۔“

اُس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور اُس کے آنے تک اپنی جیب کا اندازہ کر کے صرف ایک چکن کا آرڈر دیا اور وہ اس وقت تو کچھ نہیں بولی۔ جب ویٹر سلا د، چٹنی کے ساتھ پلیٹ چکن کی رکھ کر چلا گیا۔ تب کہنے لگی۔

”صرف ایک چکن کی کیا تک ہے۔“

”پہلے یہ تو کھالو۔ مزید کھانا چاہو گی تو اور منگوا دوں گا۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”تم نہیں لو گئے؟“

”نہیں اور پلیز اصرار مت کرنا کیونکہ مجھے بالکل خواہش نہیں ہے۔“

”پہلے بتاتے میں بھی منع کرو تھی۔“

”کم آن یار، اب جلدی کرو۔ گھر میں بھابی اکیلی ہیں۔ وہ فوراً پلیٹ پر جھکی ضرور لیکن

”ارے۔“ وہ اس کے اندازِ مخاطب پر محظوظ ہو کر ہنسا۔ ساتھ ہی آنکھ مار کر اپنے کمرے میں چلتے کا اشارہ ابھی کیا تو وہ جھینپ کر ٹوبیہ کی طرف دیکھنے لگی اور اُسے متوجہ نہ پا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”آج آفس میں دل تو نہیں لگا ہوگا۔“ ثوبیہ نے چھیڑا تو وہ سمجھ کر بھی انجان بنا۔

”کیوں؟“

”یہ بھی بتاؤں۔“ ثوبیہ ہنسی اور اس کی گود سے ندا کو لیتے ہوئے بولی۔

”جاؤ اپنے بے تابیوں کا احوال سناؤ اُسے، میں چائے بناتی ہوں۔“

”بڑی استاد ہیں آپ۔“

وہ اُسے گھورتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے کھڑی سونیا پر یوں گرا جیسے چوکھٹ میں پاؤں الجھ گیا ہو حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

”ارے رے۔“ سونیا اس کے شکنجے میں پھڑپھڑا کر بولی۔ ”خیریت تو ہے۔“

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔“ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مسکرایا اور اس کا سر سینے سے لگا کر بولا۔

”سُو میرا دل کیا کہہ رہا ہے۔“

”وہی جو میرا دل کہہ رہا ہے۔“ وہ بھی شوخ ہو گئی۔

”تمہارا دل کیا کہہ رہا ہے۔“

”یہی کہ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”اوں ہوں۔“ وہ بہت آہستگی سے اُسے چھوڑ کر مسہری پر ڈھے گیا۔ ”ابھی تو باہر سے آ رہا ہوں اور باہر ہے کیا۔ ٹریفک کا شور، اافر اتفری اور.....“

”سونیا۔ چائے لے لو۔“ ثوبیہ کے پکارنے پر اس کی بات ادھوری رہی۔ فوراً اٹھا اور سونیا کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتا ہوا باہر آ کر بولا۔

”چائے ہم آپ کے ساتھ ہی پیئیں گئے بھابھو۔“

”بیٹھو سونیا۔“

”میں چائے نہیں پیوں گی۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”کیوں؟“ اس کے بجائے ثوبیہ نے پوچھا تو وہ ذرا سی ناک چڑھا کر وہیں بیٹھ گئی۔

کھانے کی رفتار بہت سست رکھی ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے غیر محسوس طریقے سے اس کا دھیان گھر کی طرف سے ہٹا دیا۔ چکن کے بعد چائے پھر چائے بھی ختم ہو گئی لیکن باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ یوں کتنی دیر ہو گئی اور اس سے پہلے کہ اسے احساس ہوتا وہ بول پڑی۔

”ارے اتنی دیر ہو گئی۔ کہیں بھابی پریشان ہو جائیں۔“

”ہیں۔“ اُس نے چونک کر گھڑی دیکھی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ”گیارہ بج گئے ہیں۔ جلدی چلو۔“

”بل تو بے کردو۔“

”ہاں۔“ وہ ویٹر کو بلانے کے بجائے خود ہی کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ بل پے کر کے تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا اور بہت غلٹ میں بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

”تم بھابی سے ڈرتے ہو یا۔“ وہ اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”ڈرنے کی بات نہیں ہے سو نیا! ہمیں اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔“

”نہیں۔“ اُسے اب صرف بھابی کا خیال تھا اس لیے اسپینڈ بڑھاتا چلا گیا اور گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے معذرت کی۔

”سوری بھابی، کچھ دیر ہو گئی۔“

”کوئی اتنی دیر نہیں ہوئی۔“ ٹوبیہ نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

”آپ کو ڈر تو نہیں لگا؟“

”نہیں۔ اب مجھے ڈر نہیں لگتا۔ یہ بتاؤ کھانا کھاؤ گئے یا.....“

”بالکل کھائیں گئے، لیکن آپ بالکل فکر مت کریں۔ سو نیا گرم کرے گی۔“

”اچھی بات ہے۔ پھر میں سونے جا رہی ہوں۔“

”شب بخیر“ اُس نے کہا اور سو نیا کے ساتھ کچن میں آ گیا۔

”یونہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس گھر میں بہت حد تک زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ گو کہ ویسا سکون اور ویسی بے پروائی تو نہیں تھی۔ جیسی اماں اور جنید کے وقت میں ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی ٹوبیہ اور عمر عباس نے بہت حد تک خود کو سنبھال لیا تھا۔ دلوں میں

درتو تھا لیکن قصداً ایک دوسرے سے چھپاتے تھے۔ پھر انسان صرف اپنے لیے نہیں میت خود سے وابستہ ہستیوں کی خاطر بہت کچھ سینے کے اندر دفن کر دیتا پڑتا ہے۔ ٹوبیہ اگرچہ عمر عباس کا گھر سا کر قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ تب بھی اس کے سامنے عداوت تھی۔ جس کی خاطر اُسے زندہ رہنا پڑا اور وہ خود کو اور اپنی بیٹی کو بوجھ تو نہیں سمجھتی تھی پھر بھی اُسے احساس ضرورت تھا کہ وہ عمر کی اضافی ذمہ داری بن گئی ہے اور یہ احساس ہی تھا۔ جو اُسے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ ابھی تو صرف سو نیا ہے کل کو جب بچے ہو جائیں گے تو عمر کے لیے اس گھر کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر کیوں نہ وہ کوئی جاب کرے۔ ان دنوں وہ بڑی سنجیدگی سے اس سچ پر سوچتی تھی۔ البتہ عمر سے کہنے اور پھر اُسے قائل کرنے میں بڑی دشواری نظر آرہی تھی۔ اس کے برعکس عمر عباس جس نے اماں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنی بھانج اور بھتیجی کو تنہا چھوڑ سکتا۔ وہ پورے خلوص اور ایماندار ہی سے اپنی بات پر قائم تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اُسے کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ ہو کر نہیں گیا کہ ٹوبیہ اور عدا کا اس کی اضافی ذمہ داری ہیں۔ وہ اس گھر کے تصور کے ساتھ بندھی تھیں۔ یعنی وہ ان دونوں کے بغیر اس گھر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی ذمہ داری کو نہ صرف سمجھتا بلکہ احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر سو نیا جو بہت پہلے عمر کی زبانی جان چکی تھی کہ اس گھر میں ٹوبیہ کا مقام ہے۔ اُسے یاد تھا کہ عمر اپنی بھانج کی کتنی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہا اس گھر کی ساری چھوٹی بڑی خوشیوں کو اُس کا مرہون منت قرار دیتا تھا اور اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ اس کے سامنے آکھڑی ہو۔ وہ اس سے نظریں پُرا کر پہلے بھانج سے اس کا اور عدا کا احوال پوچھتا۔ اس کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس مقام پر آ کر سو نیا کی سوچوں نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا اور جب انسان کی سوچیں متنی زرخ اختیار کر لیں تب وہ نہ بھی چاہے تب بھی غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے اور سو نیا کی پہلی غلطی یہ تھی کہ اُس نے براہ راست عمر سے بات کرنے کے بجائے دل میں گرہ ڈال لی تھی جس نے اُسے بدترین منافق بنا دیا۔ بظاہر یوں جیسے سب سے بڑی ہمدرد و خیر خواہ وہی ہو لیکن اس کے دل میں کیا تھا۔ اس کی ہوا بھی نہیں گنتے دے رہی تھی۔ بہر حال اس کے لیے ٹوبیہ اور عدا کا وجود ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ غالباً ان دونوں ماں بیٹی کو یہاں سے نکالنے کی تدبیر سوچ رہی تھی کہ عمر نے اس کے کندھوں پر

زور سے ہاتھ رکھے جس سے وہ بُری طرح چونکی اور خشمیں نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ایسا کیا سوچ رہی تھیں جو میرے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔“

”تم کہاں تھے؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”میں ذرا نڈا کو باہر لے گیا تھا۔“

”اس وقت؟“

اُس نے قصدا حیرت کا اظہار کیا حالانکہ کوئی اتنی رات نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں بہت تنگ کر رہی تھی۔ ویسے غلطی میری ہے۔ مجھے شام میں ہی اُسے گھملاانا

چاہیے۔“

”ہوں۔ اب تو ماشاء اللہ بہت شرارت کرنے لگی ہے۔ شام میں جب تمہارے آنے کا

وقت ہوتا ہے۔ تو بار بار دروازے کی طرف دیکھ کر چاچا کہتی ہے اور تمہاری بایک کی آواز بھی

خوب پہچانتی ہے۔ میں اور بھابی نے حیران ہی ہو جاتے ہیں۔“ پھر تاسف سے کہنے لگی۔

”ویسے مجھے اس بچی پر بہت رحم آتا ہے بے چاری پیدا ہوتے ہی باپ سے محروم ہو گئی۔“

”ایسا مت کہو سونیا۔ میں نڈا کو ایسا کوئی احساس پیدا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اس کا

باپ نہیں۔ لیکن باپ جیسی شفقت دے سکتا ہوں۔“

وہ فوراً کچھ نہیں بولی۔ اُٹھ کر بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔ پھر الماری کھول کر اس کے

صبح کے لیے کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے بظاہر اپنے کام میں مصروف رہ کر بولی۔

”معاف کرنا عمر! تمہاری سوچ بہت محدود ہے یعنی تم صرف یہ سوچتے ہو کہ نڈا اور

بھابی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دو گئے اور نہ احساس محرومی کا شکار وغیرہ وغیرہ۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ جو لیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر

اُسے دیکھنے لگا۔

”میرا مطلب ہے تمہاری بات صحیح ہے لیکن کبھی تم نے بھابی سے بھی پوچھا ہے کہ وہ کیا

چاہتی ہیں۔ اُن سے نہ بھی پوچھو تب بھی تمہیں خود سمجھنا چاہیے۔“

”کیا؟ وہ واقعی نہیں سمجھا۔ تب اُس نے پہلے الماری بند کی پھر اس کے پاس آ کر بیٹھے

ہوئے بولی۔

”دیکھو ناں عمر۔ بھابی کی عمر اتنی زیادہ تو نہیں ہے۔ ذرا سوچو اگر بھابی کی جگہ تمہاری

کوئی بہن ہوتی تو کیا تم اسے ساری زندگی اپنے گھر میں بٹھائے رکھتے۔ نہیں ناں تو پھر

بھابی کے لیے اس انداز سے کیوں نہیں سوچتے۔ میں سمجھتی ہوں اگر اُن کے والدین حیات

ہوتے یا کوئی بہن بھائی ہوتا تو اب تک وہ نئی زندگی کی ابتدا کر چکی ہوتیں۔ کیا میں غلط کہہ

رہی ہوں۔“ اُسے گم سم دیکھ کر آخر میں پوچھا تو وہ بس گہری سانس لے سکا

”یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے عمر۔ نہ مذہب نے اس کی اجازت دی ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو لیکن مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔“

”کیا عجیب لگ رہا ہے؟“

”میرا مطلب ہے بھابی آمادہ نہیں ہوں گی۔“

”کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا لیکن آمادہ کرنا پڑتا ہے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”تم انہیں سمجھانے کی کوشش کرو۔ ابھی نڈا چھوٹی ہے، اس لیے زیادہ مشکل

نہیں ہوگی۔“

”میں۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے بات ہی اس انداز سے کی تھی کہ وہ اس کے

خلوص پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر معذوری ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے یہ کام تم کرو۔“

”نہیں عمر۔ میں بھابی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔“ وہ صاف منع کر گئی۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ مجھ پر شبہ بھی کر سکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے انہیں یہ خیال

آئے کہ میں انہیں اس گھر سے نکالنے کی خاطر ایسا کہہ رہی ہوں۔ حالانکہ وہ ایسی ہی نہیں۔

بہت اچھی ہیں وہ پھر بھی۔“ وہ ہلکے سے کندھے جھٹک کر اُسے دیکھنے لگی اور ابھی وہ کچھ کہنا

ہی چاہتا تھا کہ برآمدے میں نڈا کی آواز سن کر اُدھر متوجہ ہو گیا۔

”یہ نڈا ابھی تک جاگ رہی ہے۔“ خود کلامی کے انداز میں کہتا ہوا فوراً اُٹھ کر کھڑا ہوا

اور اگر کمرے سے نکلنے سے پہلے غیر ارادی طور پر ہی سہی ایک نظر بھی سونیا پر ڈالتا تو ضرور

چونکتا کہ وہ جو ابھی اتنا مخلصانہ مشورہ دے رہی تھی اچانک کیوں بدل رہی ہے۔

”کیا ہوا بھابی۔ نڈا سوئی نہیں۔“ وہ ٹوبیہ کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”پتا نہیں کیوں اتنی بے چین ہو رہی ہے۔“

اُٹھایا۔ البتہ ندا کے رونے پر آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اُس نے کچھ حیران ہو کر سونیا کو دیکھا۔ وہ تکیہ سر کے اوپر رکھے سو رہی تھی۔ تب وہ سمجھ گیا کہ ندا کے رونے کی آواز سے ڈسٹرب ہوتی رہی ہے۔ جب بھی اُسے اُٹھائے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

”میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے اُٹھا دیجیے گا۔“ وہ ٹوبیہ پر خفا ہوا۔

”میں تو جاگ رہی تھی پھر تمہیں کیوں بے آرام کرتی۔“

”عجیب ہیں آپ بھی رات بھر اکیلی پریشان ہوتی رہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ بس اب تم جلدی سے ناشتا کرلو۔ پھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔“

”سونیا کہاں ہے؟“

”سو رہی ہے۔“

”پھر اُسے مت اُٹھاؤ۔ میں ناشتا دیتی ہوں۔“

”نہیں بتالوں گا۔“

وہ جلدی سے کچن میں آگیا۔ سلاکس گرم کیے۔ دو انڈوں کا آلیٹ بنایا اور چائے دم

کر کے ٹوبیہ کے کمرے میں لے آیا۔

”سونیا کو بھی بلاؤ۔“

”ہاں آئیں شروع کریں۔ میں اُسے بلاتا ہوں۔“ وہ میز اس کے سامنے کھینچ کر سونیا کو

بلانے آیا تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر پکار کر بولا۔

”سونیا جلدی سے آجاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اس کا جواب سنے بغیر وہیں سے

پلٹ آیا۔

اصل میں وہ چاہتا تھا جلدی سے ندا کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس لیے سونیا کے

آنے کا انتظار کیے بغیر ناشتا بھی شروع کر دیا۔ جب آخر میں چائے پی رہا تھا تب وہ آئی۔

ایک نظر ٹیبل پر ڈال کر قدرے ناگواری سے بولی۔

”کمال میرا انتظار بھی نہیں کیا۔“

”سو رہی، ہم ذرا جلدی میں ہیں۔ ندا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔“

”اس وقت کون سا ڈاکٹر ملے گا۔ گیارہ بجے سے پہلے تو کوئی کلینک نہیں کھلتا۔ ویسے

اسے تکلیف کیا ہے۔ بے چاری ساری رات روئی رہی ہے۔“

ٹوبیہ کا تھکا تھکا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے اُسے گود میں لیے سٹلے یا بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اس کی۔ کوئی تکلیف وغیرہ تو نہیں۔“

”لایئے مجھے دیجیے۔“

”نہیں، تم خواہ مخواہ اُٹھ کر آگئے۔ جاؤ سو جاؤ جا کر۔ میں دیکھ لوں گی اسے۔“

”میں سو نہیں رہا تھا۔“

اُس نے زبردستی ندا کو اپنی گود میں لیا اور ٹھلاتے ہوئے پہلے کوشش کی کہ وہ سو جائے

اور بچی کچھ دیر کو سو بھی جاتی پھر ایک دم چل کر رونے لگتی۔

”اُس وقت سے یہ ایسے ہی کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کے پیٹ میں تکلیف ہے۔“

”گھر میں کوئی میڈیسن نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”چلیں آپ اسے پکڑیں۔ میں دیکھتا ہوں کوئی میڈیکل اسٹور کھلا ہوا تو۔“

”اس وقت کہاں جاؤ گئے۔ صبح ڈاکٹر کو کھادیں گئے۔“

ٹوبیہ نے روکنا چاہا لیکن وہ چلا گیا۔ گھر کے قریب کوئی اسٹور کھلا ہوا نہیں تھا۔ اُسے

کانی آگے تک جانا پڑا۔ بہر حال جب دوا لے کر آیا تو ٹوبیہ برآمدے میں موجود تھی۔ وہ

ہلکی آواز میں اُسے پکار کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ ندا کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور شاید

ابھی سوئی تھی جب بھی اس نے اشارے سے اُسے بولنے سے منع کیا۔ تب وہ بہت ہلکی آواز

میں بولا۔

”یہ ذرا پس ہیں۔ چند قطرے اس کے منہ میں ڈال دیجیے۔ صبح انشاء اللہ ڈاکٹر کو

دکھادیں گئے۔“ پھر کچھ دیر رک کر ندا کو دیکھتا رہا۔ جب ٹوبیہ نے اُسے اپنے کمرے

میں جانے کو کہا تب دروازے تک آکر خیال آیا تو پلٹ کر بولا۔

”اگر رات میں زیادہ تنگ کرے تو مجھے اُٹھا دیجیے گا۔“ ٹوبیہ نے پونہی اثبات میں سر ہلا

دیا۔ تو وہ شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ سونیا بے خبر سو رہی تھی۔ اپنی جگہ پر لیٹے

ہوئے وہ بس کچھ دیر کو اس کی بے نیازی کو محسوس کر سکا۔ اس کے بعد نیند غالب آگئی۔

رات دیر تک سویا تھا اس لیے صبح معمول کے مطابق آنکھ نہیں کھلی۔ نہ ہی کسی نے

”ہاں۔“ وہ آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
”چلیں بھادج۔“

”میں چلوں؟“ وہ بے خیالی میں سونیا کی طرف دیکھنے لگی۔ تو وہ اپنی سمجھ کے مطابق فوراً بولا۔
”سونیا! کوئی سنبھال سکے گی۔ آپ چلیں اس کے ساتھ ہی اس کی کلائی تھام کر اٹھا دیا۔
پھر ندا تو ٹھیک ہوگئی لیکن وہ رات بھر جاگنے اور تھکن کے باعث بیمار پڑ گئی اور اُسے
کیونکہ ان دنوں اپنے اضافی ذمہ داری ہونے کا احساس ستاتا تھا اس لیے اپنی طبیعت کی
خرابی کا نہیں بتایا۔ اس کا خیال تھا معمولی بخار ہے ڈسپینر سے اُتر جائے گا اور ڈسپینر سے
وقتِ طور پر بخار اُتر بھی جاتا لیکن پھر پہلے سے زیادہ ٹھیر پھر ہو جاتا۔ بدن میں درد الگ۔
کھڑی ہوتی تو ٹانگیں کاپٹنے لگیں اس کے باوجود اس نے توجہ نہیں دی اور روزمرہ کے کام
کا ج بھی اسی طرح کرتی رہی۔

شام کا وقت تھا۔ عمر، سونیا کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلا۔ غالباً دونوں کہیں جانے
کے لیے تیار تھے ندا چاچا کہتی ہوئی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔
”ارے میری جان۔“ اُس نے جھک کر ندا کو گود میں اٹھالیا تو سونیا کہنے لگی۔
”اب جلدی چلو، پہلے ہی اتنی دیر ہوگئی ہے۔“

”ٹھہرو میں بھادج سے کہتا ہوں۔“ اسے اندر لے جائیں۔ اگر اس کے سامنے نکلے
تو یہ بہت روئے گی۔“ اس نے کہا اور وہیں سے ٹوبیہ کو پکارا۔ شاید جلت کے باعث اس کی
آواز خاصی اونچی ہوگئی کہ ٹوبیہ گھبرا کر چکن سے نکلی لیکن کمزوری کی وجہ سے سر بڑے زور سے
چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ رُک کر عمر کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔
دھند کی ایک چادر سی تھی جس کے پار دھند لکے سائے نظر آرہے تھے۔

”اسے پکڑیں بھادج! ہم ذرا جا رہے ہیں۔“

”ہاں لاؤ۔“ ٹوبیہ بازو اس کی طرف پھیلانا چاہتی تھی لیکن بے اختیار اپنے چکراتے
سر کو تھام گئی۔

”کیا ہوا بھادج؟“ وہ ندا کو تخت پر بٹھا کر اس کی طرف لپکا اور کبھی کبھی محبت اور
ہمدردی کا ذرا سا بول انسان کو کس قدر کمزور بنا دیتا ہے۔ وہ بھی ڈھسے گئی۔ لاکھ کہتی رہی کچھ
نہیں ہوا مجھے لیکن آنکھوں سے گرم پانی پڑ سکتا چلا گیا۔

”بھابی! اُس نے جیسے ہی اس کی کلائی تھامی، اُسے لگا جیسے جلتے ہوئے انگارے پر
ہاتھ رکھ دیا ہو۔ بے حد پریشان ہو کر سونیا سے بولا۔

”سونیا! بھابی کو بہت تیز بخار ہے۔ اُنھیں اندر لے جاؤ۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“
جواب میں سونیا وہیں کھڑی رہ کر اطمینان سے بولی۔

”ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے تم جو ہو۔“ وہ ٹوبیہ کو سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اس کی
بات سُن نہیں سکا پھر چیخ کر بولا۔

”دیکھو بھادج گر رہی ہیں۔“

”تمہارے سہارے کے باوجود۔“ اس کے لہجے میں طنز اور تلخی ایک ساتھ تھی۔ پھر
اس کے مقابل آکھڑی ہوئی اور زہر خند سے بولی۔

”بس کرو عمر عباس! میری آنکھوں میں مزید دھول جمو نکلنے سے پہلے صرف اتنا بتا دو
کہ جب تم اپنے سارے جذبے اس عورت کے نام کر چکے تھے تو پھر مجھے کس کھاتے میں بیاہ
کر لائے؟“

”سونیا!“ وہ ششدر رہ گیا اور غیر ارادی طور پر ٹوبیہ کو جھٹکے سے تخت پر گر کر اسے سیدھا
کھڑا ہوا تو وہ کہنے لگی۔

”دھوکے باز ہو تم۔ مجھے بھی دھوکا دیا اور خود کو بھی۔ ک۔“

”کیا ہوا سونیا؟“ ٹوبیہ بمشکل بول پائی۔

”بہت خوب۔ یعنی اتنی سادگی سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا ہوا۔ رات دن عمر کو اپنے
ساتھ مصروف رکھ کر۔“

”شٹ اپ سونیا۔“ وہ پوری قوت سے چیخا۔

”خبردار اس سے آگے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔“

”نہیں۔ میں خاموش نہیں رہ سکتی۔“

”تو نفل جاؤ یہاں سے۔“

”تم یہی کہہ سکتے ہو۔ اس لیے کہ تمہیں میری ضرورت نہیں ہے اور ضرورت تو تمہیں
پہلے بھی نہیں تھی۔“

”میں کہتا ہوں اپنے کمرے میں جاؤ۔“ وہ غصے سے کاپٹنے لگا تھا۔ کبھی ٹوبیہ کو دیکھتا

جس کی حالت غیر ہو رہی تھی اور کبھی اُسے جو ہٹا نہیں کیا سوچے کھڑی تھی۔ جب کہ معصومہ ندا ان دونوں کے اونچا ہونے سے پریشان ہو کر رونے لگی تھی۔
”اور تم کہاں جاؤ گے؟“

وہ اس کی بات نظر انداز کر کے ٹوبیہ سے کہنے لگا۔

”بھائی آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اُس نے روتی ہوئی ندا کو اٹھایا اور جانے لگا کہ سونیا اس کے پیچھے آگئی۔

”میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔ مجھے امی کے گھر چھوڑ دینا۔“

”تم۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ یا اس خیال سے کہ کہیں وہ اس کے بعد ٹوبیہ سے نہ الجھ پڑے۔ ویسے وہ بے حد حیران بھی تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک سونیا کو کیا ہو گیا ہے۔ کل تک تو وہ ٹوبیہ کے ساتھ مخلص تھی بلکہ کچھ دن پہلے اس کے لیے مشغہ بھی دے رہی تھی پھر اب یہ تمام راستے وہ بھی سوچتا رہا اور جیسے ہی اس کی امی کے گھر کے سامنے بائیک روکی، وہ فوراً اتر کر اندر جانے لگی کہ اُس نے پکار لیا۔
”سونیا۔“ اس سے پہلے کہ حریہ کچھ کہتا، وہ بول پڑی۔

”میں تمھاری کوئی بات نہیں منوں گی۔ بس تم اتنا سن لو کہ میں اپنے گھر میں سوکن عورت برداشت نہیں کر سکتی۔“

”سوکن نما۔“ بے آواز ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ ہی اُسے ٹوبیہ کا خیال آیا اور یہ کہ وہ اسے بیمار حالت میں چھوڑ آیا ہے۔ پھر وہ وہاں نہیں رکا۔ واپسی میں قریبی کلینک سے ڈاکٹر کو ساتھ لے کر گھر آ گیا ٹوبیہ نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں تخت پر لیٹی تھی۔ اُس نے ندا کو داکٹر میں بٹھا دیا اور جب تک ڈاکٹر ٹوبیہ کو چیک کرتا رہا وہ جیسے سانس روکے کھڑا تھا۔

”کوئی تشویش کی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا تو وہ پوری توجہ سے سننے لگا۔ ”میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ باقی یہ دو دنیں منگوا لیجیے گا۔ رات میں کسی وقت ہو سکتا ہے۔ بخار کم ہو جائے ورنہ پھر صبح دکھا دیجیے گا۔“

”جی۔“ وہ ڈاکٹر کا بیگ اٹھا کر اُسے چھوڑنے باہر تک آیا پھر اس کا شکریہ ادا کر کے واپس آ کر ٹوبیہ کے پاس بیٹھ گیا اور خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔ اتنے سے وقت میں کتنی بدل گئی تھی وہ۔ اس کے چہرے کی شادابی جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ہونٹوں پر ہر دم مچلتی

مسکراہٹ جس نے اس گھر کی قسمت ہی بدل دی تھی۔ اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اُسے چھو نا چاہتا تھا کہ سونیا کی بات نے ایک بار پھر اس کے اندر آگ لگا دی۔

”جب تم اپنے سارے جذبے اس عورت کے نام کر چکے تھے تو پھر مجھے کھاتے میں بیاہ کر لائے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹھہرنے لگا۔
”میں اپنے گھر میں سوکن نما عورت برداشت نہیں کر سکتی۔“

”سوکن نما عورت۔“ وہ پھر تخت کے پاس رک کر اُسے دیکھنے لگا۔ شاید یہ سوچنا چاہتا تھا کہ اس گھر سے نکل کر ٹوبیہ کہاں جائے گی لیکن ظالم لہجہ اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ ذہن کے ساتھ من بھی سلگنے لگا۔ جب اماں نے کہا تھا ٹوبیہ سے شادی کر لو۔ تب بھی ایسا ہوا تھا اور جب آپا نے کہا تھا تب بھی لیکن پھر وہ فوراً سنجل بھی گیا تھا اور اب سونیا نے اُسے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا بلکہ طعنہ دیا تھا۔ نشتر چھو یا تھا اس کے دل میں۔ جس کی جبین شدید تھی۔ رات بھر وہ خود سے لڑتا رہا اور صبح پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ جانے بغیر کہ اس کی طبیعت کیسی ہے اُسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”مجھ سے شادی کرو گی؟“ وہ ایک دم سے کہہ گیا اور ہٹا نہیں سوچ کر بولا تھا یا بنا سوچے کہ وہ سنائے میں آگئی۔

”جواب دو ٹوبیہ۔ مجھ سے شادی کرو گی۔ ابھی اسی وقت۔“ اُسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا تو وہ ایک دم ہوش میں آگئی اور دوسرے ہی پل اُس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

”جتنا چاہے مار لو لیکن انکار مت کرنا۔“ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی اسی طرح روتے ہوئے بولی۔

”اگر تم جنید کے بھائی نہ ہوتے تو میں تمھارا منہ فوج لیتی۔ خدا کے لیے میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔“

”نہیں میری بات سنو۔ میں تم پر سوکن نما عورت کا الزام برداشت نہیں کر سکتا۔“

”بس کرو۔ مت اس لہجے میں بات کرو مجھ سے، میں تمھاری بھادج ہوں، بڑی بھادج اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس طرح میری تذلیل کرو گے تو میں جنید کے بعد کبھی اس

گھر میں نہ رہتی۔“

”آپ بھول رہی ہیں۔“ اماں بھی یہی چاہتی تھیں اور آپا بھی۔“

”چاہتی ہوں گی، لیکن گرمی نے ایسی کوئی بات کی تو میں ابھی یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ وہ دھمکی دینے کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ سامنے آگیا۔

”سونیا کے پاس۔“

”سونیا یہاں نہیں ہے۔ کل شام ہی سیکے چلی گئی تھی۔“

اُس نے بتایا تو کل شام کا منظر اُس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ اُس وقت وہ ٹھیک سے سن نہیں سکی تھی، لیکن اب ساری باقی اُس کی سمجھ میں آگئی تھی، اور عمر نے سونیا کے اس رویے پر حیران تھا، جب کہ اُسے شدید دھچکا سا لگا تھا۔ بہت خاموشی سے عمر کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے پھر وہ کہنے لگا۔

”مجھے اسی وقت اماں کی بات مان لینی چاہیے تھی، اس میں بہتری تھی، لیکن اب بھی.....“

”پلیز! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ وہ عاجزی سے بولی تھی۔ لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی، جسے محسوس کر کے وہ بے حد آزرده ہوا۔

”آپ روئیں گی تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔“

”میں نہیں روؤں گی، تم جاؤ۔“

”اچھی بات ہے، آپ منہ ہاتھ دھو لیں، میں ناشتا بنا رہا ہوں۔“

وہ کہتا ہوا کمرے سے نکلا اور کچن میں آگیا۔

اُس کا ذہن مسلسل یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ وہ ٹوبیہ کو کس طرح شادی پر آمادہ کرے، جب کہ خود اس کا اپنا یہ حال تھا کہ دل اچانک اس کی طرف مائل ہو کر شدت سے اس کی آرزو کرنے لگا تھا۔ وہ کسی بھی حوالے سے اپنی تو تھی، لیکن اب دل کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔ بہر حال رات بھر خود سے لڑ کر وہ جو ہار چکا تھا۔ تو اپنی ہار پر نادم نہیں تھا۔

جلدی جلدی اُس نے ناشتا تیار کر کے ٹیبل پر رکھا اور اُسے نکالنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ ندا کو لے کر خود ہی آگئی۔ گو اُس کی طرف دیکھا نہ کوئی بات کی، لیکن انداز سے یہی

ظاہر کر رہی تھی کہ اس کی باتوں کو نادانی پر محمول کر کے نظر انداز کر چکی ہے۔ پھر اس سے پہلے ہی ناشتا ختم کر کے اٹھ کر چلی گئی پہلے اُس نے سوچا، اس کے پیچھے جائے، لیکن پھر اپنے کمرے میں آ کر آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔

پھر دو دن یوں گزرے کہ دونوں میں کسی نے بات نہیں کی۔ گو کہ ٹوبیہ کی طبیعت پوری طرح سنبھلی نہیں تھی، پھر بھی وہ بہت خاموشی سے روزمرہ کے کام نمٹانے میں لگی رہتی۔ خصوصاً جب وہ گھر پر ہوتا تو خود کو بہت مصروف ظاہر کرتی اور وہ یہ سب چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ کسی کسی وقت وہ قریب سے گزرتی تو ندا کو مخاطب کر کے کہتا۔

”ندا: اپنی ماسے کہو، اتنا کام نہ کریں، تھک جائیں گی۔“

”ندا: اپنی ماسے کہو ڈاکٹر نے انھیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔“

اور وہ جیسے سستی ہی نہیں تھی نہ کوئی ردِ عمل ظاہر ہوتا۔

تیسرے دن وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ وہ اس کے کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی اور سپاٹ چہرے کے ساتھ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”سُوسونیا کو کب لا رہے ہو؟“

اور وہ اُسی کے انداز میں بولا۔

”کبھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیوں کا جواب دینا ضروری ہے کیا؟“

”نہیں۔“ اُس کے نظریں پُڑانے پر وہ ذرا سا سُسکرایا۔

”اور کوئی بات؟“

”ہاں میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“

”یہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتی۔“

اپنی بات کہہ کر وہ وہیں سے پلٹ گئی۔

اور اُس نے بس ایک ہل سوچا پھر اُس کے پیچھے چلا آیا۔

”آپ کہیں نہیں جائیں گی سمجھیں آپ؟“

”تم بھی سمجھ لو کہ مجھے روکنے کا حق نہ رکھتے ہو نہ اختیار۔“

”ارے۔“ وہ جیسے اپنے آپ پر ہنسا۔

”یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ مجھے آپ پر نہ حق ہے نہ اختیار، لیکن میں کیا کروں، مجھے تو خود پر بھی اختیار نہیں رہا۔“

”تمہاری باتیں مجھے دکھ ہی نہیں، اذیت بھی پہنچا رہی ہیں عمر۔“

”پھر آپ بتائیں، میں کیا کروں؟“ وہ بے بس نظر آنے لگا۔

”سونیا کو لے آؤ۔“

”کیا اس کے آنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟“

”ہاں۔“ وہ جتنی پُر یقین تھی، وہ اتنا ہی غیر یقین۔

☆☆☆

وہ ابھی سونیا کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا، ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ وہ اگر آتا چاہے گی تو خود ہی آئے گی۔ پھر اس نے جو شرط رکھی تھی، وہ اس کے لیے قابل قبول نہیں تھی، لیکن اب ٹوبہ کی بات تھی، جس کا کہنا تھا کہ اگر سونیا نہیں آئی تو وہ بھی یہاں نہیں رہے گی اور وہ دو عورتوں کی متضاد باتوں پر الجھ کر رہ گیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ دونوں میں سے کسی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ سونیا اس کی محبت تھی تو ٹوبہ بھی اب صرف ذمہ داری نہیں رہی تھی۔ اگر اسے کسی ایک کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جاتا تو شاید وہ ساری زندگی فیصلہ نہ کر پاتا۔ بہر حال اب اُس نے یہ سوچا کہ وہ کسی طرح سونیا کو سمجھا کر منا کر لے آئے گا، لیکن سونیا کی وہی بات تھی۔

”جب تک ٹوبہ اس گھر میں ہے میں نہیں جاؤں گی۔“

ایک تو وہ سونیا کی طرف سے مایوس ہو کر آیا، دوسرے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ وہ ٹوبہ کو کیا جواب دے گا، جس نے آج ہر صورت سونیا کو لانے کو کہا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو وہ جیسے منتظر کھڑی تھی اور ابھی سوال اس کے ہونٹوں تک آیا تھا کہ وہ بول پڑا۔

”سوری! آج آفس میں دیر ہو گئی، اس لیے میں سونیا کی طرف نہیں جاسکا۔“

اپنی بات کہہ کر وہ اُس کے سامنے ٹھہر نہیں سکا فوراً اپنے کمرے میں آ گیا۔

اُس کا ذہن بے حد الجھا ہوا تھا۔ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہوا تو حالات کو سوچتے

ہوئے خود کو بہت بے بس محسوس کرنے لگا۔

اُسی وقت ٹوبہ چائے لے کر آ گئی۔ اُس کی طرف دیکھے بغیر کپ ٹیبل پر رکھا اور کچھ کہے بغیر وہ چلی گئی۔

وہ گہری سانس لے کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر رات کے کھانے پر اُس سے سامنا ہوا اور وہ اتنی لائق سی رہی کہ وہ کوشش کے باوجود اُسے مخاطب نہیں کر سکا۔ جب کہ اُس کا دل چاہا رہا تھا، اُس سے ڈھیر ساری باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرے، اُسے بتائے کہ وہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کر رہا، بلکہ نہایت سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ اُسے اپنا کر سونیا کے برابر مقام دینا چاہتا ہے اور یہ کوئی معیوب اور انہونی بات بھی نہیں ہوگی، لیکن پتا نہیں کیوں جب بھی اس کی طرف دیکھا، اس کے حوصلے پست ہونے لگے۔

اپنی بے بسی پر گڑھتا ہوا کھانا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ کسی بھی چیز کا پوچھنے اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ اس لیے نیند کے باوجود سویا نہیں اور اس کا انتظار کرنے لگا۔

وہ غالباً سونے سے پہلے معمول کے کام نمٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ کسی کسی وقت برآمدے میں اس کے قدموں کی چاپ اُبھرتی تو وہ سانس تک روک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا، لیکن پھر قدموں کی دُور ہوتی ہوئی آواز اُسے مایوس کر دیتی۔

”میرے خدا! کوئی تو ایسی بات ہو جو وہ اچانک اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دے۔“ اُس نے سوچتے ہوئے تھکی ہوئی آنکھوں کے در بند کیے تھے کہ نیند نے قفل لگانے میں دیر نہیں کی۔

صبح وہ معمول کے مطابق اُٹھا اور غسل کرنے کے بعد کمرے سے نکلا تو برآمدے میں بیٹھی ندا کو گود میں اُٹھا کر سیدھا کچن میں آ گیا۔

وہ ناشتہ بنانے میں مصروف تھی۔ اُس کی آہٹ محسوس کر کے اُس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”تم چلو، میں ناشتہ لے کر آرہی ہوں۔“

”میں ناشتہ نہیں کروں گا۔“

وہ بلا ارادہ بات کرنے اور بڑھانے کی غرض سے کہہ گیا۔

”کیوں؟“ خلاف توقع اُس کا انداز سرسری تھا۔

”بس دل نہیں چاہا رہا تھا۔“

”چائے پی لو“

”نہیں۔“ اُس کے نوٹس نہ لینے پر وہ چڑ کر بولا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

گوکہ ابھی کافی وقت تھا، پھر بھی وہ محض اس پر اپنی خفگی جتانے کی غرض سے اُسی وقت آفس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

کمرے سے نکلتا تو وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ وہ قصد اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی باینک باہر نکال لایا اور جب اشارت کر رہا تھا تو دروازے سے اُس کی آواز سنائی دی۔ ”خدا حافظ عمر!“ اُس نے یونہی پلٹ کر دیکھا وہ ندا کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”چاچا کو خدا حافظ کہو۔“

”خدا حافظ بیٹا!“ اُس نے ندا سے کہا اور ایک دم سے باینک اشارت کر دی۔

اپنے طور پر وہ اُسے نئی سوچ دے رہا تھا، لیکن خود بھی پریشان ہو گیا۔ سارا دن کسی کام کسی بات میں دل نہیں لگا۔ مسلسل اُس کا خیال کہ وہ لاکھ خود کو لالچ پوز کرے پھر بھی اندر سے پریشان ہوگی اور اس کی پریشانی کا سوچ کر ہی جلدی جھٹی لے کر چلا آیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سونیا کھڑی نظر آئی، تو وہ اپنی حیرت کو کسی طرح نہیں بھجھا سکا۔ ”تم.....؟“

”ارے تم تو حیران ہو رہے ہو ایسے، جیسے میری آمد کی خبر ہی نہ ہو۔“ وہ اُٹھ کر بولی۔

اُسے واقعی خبر نہیں تھی، پھر بھی سنبھل کر بس اسی قدر کہہ سکا۔

”نہیں خیر“ اور متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نہ ٹوبیہ نظر آئی نہ ندا اور وہ یہی سمجھا کہ جس طرح صبح وہ خفا ہو کر نظر انداز کرتا ہوا گیا تھا، اُسی طرح اب وہ بھی کمرے میں بند ہے۔

”چائے پیو گئے؟“ سونیا کے پوچھنے پر وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

جب تک وہ چائے لے کر آئی، وہ ڈریس تبدیل کر کے منڈو ہو چکا تھا۔

اس دوران وہ سونیا کی اچانک آمد کے بارے میں بھی سوچتا رہا، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنے رویے پر ناام ہو کر آئی ہے۔ سب بھلا کر یا پھر اس ارادے سے کہ خود

سونیا سے بات کرے گی اور یہ اُسے گوارا نہیں تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ بار بار چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا کہ شاید کچھ جان سکے۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تب بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

”تم کس کے ساتھ آئی ہو؟“

”بھابی لینے آئی تھیں۔“

”کون، ٹوبیہ؟“ جس طرح اُس نے چونک کر پوچھا اُسی طرح وہ بھی چونک کر دیکھنے لگی تو وہ نظریں پُرا کر بولا۔

”کل میرے ساتھ آنے سے تو تم نے انکار کر دیا تھا۔“

”میں نے انکار نہیں کیا تھا عمر، بلکہ یہ کہا تھا کہ میں ٹوبیہ کی موجودگی میں نہیں آؤں گی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”ہاں۔“ وہ ہاں کی صورت میں گہری سانس لے کر کہنے لگا۔

”کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ جس کی موجودگی میں تم نے آنے سے انکار کر دیا۔ اُسی کے ساتھ آئی ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم، اگر تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا تو صاف کہو، میں واپس چلی جاتی ہوں۔“ وہ بگڑنے لگی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر، اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔

”نہیں سونیا! یقین کرو، میں تمہارے جانے سے بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔“

”مجھے اندازہ ہے اور میں اپنے اور تمہارے پیار کے درمیان کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی۔“

”برداشت تو تمہیں کرنا پڑے گا۔“ اُس کا انداز چھیڑنے والا نہیں بلکہ معنی خیز تھا۔ پھر اُٹھتا ہوا بولا۔

”آؤ اس خاتون کا شکریہ ادا کرو دوں، جو تمہیں لے کر آئیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ٹوبیہ بھابی یہاں سے جا چکی ہیں۔“

”کیا؟“ لہجے میں تاسف و بے چینی کے ساتھ اُس کا انداز ایسا تھا، جیسے ابھی اس

پر جھپٹ پڑے گا اور وہ قدرے سہم کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”مجھے کیا پتا۔ وہ تو کہہ رہی تھیں کہ فتح تمہیں اپنے جانے کے بارے میں بتا چکی ہیں۔“

”تم نے اُسے سزا نہیں۔“ پھر گرنے کے انداز میں دوبارہ بیٹھتے ہوئے بے حد دکھ سے بولا۔

”تم کیوں روکتی اُسے، تم خود بھی چاہتی تھیں، لیکن وہ گئی کہاں وہ کہاں جا سکتی ہے۔“

آخر میں خود کلامی کے انداز میں کہہ کر اپنے عزیزوں کا ایک ایک گھر سوچنے لگا،

جہاں ٹوہیہ جانے کا سوچ سکتی تھی، لیکن ایک گھر بھی ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں اُسے

یقین ہوتا کہ وہ وہاں گئی ہوگی، تب مایوس ہو کر سونیا کی طرف دیکھنا چاہا، لیکن وہ جانے کب

کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ اپنی بے خبری پر خود کو ملامت کرتا ہوا بانیک کی چابی لے کر اس

انداز سے کمرے سے نکلا، جیسے ٹوہیہ ابھی کچھ دیر پہلے نکلی ہو اور وہ راستے ہی میں کہیں اُسے

مل جائے گا، لیکن برآمدے تک آ کر اُس کے قدم آپ ہی آپ رُک گئے۔ پہلے سونیا کی

تلاش میں نظریں دوڑائیں اور کچن سے آتی آواز سے اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر ٹوہیہ کے

کمرے میں چلا آیا اور ایک نظر میں ہی اُس نے دیکھ لیا کہ کمرے میں ہر چیز جوں کی توں موجود

تھی۔ سوائے جنید بھائی کی اس فریم شدہ تصویر کے جس پر کمرے میں داخل ہوتے ہی نظر پڑی

تھی اور اُسے یوں لگا، جیسے وہ اُن ہی کی تلاش میں آیا ہو اور انھیں نہ پا کر بے اختیار پکارا۔

جنید بھائی! ”جواب میں اس کی اپنی آواز کی بازگشت تھی۔ ساتھ ہی وہ منظر نگاہوں

میں آسمایا۔ جب وہ اس کے سینے سے لگے بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

”ٹوہیہ کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔“ اُس کا دل اچانک کسی نے مٹھی

میں جکڑ لیا کہ سانس تک لینے میں دشواری ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔

بہ شکل تمام خود کو بیڈ تک لایا اور گرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی آواز سُن کر ہی

سونیا بھاگی آئی اور اُسے اس طرح روتے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”کیا ہوا عمر؟“

”میں بہت بُرا ہوں سونیا۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”جنید بھائی نے مجھے باپ جیسی شفقت کے ساتھ سہارا دیا تھا اور میں نے اُن ہی کی

بیوی اور بچی کو بے سہارا کر دیا۔ میں نے اپنا وعدہ بھی نبھلا دیا، جو میں نے اماں سے کیا تھا۔“

اچانک احساسِ جُرم سے ہمنار ہو کر اور شدت سے رونے لگا تو وہ بھاگ کر اُس کے

لیے پانی لے آئی اور گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگایا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔

”تم بھی میرے ساتھ اس جُرم میں شریک ہو سونیا! بلکہ سارا کیا دھرا ہی تمہارا ہے۔“

”میرا؟“

”ہاں تمہارا، تم ہی نے میرے اندر کے مرد کو بیدار کیا، جس کے بعد نہ مجھے بھائی یاد رہا

اور نہ ہی اماں سے کیا ہوا وعدہ۔“ قدرے توقف کے بعد آواز پر قابو پا کر بولا۔

”اگر مجھے بھادج سے شادی کرنی ہوتی تو اُس وقت کرتا جب اماں نے میری منتیں کی

تھی یا جب آپ نے اصرار کیا تھا۔ یہاں تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن میں آمادہ نہیں ہوا،

صرف تمہارے لیے اور تم ہی نے مجھ پر الزام رکھ دیا کہ میں سارے جذبے اُس کے نام کر

چکا ہوں۔ تم نے میری آنا کو چھیڑ کر مجھے کسایا۔ سونیا کہ میں سارے لحاظ سارے رشتے بھلا

کہ اُس سے نیارشتہ جوڑنے کی بات کرنے لگا۔ لیکن اُسے رشتوں کا لحاظ تھا۔ جب بھی

تو چپ چاپ چلی گئی۔ کوئی شکوہ بھی نہیں کیا۔ اب بتاؤ میں اُسے کہاں سے ڈھونڈوں۔“ وہ

کچھ دیر تک خاموش رہ کر جانے کیا سوچتی رہی، پھر اُلٹا اُس سے پوچھنے لگی۔

”تم انھیں کیوں ڈھونڈنا چاہتے ہو؟“

”تاکہ اُن سے اپنے رویے کی معافی مانگ کر انھیں یہاں آنے پر آمادہ کر سکوں۔“

”وہ فوراً بولا۔“

”وہ اس گھر کی مالک ہیں، اگر ہمارے ساتھ نہیں بھی رہنا چاہیں گی تو ہم دونوں یہ گھر

چھوڑ دیں گئے۔“

”کیا واقعی تم اپنے رویے پر نادم ہو؟“ وہ بغور اُسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“

”پہلے میری بات کا جواب دو۔“

”ہاں۔“

”تو پھر سُنو بھابی حیدر آباد گئی ہیں۔ اُسی پرانے مکان میں، جہاں وہ اپنی والدہ کے

ساتھ رہتی تھیں، اور مجھ سے یہ وعدہ کر کے گئی تھیں کہ جب تک تم اپنے رویے پر نادم نہ ہو،

میں تمہیں اُن کے بارے میں نہ بتاؤں۔“ وہ کچھ دیر رُک کر سوچ کر بولی۔

”اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ہر سانس اُس شخص کے نام لکھ چکی ہیں۔ جو اُن

کی زندگی کے لیے تک دو دو کرتے ہوئے اُن تک پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں کہیں گم ہو گیا اور انھیں جتنا یقین اس کے نہ آنے کا ہے، اتنا ہی یقین خود اُس کے پاس جانے کا۔“
 ”اور کیا کہا تھا انھوں نے؟“ اُس کی آواز کا بوجھل پن اُنھیں نہ چھپا۔
 ”اور یہ کہ تم اپنی بھانجی سے ملنے آ سکتے ہو، کیونکہ تم اب بھی انھیں چھوٹے بھائیوں کی طرح پیارے ہو۔“

”ہاں۔“ دشتِ ندامت میں گھر اوہ خود کو بہت چھوٹا اور کمتر محسوس کرنے لگا۔
 ”کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟“ اُس کی بچکانہ بات پر وہ ہلکے سے مسکرائی۔
 اور اگلے ہی روز وہ سونیا کے ساتھ اُس کے دروازے پر سر اٹھ کائے کھڑا تھا۔
 ”ارے اندر آؤ ناں۔“ وہ اتنی جلدی انھیں دیکھ کر حیران تھی۔
 ”نہیں بھانج! پہلے ہمیں معاف کریں۔“

”نادان ہوتم دونوں اور میں نادانوں کی باتوں کا بُرا نہیں مانتی۔“ اُس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“
 ”تمھاری مرضی یقین کرو یا نہ کرو۔“ اپنی بات کہہ کر وہ پلٹ گئی، تو وہ ایک ہی جست میں اُس کے سامنے آ گیا۔
 ”آپ تو اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہیں بھانج، میں بھلا آپ کا یقین کیوں نہیں کروں گا، کیوں سونیا؟“

اور سونیا نے اس کی گواہی دینے میں دیر نہیں کی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ندامت کے موتی بھی پلکوں سے ٹوٹ کر اُس عورت کے قدموں میں نچاؤ رہ گئے تھے، جو رشتوں کا مان اور تقدسِ سلامت رہ جانے پر آسودگی سے مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

حنا کی مہک

”سنو خولہ، تم اپنے باپ کے پاس چلی جاؤ۔“ ممی بہت سنجیدگی سے اسے مشورہ دے رہی تھیں۔

”دیکھو، میں یہ تمھارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں تمھارا باپ بڑا آدمی ہے اور اب جبکہ تم ایف۔ ایس۔ سی میں شاندار نمبر لے ہی آئی ہو تو تمھیں میڈیکل میں ضرور جانا چاہیے اور تم جانتی ہو میں تمھاری میڈیکل کی تعلیم ان فورڈ نہیں کر سکتی۔ جب کہ تمھارے باپ کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آخر وہ اپنے دوسرے بچوں کو بھی تو اعلیٰ اسکولوں میں پڑھا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی بیٹا کہ وسائل کی کمی تمھاری راہ میں رکاوٹ بنے۔ تمھاری بہتری کا سوچ کر ہی میں نے تمھیں تمھارے باپ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ ذرا توقف کے بعد پھر کہنے لگیں۔

”اب میں سمجھتی ہوں۔ تم نہ صرف بڑی بلکہ سمجھدار بھی ہو گئی ہو۔ تمھارے اندر یہ خوف نہیں ہونا چاہیے کہ سوتیلی ماں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ اول تو وہ تمھیں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ پھر بھی اگر کوئی بات ہو جائے تو تم مت توڑ جواب دے سکتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کی اولاد سے زیادہ ذہین ہو۔ جیسی میں چاہتی ہوں تم وہاں رہ کر اپنی تعلیم کو بہتر طریقے پر جاری رکھو۔“

”ممی! میں یہاں رہ کر بھی تو پڑھ سکتی ہوں ڈیڑی سے کہہ دوں گی میرا خرچ بڑھا دیں۔“ ممی ذرا دیر کو رکی تھیں کہ وہ بول پڑی۔

”کتنا خرچ بڑھائیں گے وہ۔ سو دو سو یا زیادہ سے زیادہ پانچ سو۔“

”پانچ سو کم تو نہیں ہوتے۔“

”بہت زیادہ بھی نہیں ہوتے۔ میرا خیال ہے اگر تم اپنے باپ کی نظروں کے سامنے رہو گی اور پھر اسے اندازہ ہو گا کہ تم کتنی ذہین ہو تو وہ تمہاری تعلیم پر ہزاروں خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تعلیم کی ہے۔ وہ خود بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ تعلیم اور اس کی ضروریات کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔“

”تو یہ سب یہاں رہ کر بھی تو ہو سکتا ہے۔“

یہاں رہ کر بہتر طریقے پر نہیں ہو سکتا۔ سال میں چھ مہینے تو تمہارا باپ باہر رہتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے یا نہیں رہے گا کہ تمہیں تمہارے خرچ کا علاوہ قاضی رقم بھیجے۔“

وہ کچھ نہیں بولی اور اسے خاموش دیکھ کر می پھر کہنے لگیں۔

”دیکھو بیٹا! میں نہیں چاہتی کہ اس ڈائن کی اولادیں تم سے آگے نکل جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری طرح ذہین نہیں ہوں گی۔ تو کیا یہ تم پر ظلم نہیں ہو گا کہ وسائل کی کمی کا شکار ہو کر ان سے پیچھے رہ جاؤ۔“

”مئی! میرے جانے سے آپ جو اکیلی ہو جائیں گی۔“ اس نے آخری حربہ استعمال کیا۔

”میری فکر مت کرو میری جان، تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر میں ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ اور پھر کون سا تم کوئی بہت دور جاؤ گی۔ اسی شہر میں رہو گی۔ ہر دیک ایڈ پڑا جایا کرتا۔“

”تو پھر میں ڈیڈی سے کیا کہوں؟“ وہ ہار مانتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کل فون پر ان سے بات کر لوں گی۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“

”اور دیکھو۔“ مئی جاتے جاتے رک کر کہنے لگیں۔

”ذرا اپنے اندر ہوشیاری پیدا کرو۔ یوں ڈری سہی رہو گی تو اگلا بہت جلد تم پر حاوی ہو جائے گا۔ کسی کو اپنے آپ پر حاوی ہونے کا موقع مت دو۔ کوشش کرو کہ تم سب پر حاوی رہو۔ آج کل لڑکیوں کو دیکھو۔ زمانے کو اگلیوں پر نچانے کا فن جانتی ہیں۔ ایک تم ہو کہ.....“

”اس کی بیزار شکل دیکھ کر می نے اپنی بات روک لی اور اسے شب بخیر کہتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئیں۔“

☆☆☆

پتا نہیں می نے ڈیڈی سے اس کے بارے میں کیا کہا کہ تیسرے ہی دن وہ اسے لینے کے لیے آگئے۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن می کی خواہش پر اسے جانا پڑا۔ گو کہ اسے ڈیڈی سے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ اسے کبھی بھی ان سے شکایت نہیں رہی تھی۔ وہ انہیں بھی اتنا ہی عزیز رکھتی تھی جتنا کہ می کو۔ بلکہ کبھی تو اسے ڈیڈی کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا۔ وہ ویل ایجو کیڈ اور اصولی انسان تھے۔ اپنی محنت سے انہوں نے جو مقام بنایا تھا۔ وہ قابل رشک تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی۔

”پتا نہیں می نے ڈیڈی جیسے بندے کی قدر کیوں نہ کی۔ حالانہ ڈیڈی تو آئیڈیل شخص ہیں۔“

بچپن سے اب تک سینکڑوں بار اس نے سوچا تھا کہ می سے پوچھے کہ ان کے اور ڈیڈی کے درمیان علیحدگی کیوں ہوئی تھی لیکن ہمیشہ وہ صرف سوچ کر رہ گئی اور می نے بھی کبھی اس کے ساتھ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ضرورت نہ سمجھی ہو یا ہو سکتا ہے کوئی ایسی وجہ ہو جو وہ اسے بتانا نہ چاہتی ہوں۔ بہر حال کچھ بھی تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان علیحدگی کیوں ہوئی تھی۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنے آپ کو می کے ساتھ اس چھوٹے سے فلیٹ میں دیکھ رہی تھی۔ ڈیڈی کبھی بکھارا اس سے ملنے آ جاتے تھے اور کبھی جب وہ ڈیڈی کے ساتھ جانے کے لیے کہتی تو می منع نہیں کرتی تھی بلکہ آرام سے اسے جانے کی اجازت دے دیتی تھیں۔

شروع شروع میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ڈیڈی کو اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے می کی اجازت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے حالات ساری باتیں خود بخود سمجھتی گئی تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے حالات اور بہت سارے لوگوں کی طرح نہیں ہیں اور یہ مختلف حالات ہی تھے جنہوں نے اسے خاصا حساس اور کافی حد تک بزدل بنا دیا تھا۔ وہ بہت کم گو بھی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا، جیسے بہت دنوں

سے اس کے ہونٹوں نے جنبش تک نہیں کی۔ مئی جہاں اس کی اس عادت سے چڑتی تھیں۔ وہاں ڈیڈی اس کی کم سخی کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ خود بہت دھیسے لہجے میں بات کرتے تھے۔ ان کا مخصوص انداز تھا۔

”کیا حال ہے بیٹا؟ کیسے ہو آپ۔ سب ٹھیک ٹھاک کوئی پر اہلم۔“

وہ ہمیشہ ان کے لہجے میں کھوکھو کر اپنی ہر بات بھول جاتی تھی دل چاہتا وہ بولتے رہیں اور وہ سنتی رہے۔ وہ ان کے دوسرے بچوں کی طرح ان سے بہت زیادہ فریک نہیں تھی۔ اس کے اندر ایک جھجک تھی اور یہ جھجک بھی شاید اس کے حالات نے بخشی تھی۔ ڈیڈی اس کی کیفیت سمجھتے تھے اس لیے ہمیشہ اسے اپنے پاس بیٹھا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یوں باتیں کرتے کہ اکثر اس کے دل کی بات بھی وہ خود ہی کہہ جاتے وہ حیران رہ جاتی تھی کہ ڈیڈی اس کی سوچوں کو کیسے پڑھ لیتے ہیں۔

اس وقت بھی وہ ڈیڈی کے ساتھ آتو گئی تھی لیکن اسے یہ کہنا بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ مئی اس کی میڈیکل کی تعلیم فوراً نہیں کر سکتیں۔ اس لیے اسے یہاں بھیج دیا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے مناسب الفاظ نہیں ملے تو اس نے ڈیڈی سے کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن اس وقت وہ خاصی متعجب ہوئی جب ڈیڈی نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد خود ہی اس موضوع کو چھیڑ دیا۔ وہ پوچھ رہے تھے۔

”بیٹا! تمہارا زلزلہ کیسا رہا؟“

”زلزلہ تو بہت اچھا ہے ڈیڈی!“

”ویری گڈ۔ اب آگے کیا ارادہ ہے؟“

”میرے لیے جو راہ آپ متعین کریں گے میں اسی پر چلوں گی۔“

ڈیڈی کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”تمہاری اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔“

”میں آپ کی رائے کو افضل سمجھتی ہوں۔“

”تمہاری مئی کیا کہتی ہیں؟“

”ان کا خیال ہے کہ مجھے میڈیکل میں جانا چاہیے۔“

”کیا اتنے اچھے مارکس ہیں تمہارے۔“

”جی.....!“

”پھر تو تمہاری مئی ٹھیک کہتی ہیں۔“

وہ چپ چاپ ان کی طرف دیکھنے لگی۔ آج پہلی بار وہ ان کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر تلاش کر رہی تھی جو ان کے اندر کسی پچھتاوے یا ملال کا اظہار کرتا ہو لیکن اسے ایسا کوئی تاثر نہیں ملا۔

”پتا نہیں۔ ڈیڈی واقعی مطمئن ہیں یا انہیں اپنا آپ چھپانے میں کمال حاصل ہے۔ اس نے سوچا۔“

”بیٹا.....!“ ڈیڈی کی آواز پردہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ”اب تم آرام کرو۔ میں کل شام پھر تم سے بات کروں گا۔“

وہ سر ہلاتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ آئی۔ گیلری سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھے کہ فرحان سے اسے روک کر پوچھنے لگا۔

خولہ باجی! اب آپ یہیں رہیں گی؟“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے کیونکہ ڈیڈی نے تو اس بارے کچھ نہیں کہا تھا۔

”باجی! آپ یہیں رہ جائیں ناں۔“ وہ پھر خاموش رہی۔

”میں ڈیڈی سے کہوں گا، اب آپ کو نہ جانے دیں۔“ وہ اس کا گال تھکتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے دن وہ شام میں ڈیڈی کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ رات کو نوجانے کس وقت لوٹے۔ اس سے اگلا دن بھی یوں ہی گزر گیا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈیڈی بہت مصروف آدمی ہیں۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ ڈیڈی جلدی کچھ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ داخلے کی تاریخیں نکل جائیں۔ تیسرے دن بھی وہ بہت دیر تک ان کا انتظار کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تھی اور جب وہ سونے کا ارادہ کر رہی تھی تب ڈیڈی خود اس کے کمرے میں آ گئے۔

”بیٹا! آپ سو تو نہیں رہے تھے۔“ وہ آتے ہی اپنے مخصوص لہجے میں پوچھنے لگے۔

”نہیں تو ڈیڈی۔“

”بیٹا! میں آپ کے ایڈمیشن کے سلسلے میں ہی مصروف رہا۔“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”میں نے یونیورسٹیز سے پتا کیا ہے اور اس وقت تمہارا داخلہ یونیورسٹی آف

کہ وہ اپنے گھر سے، اپنے وطن سے بہت دور بالکل اکیلی ہے۔ ابھی وہ اس احساس میں گھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ وہ یہاں کیسے رہ سکے گی کہ وہ لڑکی اس کے پاس بیٹھتی ہوئی کہنے لگی۔

”میرا نام ندا ہے۔ ندا جہانگیر۔“ پھر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”خولہ شیراز۔“

تمہارے ڈیڈی چلے گئے؟“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
”خاصے اسمارٹ آدمی ہیں۔ تم کیوں اتنی ڈل ہو۔“
”نہیں۔ تو۔“

”اچھا! مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ویسے بھی مجھے اتنی جلدی تمہارے بارے میں رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ خاموش رہی۔
”سنو، میرا خیال ہے ہمیں چار سال کا طویل عرصہ ایک ساتھ گزارنا ہے۔ کیوں نہ ہم دوستوں کی طرح فریگ ہو کر رہیں تاکہ دقت اچھا کٹ جائے۔“ اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر ملاؤ ہاتھ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”تم یہاں کب سے ہو۔“
”ابھی تین دن پہلے تو آئی ہوں۔“
”اکیلی.....؟“

”نہیں، مجھے بھی تمہاری طرح میرے ڈیڈی چھوڑ کر گئے ہیں۔“ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ڈیڈی زبردستی تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں یہاں چھوڑ کر گئے ہیں جب کہ میں نے اپنے ڈیڈی کو مجبور کیا تھا کہ مجھے پڑھنے کے لیے یہاں بھیجیں۔“
”تم یہ کیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے میرے ڈیڈی زبردستی چھوڑ گئے ہیں۔ کیا ڈیڈی نے تم سے ایسی کوئی بات کہی ہے؟“

”نہیں، بلکہ تمہاری شکل سے ایسا لگ رہا ہے۔“ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
”یار! اگر اپنی مرضی سے آئی ہوتیں تو اندرونی خوشی کا عکس تمہارے چہرے سے ضرور جھلکتا دکھائی دیتا۔“ وہ ہنس پڑی۔

بوسٹن میں ممکن ہے۔“ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

”میری شروع سے خواہش رہی ہے کہ میں تمہیں اور اپنے دوسرے بچوں کو بھی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم دلاؤں تمہاری طرف سے مجھے تھوڑی پریشانی اس لیے تھی کہ میں سوچتا تھا پتا نہیں تمہاری می تمہیں امریکہ بھیجنے کی اجازت دیں گی یا نہیں۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ اس نے بخوشی اجازت دے دی ہے۔“

اور قدرے مختلف حالات میں پروان چڑھی وہ بزدلی لڑکی بجائے خوش ہونے کے پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

”ڈیڈی! میں وہاں جاؤں گی کیسے؟“

”بیٹا! میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اور تمہارے ایڈمیشن اور رہائش کے انتظام تک وہیں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

”میں دس پندرہ دن میں تمہارے جانے کے تمام انتظامات مکمل کر لوں گا۔ اگر تم چاہو تو یہ عرصہ اپنی می کے ساتھ گزار سکتی ہو۔“

”جی، میں می کے پاس جانا چاہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ صبح میں آفس جاتے ہوئے تمہیں ان کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تم اپنی تیاری مکمل رکھنا۔ میں اگلے پندرہ دنوں میں کسی بھی وقت تمہیں لینے آ سکتا ہوں۔“

اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تو ڈیڈی اس کا گال تھپکتے ہوئے شب بخیر کہہ کر اس کے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

اس کے ایڈمیشن میں بالکل بھی دقت نہیں ہوئی۔ رہائش کے لیے البتہ تھوڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ کیونکہ ہاسٹل نہیں تھا۔ یونیورسٹی سے کافی دور کمپلیکس بنے ہوئے تھے۔ جن میں دور و نزدیک سے آئے اسٹوڈنٹس کی رہائش تھی۔ یہاں ایک پاکستانی لڑکی نے اس کے ساتھ شیئر کر لیا۔

ڈیڈی اپنا ہر طرح سے اطمینان کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ تب اسے احساس ہوا

”اچھا! یہ بتاؤ۔ کون سی یونیورسٹی میں ہو۔“

”خواہش تو تھی ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھنے کی لیکن ایڈمیشن نہیں ہوا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ بوسٹن یونیورسٹی جاتے ہوئے ہارورڈ راستے میں پڑتی ہے۔ روزانہ آتے جاتے اسے دیکھ کر دل بہلا لیا کریں گے۔“

”ہارورڈ میں کیا خاص بات ہے؟“

”ارے تمہیں نہیں پتا۔ اپنی سابق وزیر اعظم وہیں سے پڑھی ہیں۔ اور ہو سکتا ہے وہاں پڑھ کر میرا بھی چانس بن جاتا۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”خاصی دلچسپ لڑکی ہو۔“

”ابھی تو آج پہلا دن ہے۔ آگے آگے دیکھنا۔“ وہ اتر کر بولی۔ ”تمہاری بیزار شکل کو بھی دودن میں ٹھیک کر دوں گی۔“

”میری شکل بعد میں ٹھیک کرنا۔ پہلے اپنے کمرے کو اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر لوں۔“ وہ جیسے ہی اٹھنے لگی ندانے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سنو، تمہیں بکن کے کام میں بھی کوئی تجربہ ہے؟“

”ہاں میں سب کچھ پکالتی ہوں اور بعض ڈشز تو بڑی مزیدار بنالیتی ہوں۔“

”تھنکس گاڈ!“ ندانے طویل سانس لیتی ہوئی بولی۔

”کیوں۔ تمہیں کچھ بھی پکانا نہیں آتا؟“

”مجھے صرف خاص چیزیں آتی ہیں۔ مثلاً چائے، کافی بلیک اینڈ وہائٹ دونوں ختم

کی۔ یہاں تک کہ انڈا بھی فرائی کر لیتی ہوں۔“

”واقعی!“ وہ اپنے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے شرارت سے بولی تو دونوں ہنسی

ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

اسے اپنے کمرے کی ترتیب بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ جس طرح کمرہ

سیٹ کیا گیا تھا اسی طرح مناسب لگ رہا تھا۔ اس نے صرف اپنے کپڑے نکال کر الماری

میں رکھے اور ابھی خالی سوٹ کیس الماری کے نچلے خانے میں رکھ رہی تھی کہ ندانے لے

کر آگئی۔

”میں نے سوچا! پہلے میں تمہیں اپنے ہاتھ کا کمال دکھا دوں۔ وہ آتے ہی کہنے لگی۔“

”ارے! تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ میں خود بنالیتی۔“

”یہ رسی جملے رہنے دو اور اگر فارغ ہو گئی ہو تو چلو بالکونی میں بیٹھ کر چائے پیئیں گے۔“

”چلو۔“ وہ اس کے ہاتھ سے ایک مگ لے کر کمرے سے نکل آئی۔

”تین دن بعد ہماری کلاسز شروع ہو جائیں گی۔“ بالکونی میں ریلنگ کے سہارے

کھڑے ہوتی ہوئی ندانے اطلاع دینے کے انداز میں کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

”کیا تم یہاں کے راستوں سے واقف ہو؟“

”ہاں، پچھلے تین دنوں میں، میں نے بڑی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اتنی جتنی تم

تین مہینے میں بھی معلوم نہیں کر سکتیں۔“

”اچھا!“ وہ ہنس پڑی۔

”تم شاید مذاق سمجھ رہی ہو ٹھہرو، میں تمہیں بتاتی ہوں وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے

باقاعدہ شروع ہو گئی۔

”ہمارے دائیں ہاتھ پر جو کمپلیکس ہے۔ اس میں دو میل اسٹوڈنٹس رہتے ہیں۔ ان

کی سیاہ رنگت سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ دونوں کا تعلق افریقہ سے ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے

یہیں کے سیاہ فام باشندے ہوں۔ بہر حال دونوں کو لڑا رہے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”آگے سنو۔“ اس کے ہنسنے کا ندانے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

بائیں ہاتھ والے کمپلیکس میں ایک ہندو لڑکی ہے اس کا نام پارو ہے۔ فی الحال اکیلی

ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ایک آدھ دن میں کوئی اس کے ساتھ شیئر کرنے کے لیے آجائے۔ اور

ہمارے دروازے کے عین سامنے جو دروازہ ہے، اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کبھی مت

کرنا۔“

”کیوں؟“

”پتھر کی ہو جاؤ گی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”میں سمجھاتی ہوں۔“ وہ تجسس پیدا کرنے کی خاطر کرسی اس کے قریب کھینچتے ہوئے

بولی۔

”سامنے والے کمپلیکس میں وحید مراد رہتا ہے۔“

”اور اگر اس نے تمہاری ہیلو کے جواب میں ایک خوبصورت مسکراہٹ میری طرف پھینک دی تب؟“

”ہائیں.....“ اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر ہی رک گیا، پھر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں جب کہ اس کا امکان زیادہ ہے۔“
”وہ کیسے.....؟“

”تم جو سولونی شاموں کا ساروپ لیے کھڑی ہو تو کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو.....“
”جی نہیں۔“ وہ اپنی تعریف پر تھوڑی نرس ہو کر فوراً بول پڑی۔ نظریں چراتی۔ بار بار پلکوں کو جھپکتی وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ خدا کچھ دیر تک دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔
پھر دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔
”آؤ چلیں۔“

”تم جاؤ۔ میں یہیں رک جاتی ہوں۔“
”کم آن یار! میں کون سا ان کے لیے اتنی سنجیدہ ہوں جو مجھے اس کے چمن جانے کا خوف ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو خولہ۔ شاہراہ حیات پر چلتے ہوئے بہت سی چیزیں اور بہت سے لوگ اچھے نظر آتے ہیں اور اچھے لگتے ہیں۔ لیکن سب اچھی لگنے والی چیزیں اور لوگ ہمارے نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی ہم ان پر حق جتا سکتے ہیں۔ ہاں، ایسا ضرور ہوتا ہے جو ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ہم اپنے ساتھ چلنے والے کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ میں بھی تمہیں صرف ایک اچھا چہرہ دکھانا چاہتی ہوں اور کوئی بات نہیں۔“

وہ چپ چاپ اس کے ساتھ دروازے سے باہر نکل آئی۔ ہر دروازے پر چلتی ٹیوب لائٹ نے پورے ریڈر کو روشن کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ابھی چند ہی قدم چلی تھیں کہ دائیں طرف نے بقول خدا کے کوٹا ر جیسے لڑکے نکل کر ان کے سامنے آ گئے۔

”ہیلو.....!“ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے نے کہا تو جواباً ان دونوں

”کیا.....؟“ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ ”دعید مراد کو تو اس دنیا سے گئے ہوئے.....“

”تم تو ایک دم ہی بے وقوف ہو۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔
”میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل دعید مراد جیسا ہے۔ دیا ہی ہینڈسم اور اسماٹ۔ دیا ہی ہمراہی اسٹائل یہاں تک کہ چال ڈھال بھی ویسی ہے۔ میں پچھلے دنوں سے کی ہول سے اسے آتے جاتے دیکھ رہی ہوں۔“

”کی ہول سے کیوں.....؟“ اس کے معصومیت سے پوچھنے پر ندانہس پڑی۔
”یار! میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تمہارے ڈیڈی تمہیں یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں چاہیے تھا، پہلے تمہیں گلدوبندر کی سیر کراتے۔“
”تم مذاق اڑا رہی ہو۔“ وہ برا ماننے لگی۔

”ارے نہیں۔“ ندانے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ ”خیر چھوڑو یہ بتاؤ کل یونیورسٹی دیکھنے چلو گی ناں۔ اپنی کلاسز اگر پہلے ہی سے دیکھ آئیں تو اچھا ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ سامنے والے کا کیا چکر ہے۔“ وہ ابھی تک اسی میں الجھی ہوئی تھی۔

”ابھی چکر چلا کہاں ہے جو بتاؤں۔“

”یعنی ارادہ ہے؟“ وہ نہس پڑی۔

”دیکھو۔“

”ہے کہاں کا.....؟“

”ہاں نہیں، دیسے دیکھنے میں تو ایشیائی لگتا ہے۔“ پھر اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آؤ تمہیں دکھاؤں۔ اس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

”کی ہول سے؟“ وہ اس کے ساتھ ہی اٹھتی ہوئی شرارت سے بولی۔

”نہیں، دروازے سے باہر نکل کر ٹھلٹے ہوئے ذرا آگے تک جائیں گے۔ اگر اس

سے ہڈ بھڑ ہوگئی ہیلو کہہ دیں گے۔“

”پہلے بھی کبھی کہا ہے؟“

”نہیں، پہلے کیونکر اگلی تھی۔ اس لیے ہمت نہیں پڑی۔“

”فارغ تو نہیں ہوں۔ لیکن اگر تمہیں کوئی کام ہے تو کہو۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”میں بہت بور ہو گئی ہوں۔“

”ابھی سے، وہ سر اٹھا کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

”یار! یہ بھی کوئی زندگی ہے۔“ وہ اس کے بیڈ پر گرتے ہوئے بولی۔ ”صبح پانچ بجے گھر سے نکل جاؤ۔ دو کھنکے کی ڈرائیو کے بعد یونیورسٹی کی شکل نظر آتی ہے۔ اس کے بعد شام چھ بجے تک بندہ اسی یونیورسٹی کی حدود میں چکراتا رہتا ہے واپس آ کر اگر دل چاہے کچھ دیر آرام کر لیں تو ناممکن کیونکہ اگلے دن کی فکر ساتھ آتی ہے۔“ ذرا توقف کے بعد کہنے لگی ”میری ممی منع کر رہی تھیں مجھے کہ اتنی دور مت جاؤ۔ لیکن مجھے ہی شوق تھا، امریکہ آ کر پڑھنے کا۔ بخدا اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ یہاں کی تعلیم اتنی لف ہوگی تو میں کبھی بھی نہ آتی۔“

”ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا۔ واپس جاسکتی ہو۔“ اس کے اتنے اطمینان سے کہنے پر وہ اچھل پڑی۔

”کیا تمہارا مطلب ہے میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں؟“

”تو پھر پڑھنے میں دل لگاؤ۔“

”پڑھنے کے ساتھ تھوڑی تفریح بھی چاہیے ہوتی ہے انسان کو۔ تم بتاؤ سارا دن یونیورسٹی میں رہنے کے بعد کون سا وقت ہمارے پاس تفریح کے لیے بچتا ہے۔“

”تم چاہتی کیا ہو؟“ وہ کتاب بند کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”میں کیا چاہتی ہوں؟“ وہ کہنی کھڑی کر کے ہتھیلی پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

”بھئی، فرصت ہے۔ سنو گی۔؟“

”اگر تم تہیہ کر چکی ہو کہ اس وقت نہ خود پڑھو گی اور نہ ہی مجھے پڑھنے دو گی تو ضرور بتاؤ۔ میں سنوں گی۔“

”سب سے پہلے تو صبح پانچ بجے میرا اٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔“ وہ باقاعدہ شروع ہو گئی۔

”خیر، جلد اٹھنا اتنا تکلیف دہ کام نہیں ہے۔ اس سے سمجھوتا کیا جاسکتا ہے۔

لیکن یونیورسٹی جاتے ہوئے راستے میں انٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے سامنے جو

کو بھی بیلو کہتا پڑا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مزید بات کرنے کے لیے رکیں گے لیکن وہ فوراً ہی آگے بڑھ گئے۔

”چلو، نداء اندر چلتے ہیں۔“ وہ فوراً ہی کہنے لگی۔

”کیوں.....؟“

”اچھا نہیں لگ رہا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم واقعی کسی کے انتظار میں ٹہل رہے ہوں۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے؟“

”غلط یہ ہے کہ اگر تمہارے اس وحید مراد نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ ہم محض اسے دیکھنے کی خاطر یہاں کھڑے ہیں تو۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ندائے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے سامنے اشارہ کیا تھا۔ وہ بلا ارادہ ہی اس کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ نظروں کا زاویہ بدلتی وہ ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لمحہ بھر کو اس کے قدم روک کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے دروازے کا لاک کھول کر اندر چلا گیا۔

”کیسا.....؟“ نداء اس کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

”بکومت۔“ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر اس سے پہلے ہی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

کلاسز شروع ہوتے ہی وہ بہت زیادہ مصروف ہو گئیں وہی پہلے تین دن جو دونوں نے مل بیٹھ کر تفصیلی باتیں کی تھیں اس کے بعد تو دونوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے بھی وقت نہیں رہا۔ وہ تو خیر عادی تھی کیونکہ گھر میں بھی اس کا زیادہ تر وقت پڑھنے ہی میں گزرتا تھا۔ کہیں آنے جانے یا گھومنے پھرنے کا اسے ویسے بھی شوق نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ کتابوں کو اپنا بہترین رفیق جانا تھا لیکن نداء بہت جلد اکتا گئی۔

اس رات وہ ڈاکٹر رامبٹ کا لیکچر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جو انہوں نے آج صبح ہی دیا تھا کہ نداء اس کے کمرے میں جھانک کر کہنے لگی۔

”سنو، فارغ ہو؟“

جھیل نظر آتی ہے روزانہ اس کی طرف سے نظریں چرا کر گزر جانا بڑا تکلیف دہ ہے۔ کسی کسی وقت میرا دل چاہتا ہے وہیں رک جاؤں۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا؟“
”نہیں۔“

”اس پر بعد میں بحث کروں گی کہ تمہارا دل کیوں نہیں چاہتا۔ پہلے اپنی بات کر لوں۔“ اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”کبھی دل چاہتا ہے۔ کسی سینما ہاؤس کا رخ کروں۔ اور کوئی زبردست قسم کی مار دھاڑ والی فلم دیکھوں۔ کبھی نیویارک جانے کو دل چاہتا ہے۔ اور کبھی چاہتی ہوں ہالی وڈ کی سیر کر آؤں اور ہالی وڈ جانے کی خواہش اس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے۔ جب میں ڈاکٹر زواگو کی کلاس میں بیٹھی ہوتی ہوں۔“

”ڈاکٹر زواگو.....!“ وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

”وہی ڈاکٹر ولن۔ بالکل ویسے ہی لگتے ہیں جیسے ڈاکٹر زواگو میں عمر شریف تھا۔“
”میرے خدا!“ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”کوئی تمہیں وحید مراد جیسا لگتا ہے۔ کوئی عمر شریف جیسا۔ میرا خیال ہے، تم فلمیں زیادہ دیکھتی ہو۔“
”اب تو لگتا ہے فلم دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوگی۔“
”کیوں.....؟“

”یہ سوچنا حماقت ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد خوب گھومیں پھریں گے۔ کیونکہ اس کے بعد پھر عملی زندگی شروع ہو جائے گی اور عملی زندگی میں جانے کے بعد ہم مریضوں کو دیکھیں گے۔ فلم نہیں دیکھ سکیں گے۔“
”اچھا! اب تم اپنی مزید بکواس بند کرو تو میں تھوڑی اسٹڈی کر لوں۔“ وہ دوبارہ کتاب کھولتی ہوئی بولی۔

”پہلے ایک وعدہ کرو، پھر پڑھنے دوں گی۔“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اس سنڈے کو کہیں گھومنے چلیں گے۔“

”اور جتنے بھر کے جمع شدہ کام کون کرے گا۔؟“

”اگلے ہفتے کر لیں گے۔“

”نہیں، پھر کام بہت بڑھ جائے گا۔“

”تو صبح ہی صبح اپنے کام نہ ٹالینا۔ ہم نے کون سا درجن بھر بچوں کے کام نہ ٹالنے ہوتے ہیں۔ جو سارا دن لگ جائے گا۔“

”اچھا، کوشش کروں گی۔ اب پلیز، تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ ندا کا اٹھنے کا ارادہ نہ دیکھ کر اسے مجبوراً ہامی بھرنی پڑی۔

”سب سے پہلے اسی جھیل پر چلیں گے۔“

”خدا کے لیے ندا! یہ پروگرام بعد میں سیٹ کرنا۔ اب مجھے پڑھنے دو۔“

اس کے چلا کر کہنے پر ندا اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے بولی۔

”چائے پیو گی.....؟“

”نہیں۔“ وہ فوراً کتاب پر جھک گئی۔ ندا کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر کندھے اچکاتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

چھٹی کے دن ندا صبح ہی صبح اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

”چلو خولہ جو کام کرنا ہے، جلدی جلدی کر لو پھر چلیں گے۔“

”عجیب لڑکی ہو تم۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اب میرے ڈیڈی آئیں گے تو میں

سب سے پہلے ان سے یہ کہوں گی کہ مجھے اس لڑکی سے نجات دلانیں۔“

”مجھے بھی تم جیسی بور لڑکی کے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ ندا اُڑا مانتے ہوئے

چلی گئی تو وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

”میں مذاق کر رہی تھی یا ر! تم بُرا مان گئیں۔“

”اب مجھے منانے میں وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“

”اس کا مطلب ہے تم خفا نہیں ہو۔“

”نہیں..... اور سنو، میں کچن صاف کر رہی ہوں۔ لہذا اس طرف بے بے فکر ہو

جاؤ۔“

”چیزوں کی ترتیب مت بدل دینا۔ مجھے تمہاری رکھی ہوئی چیزیں تلاش کرنے میں

بڑی دقت ہوتی ہے۔“ وہ واپس اپنے کمرے کی طرف جاتی ہوئی کہنے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی

وہ اپنے میلے کپڑے لے کر آگئی۔

”سنو! میں کپڑے دھونے جا رہی ہوں۔ اگر تمہارے بھی ہوں تو دے دو۔“

”تم دھوؤ گی؟“

”میں نے کون سا ہاتھ سے دھونے ہیں۔ جہاں اپنے ڈالوں گی تمہارے بھی ڈال دوں گی۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد ندانے اپنے میلے کپڑے بھی لا کر دے دیے تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔

پچھے بڑا سا کمرہ جس میں چاروں طرف دیواروں کے ساتھ واشنگ مشینیں رکھی تھیں۔ اس وقت بالکل خالی تھا۔ اس نے شکر کیا اور جلدی سے مشین میں کپڑے ڈالنے کے بعد پیسے ڈالے اور بٹن آن کر دیا۔ اب پندرہ منٹ تک اسے یونہی فارغ کھڑے رہنا تھا۔ اور یہ ذرا سی فراغت ملتے ہی اسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ مٹی یاد آنے لگیں۔ وہ سوچنے لگی۔ میرے آنے کے بعد مٹی کتنی تنہا ہوگئی ہوں گی اور ادھر کتنے دنوں سے ان کا خط بھی نہیں آیا۔ میں آج ہی رات۔ انہیں تفصیلی خط لکھوں گی۔

مشین کی بیل بجنے لگی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی اور جلدی جلدی کپڑے نکالنے لگی۔ تمام کپڑے نکالنے کے بعد اس نے سکھانے کے لیے دوسری مشین میں ڈالے اور بٹن آن کرنے کے بعد جیسے ہی پلٹی۔ دروازے میں وہ کھڑا تھا اپنے میلے کپڑے بازو پر لٹکائے۔ وہ فوراً پیچھے موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا تھا اور دھڑکنوں کے ساتھ اس کے قدموں کی آواز بھی ہم آہنگ ہو کر اسے مزید نروس کر گئی تو اس نے یونہی سر جھکائے ہوئے نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا دوسری مشین میں کپڑے ڈال رہا تھا۔ اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ فوراً اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

”ہیلو.....!“

جواب میں اس کے ہونٹ ذرا سا کھلے لیکن آواز اندر ہی کہیں رہ گئی۔

”آپ پاکستان سے آئی ہیں یا بھارت۔ سے؟“ وہ بڑی شستہ انگریزی میں پوچھنے

لگا۔

”پاکستان سے۔“

”میں بھی پاکستان سے آیا ہوں۔“ اس کے لہجے میں ایک دم شکستگی سمٹ آئی تھی۔ شاید اس کے ہم وطن ہونے کے خیال سے۔ ”یہاں یونیورسٹی آف بوشن میں ایم۔ ڈی کے تیسرے سال میں ہوں اور آپ؟“ اپنے بارے میں بتانے کے بعد وہ اس سے پوچھنے لگا۔

”اسی یونیورسٹی میں اسی سال میرا ایڈمیشن ہوا ہے۔“

”اچھا.....!“ وہ مزید خوش ہوا۔ ”کبھی وہاں دیکھا نہیں آپ کو.....؟“

وہ کیا کہتی خاموش رہی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال کرتا، اس نے جلدی سے بٹن آف کیا اور اپنے کپڑے نکال کر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

”آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔“ وہ اسے جانے کے لیے تیار دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”خولہ.....!“

”میں شہروز ہوں۔ شہروز جنجوعہ۔“ وہ چونکہ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک کچھ مانوس سا لگنے لگا تھا۔ ایسا لگا پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اگر دیکھا نہیں تو سنا ہے۔ کہاں؟ اس وقت بالکل بھی یاد نہیں آیا تو وہ اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلی آئی۔

”اتنی دیر لگا دی؟“ ندانے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے، میں وقت سے پہلے آگئی ہوں۔“

”کیسے.....؟“

”ابھی کپڑے پوری طرح سوکھے بھی نہیں اور میں نکال کر لے آئی۔“

”لاؤ، میں جب تک انہیں لیونگ روم میں پھیلا دیتی ہوں۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ ندانے اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتی ہوئی جلدی جلدی پھیلا کر رکھنے لگی۔

”یہاں مت پھیلاؤ ندانے، کوئی آگیا تو بہت بُرا لگے گا۔“

”ارے جب ہم ہوں گے ہی نہیں تو کسی کے آنے کا کیا سوال اور پلیز اب تم یہاں مت کھڑی رہو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ وہ ندانے کا موڈ بگڑتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نہانے بھی حد کر دی تھی۔ ایک ہی دن میں اتنی بہت ساری جگہیں دیکھنے کے چکر میں اسے تھکا ڈالا۔ وہ کیونکہ پھرنے کی شوقین نہیں تھی اور نہ ہی عادی اس لیے شام میں واپس آتے ہی اپنے بیڈ پر آتے ہی جو گری تو دو بارہ اٹھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

”ارے! تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔“ ندا اس کے کمرے میں آئی تو اسے اسی حلیے میں لینے دیکھ کر قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔

”اس وقت بالکل ہمت نہیں ہے۔“

”کیا بہت زیادہ تھک گئی ہو؟“ ذرا رک کر پھر کہنے لگی میں تو بالکل بھی نہیں تھکی۔“

”تم انسان ہوتیں تو تھکتی۔“ ندا ہنس پڑی۔

”ٹھہرو۔ پہلے میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پھر.....“

کال بیل بجنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ شاید ہمارے ہاں کوئی آیا ہے۔ وہ جیسے ہی پلٹنے لگی خولہ اسے پکارتی ہوئی ایک ہی جست میں بیڈ سے کود آئی۔

”ٹھہرو ندا! پہلے لیوٹنگ روم میں سے کپڑے اٹھانے دو۔“ اس کے ساتھ ہی وہ جا کر جلدی جلدی سارے کپڑے سمیٹنے لگی ندا دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھے شرارت سے اسے دیکھتی رہی، پھر جیسے ہی وہ سب کپڑے اٹھائے اپنے کمرے میں گئی۔ ندا نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے پارو کھڑی تھی۔ وہ اسے لیے ہوئے اندر آ گئی۔

”تم لوگ آج کہیں گئے تھے؟“ پارو بیٹھتے ہی پوچھنے لگی۔

”ہاں، آج تفریح کا موڈ تھا سو نکل گئے۔“

”خولہ کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں آؤ۔ وہیں چلتے ہیں۔“

ندا اسے لیے ہوئے اس کے کمرے میں آ گئی اور وہ جو پہلے ہی تھکی ہوئی تھی اور مزید بھاگ بھاگ کر کپڑے سمیٹنے کی وجہ سے ہانپنے لگی تھی اور اس وقت بیڈ پر سیدھی..... لیٹی لے لے سانس لے رہی تھی۔ ندا کے ساتھ پارو کو اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی۔ جس بے ترتیبی کو وہ لیوٹنگ روم سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی ندا وہیں پہنچ گئی تھی۔ دل ہی دل میں ندا کو بے شمار گالیاں دیتے ہوئے اس نے بیڈ پر پھیلے کپڑوں کو کنارے کیا اور بظاہر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتی ہوئی بولی۔

”آؤ پارو! کیسی ہو۔“

”میں دن میں آئی تھی لیکن تم دونوں تھیں نہیں۔“ پارو بیڈ کے کنارے بیٹھتی ہوئی بولی۔

”اصل میں خولہ پچھلے ایک ہفتے سے مجھے تنگ کر رہی تھی کہ کہیں گھومنے چلو۔“

ندا اس سے پہلے ہی بول پڑی۔

”آج بھی میرا جانے کا موڈ نہیں تھا لیکن خولہ کی وجہ سے جانا پڑا۔“

اس کے گھورنے پر ندا ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

”میرے لیے تکلف مت کرو پلیز۔ میں جا رہی ہوں۔“ پارو بھی فوراً لے کر آتی

ہوں۔“

”ارے ابھی تو آئی ہو۔ بیٹھو ناں۔“

”پھر کسی وقت آؤں گی۔ اس وقت ویسے بھی تم دونوں تھکی ہوئی ہو۔ اچھا خولہ تم آرام

کرو۔“ وہ ندا کے ساتھ ہی اس کے کمرے سے نکل گئی تو وہ طویل سانس لیتی ہوئی پھر لیٹ

گئی۔ ”کچھ دیر بعد ہی ندا چائے لے کر آئی تو اس نے پینے سے صاف انکار کر دیا۔

”دیکھو، میں صرف تمہارے لیے بنا لا کرئی ہوں۔ میرا تو ویسے بھی موڈ نہیں تھا۔“

”مجھے پتا ہے، تم ہر کام میری خاطر کرتی ہو۔“ اس کے جملے سننے لے پھر ندا کھلکھلا کر

ہنس پڑی۔

”چلو، غصہ بعد میں کرنا۔ پہلے چائے پی لو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ ٹھنڈی چائے

وہ ویسے بھی نہیں پیتی تھی اس لیے مجبوراً اٹھ بیٹھی۔

”ندا.....!“ کچھ دیر خاموشی سے چائے پینے کے بعد وہ کہنے لگی۔ ”صبح جب میں

کپڑے دھونے بیچنے لگی تھی نا۔ وہاں وہ بھی آیا تھا۔“

”کون.....؟“

”وہ جو سامنے رہتا ہے۔ اس کا نام شہروز ہے۔“

”میں تم تعارف بھی حاصل کر آئیں اور اتنی اہم بات تم نے صبح ہی کیوں نہ بتائی۔“

”صبح تم اتنی جلدی جلدی کر رہی تھیں کہ مجھے یاد نہیں رہا۔“

”اور سارا دن.....؟“

”کہنا۔ یاد نہیں رہا اور جہاں تک تعارف کا سوال ہے تو اس نے خود ہی اپنا نام بتایا تھا۔“

”یونہی تو نہیں بتایا ہوگا۔ پہلے تمہارا بھی پوچھا ہوگا۔“ جواب میں اس نے شہروز سے مختصر ملاقات کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔

”سنو۔“ ساری بات سننے کے بعد ندا کہنے لگی۔ ”وہ اتفاقاً وہاں آیا تھا یا؟“

”ندا کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”صرف اتنا کہ اسے محض اس لیے ریجنیکٹ مت کرو ورنہ کہ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ مجھے بہت سارے لوگ اچھے لگتے ہیں۔“

وہ چپ چاپ ندا کی طرف دیکھنے لگی جو اپنی بات کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تو ضرور تھی جو اسے پشیمان کر گئی کہ اس نے کیوں ندا کے سامنے اس کا ذکر کیا۔

”اچھا خولہ! تم ابھی اسٹڈی کرو گی یا سونے کا ارادہ ہے۔“

”اس وقت سوؤں گی۔“

”اوکے، گڈ نائٹ۔“ وہ خالی مگ لے کر اس کے کمرے سے نکل گئی۔

صبح ندا اپنے پہلے والے موڈ میں تھی، بالکل فریش سی وہ بغور اس کی طرف دیکھتی رہی۔ لیکن اس کے چہرے پر رات والی بات کا کوئی تاثر نہیں ملا اور وہ جورات بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتی رہی تھی اب خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔

دوسری بار شہروز سے ان دونوں کی ملاقات یونیورسٹی کے کینے ٹیریا میں ہوئی تھی۔ لچ ٹائم میں وہ دونوں کارز والی ٹیبل پر بیٹھی برگر کھانے میں مصروف تھیں۔ جب وہ ان کے پاس آکر کہنے لگا۔

”کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟“ اس کے انداز میں بے تکلفی نہیں تھی۔ لیکن اپنائیت کا کوئی ایسا پہلو تھا کہ دونوں نے لمحہ بھر کو ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سر ہلا کر اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

”شکریہ۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”آج میں خاص طور سے آپ کو ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں۔“ وہ سمجھ نہیں سکی کہ وہ ”خاص طور“ کا لفظ صرف اس کے لیے استعمال کر رہا ہے یا

دونوں کے لیے۔

”اس کینے میں، میں کم ہی آتا ہوں کیونکہ میری زیادہ تر کلاسز بلاک ایف میں ہوتی ہیں۔ اس لیے میں اسی طرف چلا جاتا ہوں۔“

”آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟“ ندا کے پوچھنے پر وہ فوراً بولا۔

”ٹھہریے، میں اپنے لیے لے کر آتا ہوں۔“ پھر جاتے جاتے پوچھنے لگا۔

”آپ دونوں کچھ اور لیں گی۔“

”نہیں شکریہ۔“ وہ چلا گیا اور جب واپس آیا تو ان دونوں کے لیے جوس بھی لیتا آیا۔

”میرا خیال ہے، ہم نے آپ کو کچھ لانے سے منع کیا تھا۔“ ندا اس کے ہاتھ میں جوس

کے پیکٹ دیکھ کر کہنے لگی۔

”چلیے، اب تو لے آیا ہوں۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے پیکٹ ان دونوں کے سامنے رکھ دیے۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کو خاص طور پر خولہ کو ڈھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“ ندا نے بظاہر عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔ لیکن خولہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس پر کچھ جتنا چاہتی ہو۔

”اس روز خولہ سے بہت مختصر ملاقات ہوئی تھی اور آپ تو جانتی ہیں پریس میں اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر یا ان سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اسی حوالے سے میں دوبارہ بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن آپ دونوں نظر ہی نہیں آئیں۔“

”شاید آپ نہیں جانتے۔ ہم آپ کے سامنے ہی تو رہتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”اور کئی بار سوچا کہ آپ کی طرف آؤں۔“

”پھر آئے کیوں نہیں؟“

”کیا مجھے آنا چاہیے تھا؟“ الٹا ندا سے پوچھتے ہوئے اس کی نظریں خولہ پر جا ٹھہری تھیں جیسے وہ اپنی بات کا جواب اس سے چاہتا ہو۔

”خولہ سے پوچھیے کہ آپ کو آنا چاہیے تھا یا نہیں؟“ ندا نے ساری بات اس پر ڈال دی اور وہ اپنے آپ میں بڑا عجیب محسوس کرنے لگی۔

”میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ وہ اس کی سوالیہ نظروں سے گھبرا کر اٹھ

”بالکل۔“

”اچھا! آپ ان دونوں کا موازنہ کریں۔ ہم جارہے ہیں۔“ وہ اسے وہیں چھوڑ کر
کیفے سے نکل آئیں۔

☆☆☆

شام میں یونیورسٹی سے واپسی پر وہ جان بوجھ کر کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔

”خولہ! شہروز کے ہاں نہیں چلو گی؟“ ندا اسے پکارتی ہوئی وہیں آ گئی۔

”جب اس سے کہا ہے تو جانا ہی پڑے گا۔“

”تو پھر چلو ناں۔“

”چلو۔“ اس سے چولہا بند کر دیا۔ پھر اس کے ساتھ کچن سے نکلتی ہوئی کہنے لگی۔ ”سنو

ندا! اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت مت دینا۔“

”کیوں؟“ وہ جواب دینے کے بجائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جلدی سے بالوں

میں برش کیا اور پھر واپس آتے ہوئے کہنے لگی۔

”چلو۔“

”ڈریس چینیج نہیں کرو گی؟“ ندا اس کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔

”نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ ندا نے کندھے اُچکائے اور اس کے ساتھ باہر نکل

آئی۔

وہ انہیں دیکھ کر بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ یوں جیسے بہت دنوں کے بعد

ملاقات ہوئی ہو۔

انہیں لیونگ روم میں بٹھانے کے بعد وہ فوراً ہی چائے بنانے چلا گیا۔ جب واپس آیا

تو ندا اس سے کہنے لگی۔

”آپ کس چکر میں پڑ گئے؟ ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔“

”اور میں آپ کو جلدی نہیں جانے دوں گا۔“ وہ چھوٹی سی ٹرے ان کے سامنے رکھتا

ہو اخاص طور سے اس سے کہنے لگا۔

”خولہ! آپ چائے بنا ئیں۔“ وہ چپ چاپ پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی۔

”آپ کا تو صرف ایک سال ہی اور رہ گیا ہے ناں۔“ ندا اس سے پوچھنے لگی۔

کھڑی ہوئی۔

”تو پھر کب آرہے ہیں آپ؟“ ندا نے اٹھنے سے پہلے اس سے پوچھا۔

”میں نہیں، آج شام آپ دونوں میرے ہاں آئیں۔“

”اپنے بارے میں تو میں کہہ سکتی ہوں کہ ضرور آؤں گی لیکن خولہ کے بارے میں نہیں

کہہ سکتی۔“

”کیوں.....؟“

”اس لیے کہ یہ کہیں بھی جانے کے لیے مشکل سے تیار ہوتی ہے۔ ہاں اگر آپ اسے

خاص طور سے انوائٹ کریں تو شاید۔“

”ندا.....!“ خولہ کے ٹوکے پر وہ خاموش ہو گئی۔

”آپ آرہی ہیں ناں؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھنے

لگا۔

”ندا آئے گی تو اس کے ساتھ آؤں گی۔“

”میرا خیال ہے آپ دونوں ایک دوسرے پر بات رکھ کر مجھ ٹالنے کی کوشش کر رہی

ہیں۔ یقین کیجیے میں نے تو بہت خلوص سے۔“

”ہمیں آپ کے خلوص پر شبہ نہیں ہے۔“ ندا اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔ ”اور ول

چھوٹا مت کیجیے ہم ضرور آئیں گے۔“

”شکریہ۔“

”اب اجازت دیجیے۔ کیونکہ ڈاکٹر ذوالگو کی کلاس شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ

ہیں۔“

”ڈاکٹر ذوالگو!“ وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا سوچنے لگا کہ وہ کس کا ٹیکچر کا ذکر کر رہی ہے۔

”معاف کیجیے گا۔ ندا کا اشارہ ڈاکٹر ولن کی طرف ہے۔“ اسے سوچتے دیکھ کر خولہ

جلدی سے بول اٹھی۔

”ارے.....!“ وہ ہنس پڑا۔ ”آپ نے تو میری مشکل حل کر دی۔ میں پچھلے کئی دنوں

سے یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا ہوں کہ آخر ڈاکٹر ولن کس سے مشابہت رکھتے ہیں۔“

”ہیں نا ڈاکٹر ذوالگو جیسے.....؟“

”ہاں.....!“

اس کے بعد کیا ارادہ ہے۔ یہیں رہیں گے یا واپس جائیں گے؟“
 ”واپس تو بہر حال جاؤں گا۔ ایک سال بعد نہ سہی دو یا تین سال کے بعد کیونکر میرا مستقل یہاں رہنے کا ارادہ نہیں ہے۔“

”گرین کارڈ نہیں لیں گے؟“ ندا کے شرارت سے پوچھنے پر وہ بھی ہنس پڑا۔
 ”گرین کارڈ کی سعی وہ کرتا ہے جسے اپنی مٹی سے زیادہ یہاں کشش نظر آتی ہے اور میرے نزدیک اپنے وطن کی مٹی زیادہ معتبر ہے۔ میں اگر مزید یہاں رکا بھی تو اسپیشلائزیشن کے لیے رکوں گا ورنہ نہیں۔“

”ندا چلیں!“ وہ پہلی بار بولی بھی تو جانے کی بات کرنے لگی۔

”بیٹھیں ناں۔ آپ کو کون سا بہت دور جانا ہے۔“

”دور تو نہیں جانا لیکن اسٹڈی کرنی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے آپ نے تو فوراً ہی اپنی بات پر عمل بھی کر ڈالا۔“

”یہ اب نہیں رکے گی۔ اس لیے اب اجازت دیجیے۔“ ندا بھی کھڑی ہو گئی۔

”کمال ہے، ابھی تو آئی تھیں۔“

”پھر کبھی جب فارغ ہوں گے تو آجائیں گے اور شہرِ دُعا آپ بھی آئیں ناں۔“ ندا کو

اخلاقاً کہنا پڑا۔

”ضرور آؤں گا۔“ وہ انہیں چھوڑنے باہر نکل آیا۔

”سنو، اس کے سامنے تم گونگی کیوں بن جاتی ہو.....؟“ اپنے دروازے سے اندر

آتے ہی اس سے کہنے لگی۔

”کیا مطلب؟“

”وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے اور تم۔“

”صرف مجھ سے تو بات نہیں کرنا چاہتا اور پھر تم جواتنا بولتی ہو۔“

”میرے بولنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تمہیں سننا چاہتا ہے۔“

”تم سے کس نے کہا.....؟“

”اس کا ہر انداز بتاتا ہے۔“

”ندا!“ وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”ایسی باتیں مت کرو۔“

”کیا تم میری باتوں سے انکار کر سکتی ہو؟“

”ہاں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پچھلے ایک گھنٹے سے کتاب اس کے سامنے کھلی رکھی تھی اور وہ ایک لفظ نہیں پڑھ پائی تھی۔ ندا کو تو اس نے جھٹلایا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو جھٹلانا بڑا مشکل تھا۔

”میں شہرِ دُعا کے سامنے اپنے آپ کو بے بس کیوں محسوس کرتی ہوں۔“ اس نے

دسویں بار سوچا! کیا واقعی وہ صرف مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ آخر کیوں؟“

وہ سوچتے سوچتے الجھنے لگی تھی۔ تب اس نے کتابیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں اور لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔

☆☆☆

سمسٹر ختم ہوتے ہی انہیں فراغت نصیب ہوئی تھی اور ان دنوں کے لیے انہوں نے بہت سے پروگرام بنا رکھے تھے۔ لیکن دوسرے ہی دن ندا کے بڑے بھائی واشنگٹن سے آ گئے۔ وہ ان کے ساتھ چلی گئیں۔ اس نے تو اس سے بھی چلنے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے سہولت سے منع کر دیا۔

ندا کے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔ پہلے دن اس اطمینان سے بیٹھ کر مٹی کو تفصیلی خط لکھا۔ انہیں اپنی پڑھائی کے بارے میں لکھنے کے ساتھ اپنی طرف سے ہر طرح کا اطمینان دلایا۔

اگلے دو دن اس نے اپنے کچھ ادھورے کام نمٹانے میں صرف کیے۔ اس کے بعد وہ بالکل فارغ ہو گئی..... فراغت اور تنہائی دونوں نے مل کر اسے بور کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

موسم بھی بدلنے لگا تھا۔ صبح کے وقت خنکی بڑھ جاتی تھی۔ اور اس کے پاس گرم کپڑے بھی نہیں تھے۔ اس نے ندا کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ اب وہ چلی گئی تھی اور اکیلے بازار جانے میں اس کی بزدلی آڑے آتی تھی۔ گو کہ سوچا اس نے بہت بار تھا کہ وہ جا کر اپنی کچھ ضروری چیزیں لے آئے گی لیکن ہمت نہیں پڑی۔

”میرا خیال ہے چار پانچ روز میں آجائے گی۔“

”یعنی یونیورسٹی کھلنے سے ایک روز پہلے۔“

”ہاں.....!“ وہ کچھ دیر خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ پھر کہنے لگا آج موسم خاصا

خوشگوار ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولی۔

”چلو، کہیں باہر چلتے ہیں۔“ وہ ایک دم بے تکلفی پر اتر آیا۔

”میں۔“ وہ گھبرا کر اپنی طرف اشارہ کرنے لگی۔

”میرا خیال ہے، یہاں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔“

”لیکن میں کیسے جاسکتی ہوں.....؟“

”کیوں؟“ ذرا توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”اپنے آپ کو نڈا کا محتاج نہ بناؤ خولہ۔ اس

کے بغیر بھی چلنا سیکھو۔“

”آپ غلط سمجھے۔“

”میں بالکل بھی غلط نہیں سمجھا۔“ ہاں۔ اگر میرے ساتھ جانے پر اعتراض ہے تو

صاف کہو۔“ وہ خفا ہوتا اچھا لگ رہا تھا۔

”نہیں۔“ اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکل گیا۔

”کیا نہیں۔“

”آپ کے ساتھ جانے پر تو اعتراض نہیں۔“ وہ کھل اٹھا۔

”تو پھر ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر چلو۔“

”ابھی آئی۔“ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کپڑوں پر نظر ڈالی۔ ٹھیک ہی تھے۔ جلدی

سے بالوں میں برش کیا اور پھر پرس بغل میں دباتی ہوئی واپس آگئی۔

”گڈ۔“ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ باہر آتی ہوئی کہنے لگی۔

”شاپنگ سینٹر قریب ہے، واپسی میں کر لیتا۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”پلیز خولہ! اب آپ جناب سے نکل آؤ۔ مجھے تھوڑی بے تکلفی اچھی لگتی ہے۔“

”مجھے بے تکلف ہونے میں کافی وقت لگتا ہے۔“

اس وقت وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی تھی۔ موسم

کچھ ابر آلود سا ہو رہا تھا۔ شفاف سڑک پر دور تک نظریں دوڑاتی ہوئی اپنے گھر کو یاد کرنے

لگی۔ اسے یاد آیا۔ وہ ایسے موسم میں ہمیشہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھی اور می کتنا ڈانٹتی

تھیں اسے کہ وہ کیوں اور لڑکیوں کی طرح انجوائے نہیں کرتی۔ وہ چپ چاپ می کی ڈانٹ

سنتی۔ اس کے بعد سڑک پر چارواڑھ کر لیٹ جاتی تھی۔

”مجھے بیگاموسم کبھی بھی اچھا نہیں لگتا می؟“ وہ یوں بولی جیسے می اُس کے سامنے کھڑی

ہوں۔“ ایک نامعلوم سی اداسی پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔“ وہ می کو

مخاطب کر کے اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کال بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ اس

نے جلدی سے آکر دروازہ کھولا۔ سامنے شہر وز کھڑا تھا۔

”آ.....پ؟“ اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے۔

”اندر آئے کو نہیں کہیں گی؟“ اس نے چپ چاپ ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے

کا راستہ دیا۔

”اس دن کے بعد پھر آپ آئی نہیں۔ میں انتظار کرتا رہا۔“

”اصل میں ندا واشٹنٹن گئی ہوئی ہے۔“

”اور آپ ندا کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتیں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”آپ چائے پیئیں گے؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کرتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”اگر آپ مجھ سے فرار حاصل کرنا چاہ رہی ہیں تو چائے بنانے کے بہانے ضرور

یہاں سے جائیں ورنہ۔“ میرے خدا کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔ جو اسے نروس کیے دے رہی

تھیں۔

”خولہ! بیٹھ جائیں پلیز۔“ وہ اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اور وہ اس کی

بات پر عمل کرنے کے بجائے کچن میں چلی گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

چائے بنانے کے دوران وہ مسلسل اپنے آپ پر قاپو پانے کی کوشش کرتی رہی اور جب وہ

دوبارہ اس کے سامنے آئی اس وقت وہ کافی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔

”نداکب واپس آئیں گی؟“ وہ اس کے ہاتھ سے چائے کا گم لیتے ہوئے پوچھنے

لگا۔

”کیوں.....؟“

”پتا نہیں۔“

”سنو، کہیں تمہیں میری بے تکلفی ناگوار تو نہیں گزری۔“

”نہیں۔“

اس نے قریب سے گزرتی ٹیکسی روکی اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ پھر اس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔

بہت سارا وقت ان دونوں نے دریا کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے گزارا اور جب دوپہر ڈھلنے لگی تب وہ اسے شاپنگ سینٹر لے آیا۔ بہت جلد وہ شاپنگ سے وہ فارغ ہو گئی اور جیسے اس کے ساتھ باہرنگی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہی ہو اب کیا کریں؟ وہ کندھے اچکا تا ہوا کہنے لگا۔

”مثاید قدرت کا ہمارا ساتھ منظور ہے۔“ اسے خاموش دیکھ کر وہ پھر کہنے لگا۔

”تم مجھ سے فرار کی خاطر جلدی سے گھر جانا چاہتی تھیں ناں۔“

”کیا تم سے فرار ممکن ہے؟“ اس نے سوچا۔

”آؤ اوپر کینے میں چلتے ہیں۔“ وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر چل پڑا تو اسے بھی

مجبوراً اس کے پیچھے جانا پڑا۔

کینے کا ماحول ویسا ہی تھا۔ جیسا اس نے فلموں میں دیکھا تھا۔ وہ کافی پیٹے ہوئے مسلسل کاؤنٹر پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھتی رہی جو اس کے ساتھ ہی پڑھتی تھی اور جس کا محبوب شغلہ مشرق اور مشرق میں رہنے والوں کا مذاق اڑانا تھا۔ ندا اس سے بہت چڑتی تھی اور کثرا اپنی زبان میں اس کے منہ پر اسے گالیاں بھی دیتی تھی۔ وہ اکثر ایسے موقع پر ندا کا ہاتھ

باکرا سے روکتی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ اسے مسلسل ادھر متوجہ دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں، اب چلو۔“

”لیکن بارش توڑکی نہیں۔“ وہ شیشوں سے باہر دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

”جس رفتار سے برس رہی ہے اس سے لگتا ہے، اگلے دو دن تک نہیں رکے گی۔ تو پھر

یوں نہ ابھی نکل چلیں۔“

”چلو۔“ اس نے کاؤنٹر پر آکر بل ادا کیا اور اس کے ساتھ نیچے آ گیا۔

جب ندا واپس آئی تو اس کے بدلے انداز دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے رخساروں پر اترتی شفق کی لالی کے ساتھ ہونٹوں کی مسکراتی کلیاں بہت سی ان کہی داستانیں سنارہی تھیں۔

”سنو، میری غیر موجودگی میں کوئی خاص بات ہو گئی ہے کیا؟“ اس وقت جب وہ بالکونی میں کھڑی ہلکے ہلکے کنگٹا رہی تھی کہ ندا انتہائی رازداری سے پوچھنے لگی۔

”ک..... کون سی بات.....؟“ وہ سچ گچ گھبرا گئی۔

”وہی جس نے تمہیں کنگٹا نے کا حوصلہ بخشا ہے۔“

”اگر تمہیں میرا کنگٹا نا اچھا نہیں لگ رہا تو خاموش ہو جاتی ہوں۔“

”نہیں بھی! میں تمہیں کنگٹا نے سے منع نہیں کر رہی لیکن اگر مجھے اپنے راز میں

شریک کر لو تو.....“

”پتا نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بول پڑی۔

”بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے۔ ورنہ تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہی

ہوں۔“ ندا کے لہجے میں خفگی محسوس کر کے اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”بات صرف اتنی سی ہے کہ ندا! کہ تمہاری غیر موجودگی میں شہر دزیہاں آتا رہا ہے۔“

”اور.....“

”اور میں ایک دو بار اس کے ساتھ باہر بھی گئی ہوں۔“

”اور.....“

”اور کیا سننا چاہتی ہو؟“

”اور وہ بات جو تمہارے چہرے پر لکھی ہے اور جسے تم بتانے سے گریز کر رہی ہو۔“

”جب جان ہی گئی ہو تو اصرار کیوں کر رہی ہو۔“ ندا ہنس پڑی۔

”تم خاصی بزدل ہو خولہ!۔ جب اس راستے پر قدم رکھ ہی چکی ہو تو ڈرتی کیوں

ہو.....؟“ وہ چپ رہی۔

”میں تو اسی دن جان گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے جس دن شہر دز خاص طور پر تمہیں

ڈھونڈتا ہوا کینے ٹیرا آپہنچا تھا۔“

”ندا! وہ تمہیں اچھا لگتا ہے؟“ وہ اس سے نظریں پڑاتی ہوئی بولی۔

”کم آن یار! میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے اور بھی بہت سارے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ پلیز تم میری طرف سے کوئی بات دل میں مت لاؤ۔“ وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

کلاس شروع ہوتے ہی ان کی پہلے جیسی مصروفیت شروع ہو گئی، وہی صبح سے شام تک یونیورسٹی میں رہنا اس کے بعد واپس پرانے دن کی فکر ساتھ لانا۔ اب تو وہ بھی فراغت کے لمحوں کو ترسنے لگی تھی، لیکن ایسا کوئی لمحہ چھٹی والے دن بھی میسر نہیں آتا تھا کہ سارا دن ہفتے بھر کے جمع شدہ کام کرنے میں گزر جاتا تھا۔

اس ویک اینڈ پر ڈاکٹر ولسن نے اپنے اسٹوڈنٹس کو اپنے گھر پر انوائٹ کیا تھا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ اور ندا جلدی جلدی تیاری ہونے میں لگ گئیں۔ اس نے لائٹ پنک کلر کے پلین سوٹ پر سیاہ جرسی پہنی اور لمبے بالوں کو پشت پر کھلا چھوڑ دیا۔

”ندا! جلدی کرو، یہ امریکن وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔“

”پابندی وقت نے ہی تو انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔“ ندا نے برش ہاتھوں سے رکھ دیا اور اُس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ شہر واپس اپنے دروازے سے نکل رہا تھا۔ اُن دونوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”ڈاکٹر ولسن نے انوائٹ کیا ہے، وہیں جا رہے ہیں۔“

”ارے میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ چلو ساتھ چلتے ہیں۔“

”مجھے تو اعتراض نہیں ہے، لیکن خولہ سے پوچھ لو۔“ ندا اثرات سے اُس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں کیوں اعتراض کروں گی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”ہاں، یہ کیوں اعتراض کرے گی بھلا چلو۔“ تینوں ایک ساتھ چل پڑے۔

وہ ٹھیک وقت پر پہنچے تھے، ڈاکٹر ولسن خود استقبال کو موجود تھے۔ شہر واپس چھوڑ کر اپنے کلاس فیلوز کی طرف چلا گیا تو وہ دونوں ہال کے نسبتاً تنہا گوشے میں آکھڑی ہوئیں۔ یہاں کسی تقریب میں شرکت کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ ساتھ ندا بھی تھوڑی نروس لگ رہی تھی۔ انہیں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ جانے کون تھا جو اُن کے

قریب آ کر کہنے لگا۔

”ہیلو!“ جواباً انہوں نے بھی ہیلو کہا۔

”آر۔ یو پاکستانی۔“ (کیا آپ پاکستانی ہیں) وہ اُن دونوں سے پوچھنے لگا۔

”آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“ ندا نے اُردو میں کہا تھا اس لیے وہ سمجھ نہیں سکا اور خولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہیس۔“ خولہ نے زبان کے ساتھ سر بھی اثابت میں ہلایا۔

”مجھے پاکستانیوں کی کچھ کچھ پہچان ہونے لگی ہے۔“ وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

”بعض چہروں میں بہت کشش ہوتی ہے، جیسے آپ۔“ آخر میں اُس نے ایک دم خولہ کی طرف اشارہ کر دیا تو وہ گھبرا کر ندا کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہاری تعریف کر رہا ہے۔“ وہ اُس کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے شرارت سے کہنے لگی۔

”میرا نام مارک ہے۔“ وہ اپنا تعارف کروانے لگا۔ ”میں اسکاوٹ لینڈ سے آیا ہوں۔“

”یہاں کیا کرتے ہیں؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”میں انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں شعبہ انگریزی کلچر میں ہوں اور جانوروں پر ریسرچ بھی کر رہا ہوں۔“ ذرا توقف کے بعد کہنے لگا۔ ”اصل میں میرا باپ ایک کسان ہے۔ اس کے پاس تھوڑی بہت زمین ہے، جس پر وہ کاشتکاری کرتا ہے، اور اس نے ایک فارم بھی بنا رکھا ہے۔ جس میں مختلف جانور ہیں۔ میرے باپ کی خواہش تھی کہ جب اُس کے جانور بیمار ہوں تو ان کے علاج کے لیے اسے کہیں دور نہ جانا پڑے۔“

”موصوف مستقبل کے ڈیگر ڈاکٹر ہیں۔ ندا کی سرگوشی پر وہ ہنس پڑی۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ ندا اُس سے کہنے لگی۔ آپ تو انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں ہیں پھر یہاں کیسے آئے؟ میرا مطلب ہے، یہاں تو ڈاکٹر ولسن کے اسٹوڈنٹس ہیں۔“

”ڈاکٹر ولسن میرے رشتہ دار ہیں۔“

”ہیلو مارک!“ وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ کہ ایک لڑکی نے آ کر اُس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے دیکھا۔ وہ وہی لڑکی تھی جن کا محبوب مشغلہ مشرقی لوگوں کا مذاق اڑانا تھا اور جو اس روز ایک کیفے میں کاؤنٹر پر بیٹھی نظر آئی تھی۔

”جوزفین!“ مارک اُس سے کہنے لگا! ”یہ دونوں پاکستانی ہیں۔“ جواب میں اُس نے بُرا سامنہ بناتے ہوئے کچھ ایسی نظروں سے اُن دونوں کی طرف دیکھا کہ ندا فوراً بول پڑی۔

”ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔“

”واؤ!“ اُس کے ہونٹ دائرے کی شکل اختیار کر گئے اندازِ تمسخرانہ تھا۔ ”تم لوگ صرف فخر کرتے اور کچھ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کتنا عرصہ ہوا ہے، تمہارے ملک کو آزاد ہوئے؟ میرا خیال ہے، نصف صدی تو ہونے ہی والی ہے اور تم لوگ اب تک ترقی پذیر ممالک کی قطار میں کھڑے ہو۔ آخر کیوں؟“

”فکر مت کرو، زیادہ دن نہیں ہیں جب ہم ترقی پذیر کی قطار سے نکل کر ترقی یافتہ کی قطار میں شامل ہو جائیں گے۔“

”ہونہ! ترقی یافتہ کی قطار میں شامل ہو جاؤ گے۔ برسوں سے تم لوگ یہ خواب دیکھ رہے ہو، میں پوچھتی ہوں آخر اسے تعبیر کب دو گے۔ پر چار تو بہت کرتے ہو کہ ہم بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔ بہت باہمت ہیں، ہمارے حوصلے جوان ہیں، ہمارے عزائم۔“

”ہاں، ہم بہت باہمت ہیں اور ٹیلنٹڈ بھی۔“ ندا اُس کی بات کاٹ کر دبی و بی آواز میں چیخ پڑی۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے سارے ٹیلنٹ کو تم لوگ ڈالروں سے خرید لیتے ہو، تمہارے پاس تمہارا اپنا کیا ہے۔ کبھی فرصت ملے تو ایمانداری سے اپنا محاسبہ کر دیکھنا جوزفین کہ سپر پاور بننے میں تمہارا اپنا کتنا ہاتھ ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں۔“ جوزفین کا انداز اب بھی چڑانے والا تھا۔ ”صرف بیس فی صد باقی اسی فی صد ادھر ادھر سے مستعار لیے ہوئے ٹیلنٹڈ لوگ ہیں۔ جن کے بل پر تم اتنا اتر رہی ہو۔ دوسروں کا کیا کہوں۔ خود ہمارے ہاں کے ڈاکٹر عبد السلام یہاں موجود ہیں۔“

”ندا پلینز، خاموش ہو جاؤ۔“ خولہ نے اُس کا ہاتھ دبا کر کہا لیکن وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

”کیوں خاموش ہو جاؤں، مجھے اسے بتانے دو کہ ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہیں جو اس وقت ہمیں ترقی پذیر ہونے کا طعنہ دے رہی ہے۔ ہمارے ہاں جب خالد و طارق پیدا ہوتے ہیں سب سے پہلے یہ ان کا سرکل دیتے ہیں۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا۔ ہماری یا ہماری آنے والی نسل میں کوئی ایسا ضرور ہوگا۔ جسے ان کے ڈالروں کی چمک دمک متاثر نہ کر سکے گی۔“

”چھوڑو ندا! مت اس بحث میں الجھو، چلو دیکھتے ہیں شہر وز کہاں ہے۔“ وہ مارک سے معذرت کرتی ہوئی ندا کو تقریباً گھسیٹ کر دوسری طرف لے گئی۔

واپسی میں ندا کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ مسلسل، جوزفین کو گالیاں دیتی رہی۔ ”اُلو کی پٹھی۔ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ آئندہ میرے منہ لگنے کی کوشش کی تو گلا دبا دوں گی اُس کا۔“

”تمہیں کیا ضرورت تھی اُس سے بات کرنے کی۔“

”بات میں نے نہیں اُس نے شروع کی تھی۔“ وہ اب بھی غصے میں تھی۔

”چلو دفع کرو۔“ خولہ موضوع ختم کرنے کی غرض سے بولی۔

”کیسے دفع کروں، اتنی حقارت ہوتی ہے اُس کے لہجے میں، مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔“

”ہر ایک کا اپنا انداز ہوتا ہے، ہو سکتا ہے، اُس کا بات کرنے کا انداز ہی ایسا ہو۔“

”تم دونوں کوئی اور بات نہیں کر سکتیں؟“ شہر وز اُن کی گفتگو سے اکتا کر کہنے لگا۔

”بالکل کر سکتے ہیں۔“ ندا اپنا موڈ بدلتے ہوئے کہنے لگی۔ ”اب ڈرا دل تھام کر سنو کہ ڈاکٹر زواگو کارشتے دار مارک خولہ کی بہت تعریف کر رہا تھا۔“

”کیا؟“ وہ چیخ پڑا۔ ”خولہ سے پوچھ لو۔“

”بکواس کر رہی ہے یہ۔“ وہ اُس کے بازو میں چٹکی کاٹتی ہوئی بولی تو وہ ہنس پڑی۔

اگلے دن وہ دونوں چنانچہ ٹائم میں کیفے ٹیریا میں داخل ہوئیں تو اُن کی مخصوص جگہ پر پہلے ہی سے جوزفین بیٹھی تھی۔

”آؤ، ہم وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ وہ ندا کا ہاتھ پکڑ کر جیسے ہی دوسری طرف جانے لگی۔ ندا نے اُس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

”نہیں، ہم اپنی جگہ پر بیٹھیں گے۔“

”وہاں ہمارا نام نہیں لکھا؟“

”نہ لکھا ہونا، ہم پھر بھی وہیں بیٹھیں گے، آؤ۔“

وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی وہیں لے گئی۔ جہاں جوزفین بیٹھی تھی، وہ بڑے اطمینان سے جوزفین کے سامنے بیٹھی اور خولہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔ جوزفین نے لمحہ بھر کو اُس کی طرف دیکھا پھر برگر کھانے میں مصروف ہو گئی۔

”خولہ! تم پلیز میرے لیے جوس لیتی آنا۔“

”کیوں کچھ کھاؤ گی نہیں۔“

”نہیں، اس وقت کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہے۔“ خولہ چپ چاپ چلی گئی اور جب وہ اپنے لیے برگر اور اس کے لیے جوس لے کر واپس آئی تو وہ جوزفین کو مکمل طور پر نظر انداز کیے دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری دوست شاید مجھ سے خفا ہے۔“ اس کے بیٹھتے ہی جوزفین ندا کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی۔

”میں کیوں تم سے خفا ہوں گی۔“ وہ فوراً بول پڑی لہجہ اکھڑا کھڑا سا تھا۔

”تم بہت جذباتی ہوندا! جوزفین اب براہ راست اُس سے مخاطب تھی۔“ اور جذباتی بندے کبھی کبھی بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔ یقین کرو، مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم لوگ جس مقصد کے تحت یہاں آئے ہو، اُسے حاصل کرو اور واپس اپنے گھر کی راہ لو۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارا یہاں مستقل رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یہ بات تم صرف اپنے بارے میں یقین سے کہہ سکتی ہو۔ دوسروں کے بارے میں نہیں۔ ان لوگوں کو بھی سمجھاؤ۔ جنہوں نے صرف گرین کارڈ کو زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تم اچھی طرح جانتی ہو گی کہ تمہارے ہاں کے لوگ گرین کارڈ کے حصول

کی، خاطر کیا کیا کر گزرتے ہیں۔“

وہ خولہ کی طرف دیکھنے لگی یوں جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ لڑکی اُسے کیا سمجھانا چاہتی ہے۔ خولہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ اس لیے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرنے لگی۔

”تمہیں اگر بُرا لگتا ہے تو میں آئندہ تم سے ایسے کسی مسئلے پر بات نہیں کروں گی۔ لیکن میں اپنا مشن نہیں چھوڑ سکتی۔ میں جہاں تک ہو سکا تمہارے ہاں سے آنے والے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ اپنے گھر کی راہ لو۔“

”کیوں تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے؟“ ندا کے تسخرانہ لہجے پر وہ چیخ پڑی۔

”ہاں، میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“

”وہی تو پوچھ رہی ہوں کیوں؟“

”اس لیے۔ اس لیے ندا! جہاں تک میرا باپ بھی پاکستانی تھا۔“

”کیا؟“ اس کے ساتھ ساتھ خولہ بھی چیخ پڑی۔

”ہاں، وہ صرف اُس وقت تک ہمارے ساتھ رہا جب تک اُسے گرین کارڈ نہیں مل گیا۔ اس کے بعد وہ سارے ناتے توڑ کر جانے کہاں چلا گیا۔ میں پوچھتی ہوں کیا اُس کے اس طرح چلے جانے سے مرا اس سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ کبھی نہیں، میری ولدیت کے خانے میں ہمیشہ اُس کا نام لکھا رہے گا۔“

”آئی ایم سوری جوزفین اگر تم پہلے ہی بتا دیتیں تو۔“

”ہونہ۔!“ وہ تلخ ہو گئی۔ ”بار بار اپنی داستان دہراتے ہوئے میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتی ہوں۔ کچھ بھی سہی، وہ ہے تو میرا باپ۔ میری رگوں میں دوڑتا ہے، جانے کیا کشش ہے، اُس کے خون میں کہ میرا دل اس کی طرف کھینچتا ہے۔ پتا نہیں کبھی اُس نے بھی میرے لیے سوچا ہو گا کہ نہیں۔ کیا تمہارے ہاں کے سب لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

”تمہاری می کہاں ہیں؟“ ندا بہت آہستہ آواز میں پوچھنے لگی۔

”وہ اپنے گھر میں خوش باش ہیں۔“

”تم کہاں رہتی ہو؟“

”مجھے خواب مت دکھاؤ۔“

”ہم صرف تعبیر دیں گے، خوبصورت خواب تو خود بخود تمہاری آنکھوں میں سبجے لگیں گے۔“ وہ بغور دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

”آؤ، کلاس شروع ہونے والی ہے۔“ خولہ اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہی کھڑی ہوئی تو وہ کسی معمول کی طرح اُن کے ساتھ چل پڑی۔

رات میں اُن دونوں کا موضوع جوزفین تھی۔ کتابیں سامنے رکھے وہ مسلسل اُسی کے بارے میں باتیں کیے جا رہی تھیں۔

”خولہ! کیا اُس کی باتوں پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“ ندا چانک پوچھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“

”ہوسکتا ہے، اس نے کوئی فرضی داستان کہہ سنائی ہو۔“

”لیکن اُسے فرضی داستان سنانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ندا کچھ دیر سوچتی رہی پھر کہنے لگی۔

”یار ہمارے ہاں کے مردوں کو ایسا کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لینا چاہیے کہ ان کے اس عمل سے ہم جیسی لڑکیوں کو کتنی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ کہاں تو میں جوزفین کو زیر کرنا چاہتی تھی اور اب جیسے خود چاروں شانے چت ہو گئی ہوں۔“

”تم اب بھی اسے زیر کر سکتی ہو۔“

”کیسے.....؟“

”اپنے اچھے اخلاق اور حسن سلوک کی بدولت۔“ خولہ توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”سنو ندا! کیوں نہ ہم اُس کے ساتھ ہونے والی زیادتی یا نا انصافی کی تلافی کر دیں۔ مجھے لگتا ہے، وہ اپنی ماں کی نسبت باپ سے زیادہ مانوس رہی ہے جیسی تو اُس کے اندر عائشہ بننے کی خواہش چمکتی ہے، اور مجھے یقین ہے، ہماری تھوڑی سی کوشش اُسے مکمل عائشہ کا روپ دے دے گی۔“

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اس پہلو پر بھی سوچو کہ عائشہ بننے کے بعد اُسے کس معاشرے میں پناہ ملے گی۔ میرا خیال ہے نہ وہ یہاں کی رہے گی نہ وہاں کی۔“

”اور میرا خیال ہے، یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم اُسے اپنے ساتھ لے جائیں

”میں ایک فیملی کے ساتھ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہوں۔ شام میں ایک کیفے میں جاب کرتی ہوں۔ مجھے اپنی نصف زندگی سے شکوہ نہیں ہے، یہاں تو ہر دوسرا بندہ ایسی ہی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن میں اپنی پہچان ضرور چاہتی ہوں۔ میری ماں مجھے جوزفین کہتی تھی۔ جبکہ میرے باپ نے میرا نام عائشہ رکھا تھا۔ کاش وہ جاتے ہوئے میرے خون سے اپنی کشش بھی ساتھ لے جاتا تو میں اس طرح نہ ٹوٹتی اس وقت جب میرے اندر عائشہ سر اُبھارنے لگتی ہے تو میں جیسے چکی کے دوپاٹوں کے درمیان آکھڑی ہوتی ہوں۔ تب میرا دل چاہتا ہے۔ کوئی میرا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچ لے لیکن۔“ اُس نے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹکالی۔

”یہ صرف میرا المیہ نہیں ہے۔“ وہ پھر بولی۔ ”میری طرح اور بھی ہوں گے اور یہ صرف۔“

”جوزفین پلزز۔“ خولہ اس کی بات کاٹ کر بول پڑی: سب کو ایک قطار میں مت کھڑا کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ لوگ ایسے غلط طریقے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

”تم اپنے ہاں کے لوگوں کی وکالت نہیں کرو گی تو کون کرے گا۔“

”چلو، اس بحث کو چھوڑ دو اور میرا ایک مشورہ مانو۔“ وہ سوالیہ نظروں سے ندا کی طرف دیکھنے لگی۔

”کبھی جب تمہارے اندر عائشہ سر اُبھارنے لگے تو ہمیں آواز دے لینا۔ ہم تمہیں اپنی طرف کھینچنے میں دیر نہیں کریں گے۔ کیوں خولہ؟“ اپنی بات کہہ کر ندا خولہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”بالکل؟“ اُس نے فوراً تائید کی۔

”سنو، میں تم پاکستانیوں سے الجھتی ہی اُس وقت ہوں جب میرے اندر عائشہ بننے کی خواہش مچنے لگتی ہے۔“

”رینی! دونوں نے ایک ساتھ اُس کے ہاتھ تھام لیے؟“ آؤ ہم عائشہ کی طرف جانے والے راستے پر چھائی دھند اپنی پالکوں سے صاف کریں گے کہ منزل خود چل کر تمہارے پاس آئے گی۔“

گے۔“

”کیا وہ ہمارے ساتھ جانے پر رضا مند ہو جائے گی.....؟“

”کیوں نہیں، جب اُسے اپنے باپ کی کشش کھینچتی ہے اُس مٹی میں بھی اُس کے لیے ضرور کشش ہوگی۔“

”یہ تو ہے۔“

”لیکن سنو، تم ابھی سے اُس سے جانے کی بات مت کہہ دینا۔ ہم پہلے اُس کے خیالات دیکھیں گے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔“

”اب میں اتنی بیوقوف بھی نہیں ہوں۔“

”بیوقوف نہیں ہو لیکن جلد باز ضرور ہو۔“

”واقعی جلد باز تو ہوں۔“ ندانے فوراً اعتراف کیا۔ ”یہاں آنے کا فیصلہ بھی جلد بازی میں کیا تھا۔ جیسی تو پچھتا رہی ہوں۔“

”یہ سارا پچھتاوا اُس وقت دور ہو جائے گا جب یہاں سے ایم ڈی کی ڈگری لے کر جاؤ گی۔“

”ابھی بہت وقت ہے۔“

”کوئی زیادہ وقت نہیں ہے، گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔“

”تم اپنے بارے میں کہہ سکتی ہو۔ کیونکہ وہ خوبصورت ساتھی جو ساتھی ہے۔“ پھر اچانک چونک کر کہنے لگی۔ ”خولہ جوزفین کے بارے میں شہروز سے بھی مشورہ کر لیتے ہیں۔“

”ہاں صبح جاتے ہوئے اس سے بات کر لیں گے۔“

لیکن جب شہروز نے سنا تو اس نے نہ صرف ان دونوں سے اختلاف کیا بلکہ انہیں سختی سے جوزفین کے معاملے میں پڑے سے منع بھی کیا۔ لیکن وہ نڈا ہی کیا جو کسی بات کا ارادہ کر لے اور اسے پورا نہ کرے لہذا اس نے پُر زور دلائل سے شہروز کو قائل کر کے ہی چھوڑا۔ یوں تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ جوزفین کو اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کر سکیں۔

جس روز وہ اپنا گھر جہاں وہ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی تھی۔ چھوڑ کر ان کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوئی۔ اسی رات انہوں نے کھانے پر شہروز کو بھی بلایا۔ کھانے کے بعد

چاروں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس دوران جوزفین کھل کر ان کے سامنے آئی تھی۔ وہ فطرتاً اچھی لڑکی تھی، بس کسی کسی وقت ذرا جذباتی ہو جاتی تھی۔ فوری طور پر انہوں نے اُسے کسی بات پر مجبور نہیں کیا۔ اور نہ ہی اپنی کوئی بات زبردستی اُس پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ خود ہی اُن کے سانچے میں ڈھلتی گئی تھی اور اُس روز تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اُس نے مکمل طور پر جوزفین کا خاتمہ کر دیا اور اپنے آپ کو عائشہ کہلوانے میں فخر محسوس کرنے لگی۔

☆☆☆

اُن کے سمسٹر قریب تھے اور ساتھ ہی عید بھی آنے والی تھی۔ انہوں نے عید کی تیاری سمسٹر کے بعد کے لیے اٹھا رکھی اور اپنی ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔

جس روز سمسٹر ختم ہوئے، انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں تو سمسٹر کے بعد دس دن کی چھٹیاں ملتی تھیں۔ لیکن اس بار عید کی وجہ سے انہیں تین دن کی اضافی چھٹیاں بھی مل گئیں، جس سے پھر پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، پہلے انہوں نے اپنے جمع شدہ کام کیے اس کے بعد عید کی شاپنگ میں لگ گئیں۔

”خولہ! اس عید کو یادگار طور پر منائیں گے۔“ نڈا خاص پُر جوش تھی۔ اُس نے مسکرا کر سر ہلایا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”ہو سکتا ہے، کبھی میں کوئی بہت بڑی آدمی بن جاؤں اور اخبار والے میرا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھیں کہ کبھی آپ کو پردیس میں عید منانے کا اتفاق ہوا۔ تب میں اپنی اس عید کا احوال مزے لے لے کر سناؤں گی۔“ اُس کے ساتھ ساتھ عائشہ بھی ہنس پڑی۔

”کیوں کیا مجھ میں بڑا آدمی بننے کے جراثیم نہیں ہیں۔“ وہ اُن دونوں کے ہنسنے پر پوچھنے لگی۔

”ضرورت سے زیادہ ہیں۔“ عائشہ فوراً بول پڑی۔

”مجھے خدشہ ہے نڈا! کہ اگر تمہارے بھائی آکر تمہیں واشنگٹن لے گئے تو۔ ہماری عید تو بے مزہ ہو جائے گی۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھائی کو پہلے ہی منع کر چکی ہوں، لہذا ہر قسم کے خدشے سے آزاد ہو جاؤ۔“

”واقعی تم کتنی اچھی ہوندا۔“ خولہ کے کہنے پر وہ ہنس پڑی۔

”اب تو مان جاؤ کہ میں ہر کام تمہاری خاطر کرتی ہوں۔“

”میں مانتی ہوں اور وہ کام بھی جو کرنے کے نہیں ہوتے، وہ بھی تم میری خاطر ہی کرتی ہو۔“ خولہ م معنی خیز انداز سے ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

چاند رات کو..... وہ مختلف چیزیں بنانے میں لگی رہی جبکہ ندا اطمینان سے بیٹھی عائشہ کے ہاتھوں میں مہندی لگاتی رہی۔ جس وقت وہ کچن کے کاموں سے فارغ ہو کر آئی ندا اُس سے کہنے لگی۔

”جلدی آؤ، تمہارے ہاتھوں میں بھی مہندی لگا دوں۔“

”نہیں مجھے شوق نہیں ہے۔“ اُس نے فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

”شوق کی کیا بات ہے، جب ہم لگا رہے ہیں تو تم بھی لگاؤ۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“

”بالکل ضروری ہے، جلدی آؤ۔“

”آؤ ناں۔“ عائشہ بھی اصرار کرنے لگی۔ ”دیکھو، اس نے میرے ہاتھوں کو کتنا

خوبصورت بنا دیا ہے۔“

اُس نے لمحہ بھر..... عائشہ کی طرف دیکھا۔ پھر خاموشی سے ندا کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیے۔ اور ابھی ندا اُس کے ہاتھ پر مہندی لگا ہی رہی تھی کہ شہروز آگیا۔ وہ ان تینوں کے لیے چوڑیاں لایا تھا۔

”بس انہی کی کمی تھی۔“ ندا اُس کا ہاتھ چھوڑ کر پینٹ میں سے چوڑیاں نکال کر دیکھنے لگی۔ رنگ برنگی چوڑیاں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

”تھینک یو شہروز! آپ نے بڑی تکلیف کی۔“

”تکلیف کیسی؟“

”ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے۔“ وہ اپنے ہاتھ میں چوڑیاں ڈالتے ہوئے

بھول ہی گئی کہ وہ خولہ کے ہاتھ میں مہندی لگا رہی تھی۔

”ندا! پہلے اسے تو مکمل کرو ورنہ میں ہاتھ دھونے جا رہی ہوں۔“

”خبردار، بس دو منٹ صبر کرو۔“

”لاؤ، اُسے میں مکمل کر دوں۔“ شہروز نے اُس کا ہاتھ کلائی سے تھام کر اپنی طرف کر

لیا۔

”تم۔“ وہ حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اُس نے کون لے کر اُس کے ہاتھ پر

ڈیزائن بنانا شروع کر دیا۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہی ندا خود چوڑیاں پہننے کے بعد عائشہ کو پہنانے میں لگ گئی تھی۔

”ارے! آپ نے تو کمال کر دیا۔“ چوڑیوں سے فارغ ہونے کے بعد ندا جیسے ہی

اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوئی تو اُس کے ہاتھ پر بنا خوبصورت ڈیزائن دیکھ کر بے اختیار تعریف کرنے لگی۔

”اصل کمال تو اب کر رہا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اُس نے ہتھیلی کے درمیان میں

مہندی سے اپنا نام لکھ دیا۔

”شہروز!“ اُس نے آہستہ سے بُڑا تے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”مٹانا مت، اچھا لگ رہا ہے۔“

”یہ مٹانا بھی چاہے تو نہ مٹا سکے گی۔“ شہروز کا انداز والہانہ تھا اور آنکھوں میں مخصوص

چمک جو اُسے نروس کر دیتی تھی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ وہ تینوں

اُسے روکتے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح وہ بہت جلدی اُٹھ گئی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ لیونگ روم میں سے

چیزیں سمیٹنے لگی، جورات ندا نے یونہی چھوڑ دی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ اُن دونوں کو آواز بھی

دیتی جا رہی تھی لیکن وہ دونوں کسمسا کر پھر سو جاتیں۔ لیونگ روم سیٹ کرنے کے بعد وہ اُن

دونوں کے سر پر پہنچ گئی۔

”یہ تمہاری یادگار عید ہے، جو ابھی تک پڑی سو رہی ہو۔“ وہ ندا کے اوپر سے کبل کھینچتی

ہوئی کہنے لگی۔

”کیا کریں گے اتنی جلدی اُٹھ کر؟“

”تیار ہو جاؤ، تمہاری تیاری میں بھی دو گھنٹے لگیں گے۔“

”چھوڑو ہم نے کس کے لیے تیار ہونا ہے۔“ ندا کروٹ بدلتے ہوئے پھر سونے

”وہ بھی کرلوں گا لیکن پہلے۔“

”دیکھو، نندا دھری آرہی ہے۔“ وہ جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کچن میں چلی گئی۔

جس وقت وہ ٹرے میں ڈھیرے سارے لوازمات لیے واپس آئی۔ وہ دونوں اس کے پاس بیٹھی تھیں۔

”یہ دونوں کوئی کام نہیں کرتیں؟“ وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

”انہی دونوں سے پوچھو۔“

”کیوں بھی؟“

”ہمیں اتنی مزیدار ڈشز پکانی آتی ہی نہیں۔“ نندا پورا کباب منہ میں رکھتی ہوئی

اطمینان سے بولی۔

”لیکن تم لوگ اس کا ہاتھ تو بٹا سکتی ہو۔“

”بالکل، دیکھیے گا۔ ابھی میں کتنی فرسٹ کلاس چائے بنا کر لاؤں گی۔“ پھر اٹھتے

ہوئے کہنے لگی ”آؤ عاشرہ! چائے بنا لائیں۔“

”عاشرہ کو کہاں لے جا رہی ہو؟“ وہ فوراً بول پڑی۔

”یہ یہاں بیٹھ کر کیا کرے گی، ویسے بھی تم دونوں.....“ باقی جملہ روک کر اس نے

شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور عاشرہ کا ہاتھ کھینچتی ہوئی کچن میں لے گئی۔

”لڑکی خاصی سمجھدار ہے۔“ وہ اس کے جاتے ہی کہنے لگا۔

”لیکن تم مجھے نروس کرنے والی بات مت کرنا ورنہ میں بھی اٹھ کر چلی جاؤں گی۔“ وہ

ہنس پڑا۔

”لاؤ، اپنی مہندی دکھاؤ۔ کیسی لگی ہے؟“ وہ ہتھیلی کھول کر دکھانے لگی۔

”تمہیں اپنا نام نہیں لکھنا چاہیے تھا۔“

”کیوں؟“

”کسی اور کی نظر پڑ گئی تو پتا نہیں کیا سوچے اور پھر اسے مٹنے مٹنے بھی وقت لگے گا۔“

”کیا تم اسے مٹانا چاہتی ہو.....؟“

”ہاں.....!“

اس کی آنکھوں کی مخصوص چمک ماند پڑنے لگی۔ تب وہ فوراً بولی۔

لگی۔

”ٹھیک ہے، میں نے بھی رات جتنی چیزیں تیار کی ہیں۔ وہ سب آس پاس کے لوگوں کو دے آتی ہوں تم لوگ سوتی رہو، آرام سے۔“ اس کی دھمکی کام کر گئی۔ دونوں فوراً کمر بلیک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”خبردار ہمارے پیٹ پر لات مارنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ دونوں ابھی تک اپنی تیاری میں لگی ہوئی تھیں۔ جب کہ وہ تیار ہونے کے بعد کچن میں آ کر کباب بنانے لگی۔ قیمہ اس نے رات ہی پیس کر رکھ لیا تھا۔ اب بس تلنا باقی تھا۔ اس نے سوچا، کباب تلتے ہی وہ ساری چیزیں ٹیبل پر رکھ دے گی اور اگر دونوں نے ساتھ دیا تو ٹھیک ورنہ وہ اکیلی ہی کھانے بیٹھ جائے گی۔ کیونکہ بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ کباب تلنے کے بعد اس نے چو لھا بند کرنے کے..... بجائے چائے کا پانی رکھ دیا اور ابھی کچن سے نکلی ہی تھی کہ ٹیبل بجنے لگی۔ وہ کیونکہ دروازے کے قریب ہی تھی۔ اس لیے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے شہر و زکھڑا تھا۔

”عید مبارک!“ اس نے پیشانی پر ہاتھ لے جاتے ہوئے سلام کا اشارہ کیا اور زبان سے عید مبارک کہا۔ بڑا خوبصورت انداز تھا۔ وہ بے خیالی میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا یہیں سے واپس چلا جاؤں؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگا اور وہ کچھ نچل سی ہو کر دروازے سے ہٹ گئی۔

”آئیے۔“

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“ وہ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”تیار ہو رہی ہیں۔ تم بیٹھو، میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔“ وہ جیسے ہی جانے لگی، اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سنو، میرے آتے ہی تم ادھر ادھر بھاگنے کے بہانے کیوں ڈھونڈنے لگتی ہو.....؟“

”نہیں تو۔“

”اگر نہیں۔ تو آؤ میرے ساتھ بیٹھو۔“

”ناشتا نہیں کرو گے؟“

”ول کی سختی پر جو لکھا ہے، وہ تو انٹ ہے۔ پھر یہاں لکھ کر زمانے کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”خولہ.....!“ وہ بے اختیار اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

”اچھا میرا ہاتھ چھوڑو۔“

”میرا خیال ہے، پہلے مجھے کچھ عہد و پیمان کر لینے دو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

”کیوں.....؟“

”ہمیں ایک دوسرے کا یقین رکھنا چاہیے۔“ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر کہنے لگا۔

”سنو، میری تعلیم تو ختم ہو گئی۔ اب تمہارا کیا خیال ہے، میں اسپیشلائزیشن کے لیے

رک جاؤں یا واپس جاؤں؟“

”یہ تو تم اپنے گھروالوں سے پوچھو۔“

”انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔“

اور تم کیا چاہتے ہو.....؟“

”میں اگر رکنا بھی چاہوں گا تو صرف تمہارے لیے اور اسی بہانے اسپیشلائزیشن بھی

کر لوں گا۔“ فوری طور پر وہ اس کا جواب نہیں دے سکتی تھی، اس لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں دیکھتی ہوں، یہ دونوں چائے بنا رہی ہیں یا.....؟“

”میری بات کا جواب نہیں دو گی.....؟“

”میں کیا کہوں جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ وہ جیسے ہی جانے لگی ندا چائے لیے آ گئی۔

”ارے تم کھڑی کیوں ہو.....؟“

”میں تمہارے پاس آ رہی تھی۔ اتنی دیر لگا دی چائے بنانے میں۔“

”ہائیں! میں تو سچی سچی تم مجھے وعائیں دے رہی ہو گی۔“

”بکومت۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی اور پھر شہر کو چائے دینے کے بعد اپنا

کپ لے کر عائشہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

پھر سارا دن ان چاروں نے مختلف گیمز کھیلتے ہوئے گزارا۔ کبھی کیرم، کبھی کارڈز اور شام میں واک کے لیے نکلے تو بہت دور تک نکل گئے۔

اگلا دن انہوں نے زیادہ وقت سونے میں گزارا اور عید کے تیسرے دن وہ اپنے معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنے لیے چائے بنائی اورنگ لیے ہوئے بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔ اور ایسے وقت جب وہ تنہا ہوتی تھی تو اسے اپنا گھریا دآنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ می کو یاد کرتے ہوئے کچھ ادا سی ہو گئی۔

”کتی تنہا ہوں گی می!“ اس نے سوچا۔ ”پتا نہیں میرے بغیر انہوں نے عید کا دن کیسے گزارا ہو گا۔ اور ڈیڈی ہمیشہ عید کے تیسرے دن میرے پاس آیا کرتے تھے آج وہ سوچ رہے ہوں گے کہ خولہ تو ہے نہیں پھر کیونکر جاؤں۔“

اچانک کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کا خیال تھا شہر وز ہو گا۔ لیکن جب دروازہ کھول کر دیکھا تو سامنے ڈیڈی کھڑے تھے۔ وہ بے اختیار اُن سے لپٹ گئی۔

”میں ابھی ابھی آپ کو یاد کر رہی تھی۔“ وہ انہیں لیے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

”صرف یاد کر رہی تھیں، میرے آنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا؟“

”یہی سوچ رہی تھی کہ آپ ہمیشہ آج کے دن میرے پاس آتے ہیں۔“

”ہمیشہ آتا رہا ہوں تو پھر آج کیوں نہ آتا بیٹا؟“

”ڈیڈی! مجھے آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ گھر میں سب لوگ کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں۔ میں تمہاری می کے پاس سے بھی ہو کر آیا ہوں۔ وہ بھی ٹھیک

ہیں۔ انہوں نے تمہیں بہت سارا پیار اور وعائیں بھیجی ہیں۔“

”میرے آنے سے تو می بہت اکیلی ہو گئی ہوں گی۔“ وہ سر جھکا کر پوچھنے لگی۔

”ہاں، لیکن تم فکر نہ کرو۔ وہ بہت بہادر عورت ہے۔“ وہ چپ چاپ ان کی طرف

دیکھنے لگی جو اپنی بات کہہ کر قریب رکھا میگزین اٹھا کر دیکھنے لگے تھے۔

”ڈیڈی! آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لیے ناشتالے کر آتی ہوں۔“

انہوں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ کمرے میں نکل آئی۔

بچن میں جانے سے پہلے اس نے ندا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں اٹھ

تو چکی تھیں لیکن اپنے کمرے میں نہیں نکلی تھیں۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کمبل کو نہیں چھوڑ رہیں یا کمبل تمہیں نہیں چھوڑ رہا۔“

”کمبل ہمیں نہیں چھوڑ رہا۔“ دونوں ایک ساتھ بولیں ”اب بے چارے کمبل کا دل بھی تو نہیں توڑا جاسکتا ناں۔“

”اچھا! اب اٹھ جاؤ۔ میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔“

”سنو! تم زحمت مت کرو۔ ہم خود ہی بنالیں گے ورنہ تمہارے شہروز صاحب کہیں گے۔۔۔۔۔“

”اس وقت شہروز نہیں میرے ڈیڈی آئے ہیں۔“ وہ خوشی سے بتانے لگی۔

”واقعی.....“

”ہاں اور میں انہی کے لیے ناشتہ بنانے جا رہی ہوں تم دونوں بھی اگر ہمارا ساتھ دینا چاہو تو اٹھ جاؤ۔“ ندا فوراً کمبل پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر عائشہ سے کہنے لگی۔

”آؤ عائشہ! پہلے انکل سے مل آئیں۔ ابھی ابھی پاکستان سے آرہے ہیں۔ ان میں سے اپنے دیس کی خوشبو آ رہی ہوگی۔“

”منہ دھو کر جانا۔ ڈیڈی کو منیلے چہرے اچھے نہیں لگتے۔“

”کیا.....؟“ ندا کے چیخنے پر وہ ہنسی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

وہ جانتی تھی ڈیڈی بیٹھا بہت پسند کرتے ہیں۔ اس لیے پہلے اس نے سویاں بنائیں۔ اس کے بعد ایک چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور دوسرے پر سلاٹس گرم کرنے لگی۔

”سنو، تم اپنے ڈیڈی کے پاس جاؤ۔ باقی کام میں کر لیتی ہوں۔“ عائشہ اس کے قریب آ کر بولی۔

”تم میرے ڈیڈی سے نہیں ملو گی؟“ وہ اپنے کام میں مصروف تھی اس لیے عائشہ کے تاثرات نہ دیکھ سکی جو اس کی بات پر مجھ سی گئی تھی۔ پھر اچانک اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”عائشہ! آؤ۔ میں تمہیں ڈیڈی کے پاس لے چلوں۔“

”تم جاؤ خولہ! میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”ارے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چلو، ڈیڈی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔“

”اچھا پہلے ناشتا تو بنا لو۔“

”ناشتا بھی بس تیار ہی ہے۔ اور یہ ندا کہاں ہے؟“

”وہ تمہارے ڈیڈی کے پاس ہے۔“

”اچھا!“ اس نے جلدی سے ٹرے میں سب چیزیں رکھیں۔ اور چائے دم کرتے ہوئے بولی ”چلو، تم یہ ٹرے اٹھا لو۔“ عائشہ نے ٹرے اٹھالی تو ٹی پاٹ اٹھا کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

ڈیڈی واقعی عائشہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ناشتے کے دوران انہوں نے بہت محبت سے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ندا اور خولہ کے اس اقدام کی تعریف کی کہ وہ عائشہ کو اپنے پاس لے آئی تھیں۔ جس وقت وہ دونوں کچن میں تھیں۔ ندا نے اسی وقت ڈیڈی کو عائشہ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اور وہ ایک بات جو وہ بہت دنوں سے کہنا چاہ رہی تھیں۔ وہ ڈیڈی نے ایک دم ہی کہہ کر ان دونوں کی مشکل حل کر دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”بیٹا! آپ پڑھائی ختم ہوتے ہی پاکستان آ جانا۔“ وہ چپ چاپ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں عائشہ! تم ہمارے ساتھ ہی چلا نا۔“ ندا بھی فوراً بول پڑی۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”ڈیڈی! اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔“ خولہ برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔

”نہیں بیٹا! تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں اس وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”کہاں؟“ وہ ہاتھ روک کر پوچھنے لگی۔

”میں یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہاری جو چند دن کی چھٹیاں ہیں، ان میں تم میرے ساتھ رہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ جلدی سے خالی برتن لے کر کچن میں گئی۔ پھر جس وقت ڈیڈی کے ساتھ جا رہی تھی ندا اور عائشہ دونوں ہی اسے گھور گھور کر دیکھنے کے ساتھ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اشارہ کر رہی تھیں کہ واپسی پر تمہاری خیریت نہیں ہے اور وہ ان کے اشارے سمجھ کر ہنستی رہی۔

اس کی پانچ دن کی چھٹیاں باقی تھیں اور یہ دن اس نے ڈیڈی کے ساتھ گزارے۔ ان دونوں وہ زندگی میں پہلی بار ڈیڈی کی محبتوں اور شفقتوں کی بلا شرکت غیر مالک رہی کہ اسے اتنی جلدی دن گزر جانے کا افسوس ہوتا رہا۔ وہ کچھ وقت اور ان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ اس کی کلاسز شروع ہونے والی تھیں اور انہیں واپس جانا تھا ان چند دنوں میں اسے خوب تفریح کرائی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار وہ اس کے سمسٹر ختم ہوتے ہی آئیں گے اور اسے کینیڈا لے جائیں گے۔ وہ جانتی تھی ڈیڈی کو سیاحت کا بہت شوق ہے۔ جیسی تو بقول می وہ سال میں چھ مہینے باہر رہتے تھے۔

اور اس شام وہ ڈیڈی کے سامنے واپس آئی تو کوریڈور میں ہی اس کی مڈ بھیر شہروز سے ہو گئی۔ کیونکہ ڈیڈی ساتھ تھے۔ اس لیے وہ مکمل طور پر اسے نظر انداز کر گئی۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ ان کے سامنے کھڑا تھا اور ڈیڈی اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے حیرت اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

”مجھے معلوم تو تھا کہ تم امریکہ میں ہو لیکن یہ علم نہیں تھا کہ یہاں بوسٹن میں ہو۔“ ڈیڈی کہہ رہے تھے۔

”میں خولہ کے ساتھ ہی یونیورسٹی آف بوسٹن میں تھا۔ اب تو خیر میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔“

تو پھر کیا واپسی کا ارادہ ہے؟

”ابھی میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ واپس جاؤں یا..... اسپیشلائزیشن کے لیے مزید چند سال یہاں رکوں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ خولہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”اسے میرے ساتھ دیکھ کر تم سمجھ گئے ہو گے کہ یہ میری بیٹی ہے۔“ ڈیڈی اس کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”جی.....!“

”اور خولہ بیٹا! یہ تمہاری آنٹی زہرا (ڈیڈی کی دوسری بیوی) کا بھتیجا ہے۔“

”آنٹی زہرا۔“ بند ہونوں کے اندر یہ نام دہراتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے اور یہ احساس اتنا شدید تھا کہ جس نے اسے اطراف سے مکمل طور پر بیگانہ کر دیا۔ پتا نہیں ڈیڈی اور اس کے درمیان کیا کیا باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بالکل نہیں سن

سکی۔ چونکہ اس وقت جب ڈیڈی اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”چلو بیٹا میری فلائٹ کا ٹائم بھی ہونے والا ہے۔“ وہ جیسے اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی اندر تک آئی تھی۔

پھر ڈیڈی بہت تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھے۔ اس کے بعد آئندہ سمسٹر کے بعد آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ وہ ڈیڈی کو دروازے تک چھوڑ کر واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ ندانے اس کا راستہ روک لیا۔

”جا کہاں رہی ہو۔ چلو ہمارے پاس بیٹھو۔“

”نہیں ندا! پلیز۔ اس وقت مجھے مت چھیڑو۔ میں بہت آپ سیٹ ہو رہی ہوں۔ تمہیں کمپنی نہیں دے سکوں گی۔“

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ ندا اس کے زرد پڑتے چہرے کو بغور دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”پتا نہیں۔“ اس کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے وہ اسے دھکیلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ اندر سے لاک کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو بیڈ پر گرادیا۔ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن آپ ہی آپ ساری باتیں ذہن کے درپچوں پر دستک دینے لگیں۔ اسے یاد آیا، جب پہلی بار شہروز نے اپنا نام بتایا تھا تو وہ کس طرح چونگی تھی۔ یوں جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے اور اگر دیکھا نہیں تو سنا ضرور ہے اور اُس وقت اسے یاد نہیں آیا تھا کہ اُس نے اُسے کہاں سنا ہے۔ اب ہر بات ذہن میں واضح ہو رہی تھی۔

یہاں آنے سے پہلے جب می نے اسے ڈیڈی کے پاس بھیجا تھا تو ایک شام اس نے فون ریسو کیا تھا۔ کسی نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

”میں شہروز جنوعہ ہوں۔ پلیز، ذرا آنٹی زہرا کو بلا دیں۔“ وہ ہولڈ کرنے کا کہہ کر آنٹی کو بلانے چلی گئی تھی۔

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی یہ نام اس کے لیے اتنا اہم ہو جائے گا۔ لیکن می.....! اس نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔ کیا وہ چاہیں گی کہ میں ان کی سوکن جیسے وہ ڈائن کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ ان کے بھتیجے سے رشتہ داریاں جوڑوں۔ کبھی نہیں۔

اور کیا میں می کو ناراض کر سکوں گی.....؟ وہ اپنے آپ کو ٹٹولنے لگی۔ اپنی می کو جنہوں نے میری خاطر زندگی کے پل صراط پر تنہا سفر کیا، اب بھی انہوں نے میرے مستقبل کو

درخشاں دیکھنے کی خاطر میری جدائی برداشت کی..... تو کیا میں.....
 ”نہیں.....“ اور اس نہیں کے بعد آنسوؤں کی برسات تھی۔ جس میں وہ لمحہ بہ لمحہ بھیکتی رہی تھی۔

صبح اسے یونیورسٹی جانا تھا لیکن رات بھر وہ جس طرح اپنے آپ سے لڑتی رہی تھی اور اس کے بعد شہر دُعا سے کبھی نہ ملنے کے فیصلے نے اسے اُٹھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ جس وقت ندا اور عائشہ اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔
 ”ہیں تم ابھی تک سو رہی ہو، یونیورسٹی نہیں جانا؟“ ندا کے پوچھنے پر اس نے پلکوں کے درکھول دیے۔ اس کی..... سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئیں۔
 ”تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

”خولہ! تمہیں شاید بخار ہو رہا ہے۔ ٹھہرو، میں تمہارے لیے چائے اور کوئی ٹیبلٹ لے کر آتی ہوں۔“

”رہنے دو۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”میں خود ہی لے لوں گی تم دونوں جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔“

”تمہیں اس حال میں چھوڑ کر؟“

”کچھ نہیں ہوا مجھے تم جاؤ۔“ اس کے چیخنے پر وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر ندا کندھے اچکاتی ہوئی کہنے لگی۔

”جار ہے ہیں۔ دروازہ اندر سے لا کر کر لو اور اگر قریب المرگ ہو جاؤ تو سامنے سے شہر دُعا کو پکار لینا۔“ پھر جاتے جاتے دروازے میں رک کر کہنے لگی۔

”ویسے میں شہر دُعا سے کبھی جاؤں گی کہ تمہارا خیال رکھے۔“

”خبردار کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بمشکل اُٹھ کر ان کے ساتھ باہر تک آئی اور ان کے جاتے ہی دروازہ لاٹ کر کے اندر آ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد اس نے چائے کے ساتھ سردرد اور بخار کی ٹیبلٹ لی اور دوبارہ آ کر لیٹ گئی۔ رات کو نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے ذہن سے ہر قسم کے خیال کو جھٹک ڈالا اور جلد ہی سو گئی۔

جانے کتنی دیر ہو گئی تھی اسے سوئے ہوئے، جب تیل کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کھڑی کی طرف دیکھا بارہ بج رہے تھے۔ ندا اور عائشہ کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ شہر دُعا ہو گا۔ وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ تیل وقفے وقفے سے بج رہی تھی۔ اس کا دل بے ایمان ہونے لگا۔ رات کیسے گئے فیصلے میں دراڑیں پڑنے لگیں تو اس نے پورا سر تکیے میں چھپا لیا۔ اس کے بعد بھی کافی دیر تک تیل بجتی رہی تھی۔ پھر شاید وہ مایوس ہو گیا تھا۔ پھر شام میں عائشہ اور ندا کے آنے پر ہی اس نے دروازہ کھولا تھا۔ لیکن ان دونوں کے ساتھ اسے دیکھ کر وہ فوراً اپنے کمرے میں آ گئی۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ ندا اس کے پیچھے آتی ہوئی بولی۔
 ”ٹھیک ہوں۔“

”تم شاید سارا دن سوتی رہی ہو۔ شہر دُعا رہا تھا۔ اس نے کئی بار تیل بجائی تھی لیکن تم نے دروازہ نہیں کھولا۔“ اس کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ اب وہ اس کے لیے کبھی دروازہ نہیں کھولے گی۔ لیکن وہ خاموش رہی۔

”تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے؟ کیا تمہارے ڈیڈی نے کوئی ایسی بات“

”میرے ڈیڈی کیوں کوئی ایسی بات کہیں گے؟“ وہ فوراً بول پڑی۔

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”وہ تو شروع سے ہے۔ تمہیں اب پتا چلا۔“ ندا کا خیال تھا، وہ ہنس پڑے گی لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

”خولہ! عائشہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”شہر دُعا تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”لیکن میں اس سے ملنا نہیں چاہتی۔“

”خولہ.....!“ ندا کی حیرات کی پروانہ کرتے ہوئے وہ بولی۔

”اس سے کہہ دو کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔“

”چلا جاؤں گا لیکن تم سے بات کرنے کے بعد۔“ وہ خود ہی اندر چلا آیا اور اسے دیکھتے ہی وہ پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

ندا سمجھ گئی کہ دونوں کے درمیان کوئی بات ہو گئی ہے۔ اس لیے عائشہ کو اشارہ کرتی

ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔

”خولہ!“ وہ قدم بڑھا کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ”تمہارا گریز اگر اس وجہ سے ہے کہ میں آئی زہرا کا رشتہ دار ہوں تو.....“

”شہروز پلینز، آپ چلے جائیں یہاں سے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بول پڑی۔

”پہلے میرا جرم بتاؤ۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“

”سنو، اپنے آپ کو دھوکا مت دو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔“

”یہ آپ سے کس نے کہا؟“ وہ استہزاء بھری ہنسی۔

”صرف میرے دل نے بلکہ تمہارے ہر انداز نے لاکھ انکار کرو، لیکن اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکو گی۔“

”میرے نزدیک حقیقت صرف یہ ہے شہروز جنوے کو میری می کبھی نہیں چاہیں گی کہ میں آپ سے کوئی نانا جوڑوں اور میں اپنی می کو کبھی ناراض نہیں کر سکتی۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ تم انہیں ناراض کرو۔“

”پھر.....؟“

”تم انہیں سمجھا سکتی ہو۔ قائل کر سکتی ہو۔“

”نہیں، مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔“

”تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں ان سے بات کروں۔“

”نہیں..... کیا کہیں گی می کہ میں یہاں پڑھنے آئی ہوں یا.....“ اس نے اپنا چہرہ

ہاتھوں میں چھپالیا۔

”دیکھو خولہ! یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے لیے تم اتنی پریشان ہو رہی ہو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی، بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

”ہاں.....“

وہ کچھ دیر تک کھڑا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

”میں جا رہا ہوں لیکن جانے سے پہلے اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہاری ہتھیلی پر لکھا میرا نام تو مٹ جائے گا لیکن دل کی تختی پر لکھا کبھی نہ مٹا سکو گی۔“

اس کے ساتھ ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

بہت سارے دن گزر گئے۔ اس نے اپنے آپ کو کتابوں میں گم کر دیا۔ ویسے بھی نئے سال کے ساتھ ان کی پڑھائی پہلے سے مشکل ہو گئی تھی کہ اب ہر لیکچر انہیں پر یکٹیلے کھلی سمجھایا جاتا تھا۔ سارا دن مرلیضوں کے درمیان رہ کر وہ کسی دوسرے خیال کو اپنے پاس نہیں آنے دیتی تھی۔ لیکن رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو کچھ وقت اس کا ذہن ضرور بھٹک جاتا تھا اور اس رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ کیونکہ یونیورسٹی سے واپسی پر ندانے اسے بتایا تھا کہ شہروز صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہے۔ اس کا دل چاہتا تھا ندانے سے پوچھے کہ وہ اسپتال سٹیشن کے لیے نہیں رکے گا؟ لیکن اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

اور اب اس وقت سے وہ اپنے آپ سے ایک ہی سوال کر رہی تھی۔

”کیا وہ مجھ سے مل کر جائے گا۔ یا مجھے اس کے پاس جانا چاہیے؟“ بہت دیر تک وہ

اپنے آپ کو الجھتی رہی اور جب اس نے سونے کے لیے اپنے ذہن سے ہر خیال کو جھٹکا،

اس وقت وہ اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں ناکام رہی تھی۔

صبح چھٹی ہونے کے باوجود وہ اپنے معمول کے مطابق اٹھی۔ لیونگ روم سے آتی ندا

کی آواز سے وہ سمجھ گئی کہ وہ دونوں شہروز کی وجہ سے جلدی اٹھ گئی ہیں۔ اس نے اٹھنے کا ارادہ

ملتی کر کے کر روٹ بدل لی۔ کچھ دیر بعد ہی ندا اس کے کمرے میں جھانک کر کہنے لگی۔

”سنو خولہ! ہم شہروز کو سی آف کرنے ایئر پورٹ تک جا رہے ہیں۔“ وہ کچھ نہیں

بولی۔

”کیا تم اسے دروازے سے بھی خدا حافظ نہیں کہو گی۔“ وہ پھر بھی خاموش رہی۔

”میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنی انتہا پسند ہو۔“ ندا بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تو وہ رخساروں پر

چھٹک آنے والے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑنے لگی۔

ان دونوں کی واپسی دو پہر تک ہوئی۔ اس وقت تک وہ خاصی نارمل ہو چکی تھی۔
 ”بڑی بے مروت ہو۔“ ندا اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔ ”بے چارا اتنا اداس ہو رہا تھا۔“
 ”تم نے اس کے آنسو نہیں پونچھے؟“ وہ محض یہ پوز کرنے کی خاطر کہ اسے اس کے جانے کا ذرا بھی ملال نہیں ہے خوش دلی سے بولی۔

”پونچھے تھے میں نے اور عائشہ نے مل کر، لیکن تمہارے کبھی نہیں پونچھیں گے۔“
 ”میرا آنسو بہانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یہ تو وقت بتائے گا جب بلا ارادہ ہی چھلک پڑا کریں گے۔“

اس کے دل میں ٹیسس سی اٹھنے لگیں۔ ایسا لگا اگر مزید اس موضوع پر بات کی تو آنسو پھلکنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس لیے موضوع بدلتی ہوئی بولی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ ندا اپنے کمرے میں چلی گئی تو وہ عائشہ کی طرف دیکھنے لگی۔
 ”خولہ! شہروز بہت اچھا ہے۔“

”تمہیں بھی ندا نے سبق پڑھا دیا ہے۔“

”نہیں۔ وہ واقعی اچھا ہے۔“

”مجھے اس کی اچھائی سے انکار نہیں ہے عائشہ۔ لیکن.....“ اس نے رک کر لمحہ بھر اس کی طرف دیکھا پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

زندگی کو معمول پر آنے میں کچھ وقت تو لگا، پھر بھی وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ ندا ابنتہ اب بھی کبھی اسے لیکچر دینے سے باز نہیں آتی تھیں اور جس روز اس سے شہروز کے بارے میں بات کرتی اس دن اور اس سے گلے کئی دن تک وہ خاصی آپ سیٹ رہا کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی ندا اس سے ایسی کوئی بات نہ کرے لیکن ندا نے پتا نہیں دل میں کیا ٹھان رکھی تھی کہ وہ اکثر اسے چھیڑ جاتی تھی۔

چھٹی کے دن وہ تینوں لیونگ روم میں بیٹھی کارڈز کھیل رہی تھیں جب ندا بولی۔
 ”کل شہروز کا خط آیا تھا۔“ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔

”تمہیں بھی سلام لکھا ہے اس نے۔“ اب وہ براہ راست اس سے مخاطب تھی۔

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

”کیا میں جواب میں تمہارا سلام لکھ دوں.....؟“

”ندا! ان باتوں سے تمہارا کیا مقصد ہے؟“ وہ کاڈز پھینکتے ہوئے قدرے خفگی سے پوچھنے لگی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا کیا مقصد.....“ وہ اطمینان سے بولی۔

”سنو ندا! مجھے قائل کرنے کی تمہاری کوشش فضول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے بارے

میں سوچو۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ تمہیں بھی تو اچھا لگتا تھا۔“

”خولہ.....!“ اُسے جیسے شاک سا لگا۔ وہ کتنی دیر تک بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ غیر ارادی طور پر سر کونٹی میں ہلاتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خولہ سے کیا کہے۔

”مجھے تم سے اتنی چھوٹی بات کی توقع نہیں تھی خولہ! میری طرف سے تم دونوں جہنم میں جاؤ.....“ وہ اٹھی اور پیر پختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خولہ نے عائشہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسے ملامت سے دیکھ رہی تھی۔ جب اُسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے اور غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ فوراً اُٹھ کر ندا کے پیچھے چل پڑی۔

”آئی ایم سوری ندا.....!“ وہ اُس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھ سے بات مت کرو۔“ وہ خاصی خفا تھی۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی پلیز، معاف کر دو۔“ وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”تم نے یہ بات کہی کیسے؟“

”بلا ارادہ ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ میرا یقین کرو۔“

”آئندہ ایسی بات نہیں کرو گی۔“

”کبھی نہیں اور پلیز تم میرے سامنے اس کا ذکر مت کیا کرو۔“

”کیا واقعی تم اس سے سب ناتے توڑ چکی ہو۔“

”میں اُس سے نانا توڑنے پر مجبور ہوں ندا! تم میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”میں جانتی ہوں۔ شہر ورنے مجھے ساری بات بتادی تھی۔“

”پھر تم کیوں مجھے تنگ کرتی ہو۔ میں جب اُسے بھولنے میں کامیاب ہونے لگتی ہوں۔ تم اُس کا ذکر چھیڑ دیتی ہو۔“

”اوکے! آئندہ میں اُس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

”شکریہ لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے معاف کیا یا نہیں؟“

”کردیا۔“ ندا کا انداز ایسا تھا، جیسے احسان کر رہی ہو۔ وہ ہنس پڑی۔

”چلو، تمہیں زبردست قسم کی چائے پلو اؤں۔“

”ہے تو یہ سراسر رشوت لیکن تم اصرار کر رہی ہو تو انکار نہیں کروں گی۔“ دونوں ہنستی ہوئی کمرے سے نکلیں تو عائشہ انہیں دیکھ کر شرارت سے کہنے لگی۔

”میں تو فرسٹ ایڈ کا انتظام کر کے بیٹھی تھی۔ خیال تھا کہ کسی ایک کا سر ضرور ٹوٹے گا۔“

”سنہیال رکھو کسی وقت بھی کام آسکتا ہے۔“ ندا اُس کے پاس جا بیٹھی جبکہ وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

ندا نے اپنے وعدے کے مطابق پھر کبھی اُس کے سامنے شہر ورنے کا ذکر نہیں کیا۔ گوکہ شہر ورنے کے خط اُس کے اور عائشہ کے نام آتے تھے لیکن وہ اُسے نہیں بتاتی تھیں۔ وہ اُس طرف سے مطمئن ہوئی تو اُس کے پاس می کا خط آگیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ تمہارے ڈیڈی تمہارے لیے شہر ورنے کا پروپوزل لے کر آئے تھے میں نے انکار کیا تو کہنے لگے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ بیٹا کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے۔“

پہلے وہ حیران ہوئی کہ ڈیڈی کو کیسے پتا چلا، پھر اُس کے سامنے می کو مطمئن کرنے کا مسئلہ تھا۔ گوکہ اس نے فوری جواب دیتے ہوئے می کو لکھ دیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر بھی وہ جانتی تھی کہ می کسی بات پر اتنی آسانی سے یقین نہیں کرتیں۔ وہ اکثر یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ می کو کیسے یقین دلانے کی۔ اور اُن دنوں تو ندا اور عائشہ کی حرکات بھی کچھ مشکوک قسم کی تھیں۔ وہ دونوں اکثر سر جھوڑ کر پتا نہیں کیا باتیں کیا کرتیں اور جیسے وہ آتی وہ فوراً سیدھی بیٹھتی ہوئی اپنا موضوع بدل لیتی تھیں۔ وہ اُن دنوں کی سرگرمیاں جاننا چاہتی تھی

لیکن کوشش کے باوجود نہیں جان پاری تھی۔ ایک دن تو وہ اُن دونوں سے اُلجھ پڑی۔

”تم دونوں میرے خلاف کیا سازش کرتی رہتی ہو۔“

”ہمیں کیا ضرورت ہے، تمہارے خلاف سازش کرنے کی۔“

”پھر ایسی کون سی بات ہے جو مجھ سے چھپا رہی ہو۔“

”گویا آپ کو اندازہ ہو گیا ہے۔“ ندا اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ ”ورنہ ہم تو یہ

سمجھتے تھے کہ آپ وہاں میں، جہاں سے آپ کو اپنی خبر بھی نہیں آتی۔“

”جی نہیں، اب اتنی بے خبر بھی نہیں ہوں میں۔ بہت دنوں سے تم دونوں کی حرکات

نوٹ کر رہی ہوں جو کہ خاصی مشکوک ہیں۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔“

”وقت آنے پر بتائیں گے۔“

”نہیں ابھی بتاؤ۔“ وہ اصرار کرنے لگی۔

”زیادہ نہیں بس دو چار دن صبر کرو۔ پھر ساری بات بتا دیں گے۔ ویسے اتنا یقین رکھو،

اس بات کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”سچ کہہ رہی ہو۔“

”بالکل سچ۔“ ندا نے اُسے یقین دلایا تھا لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھی۔ اور اس روز

یونیورسٹی سے واپسی پر انہوں نے حسب سابق اندر داخل ہونے سے پہلے لیٹر بکس میں

جھانک کر دیکھا تو انہیں دو تین لفافے ایک ساتھ نظر آئے۔ ندا نے فوراً انہیں اپنے قبضے میں

کیا اور اندر داخل ہوتے ہی دیکھنے لگی۔ ایک خط خولہ کے نام تھا جو اُس نے اُس کے حوالے

کر دیا اور باقی دونوں لفافے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اور ابھی وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد می کا خط پڑھنے بیٹھی ہی تھی کہ ندا کے کمرے

سے اُس کی اتنے زور سے چیخنے کی آواز آئی کہ وہ گھبرا کر ننگے پاؤں اُس کی طرف بھاگی۔

اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے کا منظر ہی عجیب تھا۔ ندا عائشہ کو بازوؤں سے

پکڑے گول گول چکر دیتے ہوئے منہ سے..... عجیب و غریب آوازیں نکال رہی تھی۔

”کیا ہو گیا تم دونوں کو؟“ وہ چلا کر پوچھنے لگی۔

”شادی مرگ۔“ اُسے جواب دے کر ندا پھر عائشہ کو چکر دینے لگی۔

”ندا! مجھے اب سچ سچ تمہاری دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا ہے۔“ ندا نے عائشہ کو بیڈ

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ اب پُر سکون ندی کی مانند ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اب اُن کا آخری سال تھا۔ منزل قریب تھی اس لیے ان کی لگن اور جستجو میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اور گھر جانے کی بھی جلدی تھی۔ اجنبی دیس میں جہاں اتنا عرصہ گزرا وہاں اب ایک ایک ہل کا ٹنڈا دھوا لگ رہا تھا۔ وہ تینوں اب جب اکٹھی بیٹھتیں گھر جانے کی باتیں کرتیں۔

اور پھر جس روز وہ اپنے آخری امتحانوں سے فارغ ہوئیں انہوں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ عائشہ کا خیال تھا۔ اُسے جانے سے پہلے اپنی می سے مل کر انہیں بتا دینا چاہیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہی ہے۔ اُن دونوں نے اُس سے اتفاق کیا تو وہ اپنی می سے ملنے نو یارک چلی گئی۔ وہ دو دن بعد واپس آنے کا کہہ کر گئی تھی انہوں نے اس حساب سے اپنی سیٹیں ریزرو کروالیں۔ پھر عائشہ کے آنے تک انہوں نے اپنے اپنے گھروالوں کے لیے گفٹ خریدے اور پینگ شروع کر دی۔ جس وقت عائشہ آئی وہ جانے کے لیے تیار تھیں۔

”ارے تم دونوں نے میرا سامان بھی بیک کر دیا۔“

”اگر تمہارے انتظار میں بیٹھے رہتے تو مزید دو دن رُکنا پڑتا جبکہ ہمارے لیے مزید ایک ہل بھی یہاں رُکنا دشوار ہے۔“ ندانے وضاحت کی۔

”بڑی بے مروت ہو، ان چار سالوں میں تمہیں یہاں سے کوئی انسیت نہیں ہوئی۔“

”تم ہی نے کہا تھا کہ اپنا مقصد حاصل کرو اور گھر کی راہ لو.....“

”کہا تو تھا لیکن۔“

”بس اب لیکن کی گنجائش نہیں ہے۔“ خولہ نے اُسے ٹوک دیا۔ ”تم یہ بتاؤ تمہاری می

نے کیا کہا.....؟“

”پہلے خفا ہوئیں پھر مان گئیں۔“ وہ مسکرائی۔

”چلو، یہ اچھا ہوا اور اب میرا خیال ہے، اپنی مدد آپ کے تحت اپنا سامان اٹھاؤ اور

چل پڑو۔“ میں ٹیکسی کے لیے فون کر آئی تھی۔ آنے والی ہوگی۔ اور اُس کے آنے تک ہمیں نیچے موجود ہونا چاہیے۔“

پر گرایا اور اس کی طرف پلٹتی ہوئی بولی۔

”ارے بات ہی ایسی ہے سنو گی تو تمہارا دماغی توازن بھی بگڑ جائے گا۔“

”بتاؤ تو.....“

”اپنی عائشہ ٹھکانے لگی۔“

”کیا مطلب؟“

”آرام سے بیٹھ جاؤ، پھر مطلب سمجھاتی ہوں۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے عائشہ کے پاس بیٹھ گئی تب ندا کہنے لگی۔

”میں نے عائشہ کے بارے میں اپنے گھروالوں کو لکھا تھا۔ اس پر میری می نے لکھا ہے کہ میں واپسی پر اسے اپنے ساتھ لیتی آؤں اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔“

”واقعی!“ بات ہی ایسی تھی کہ وہ بھی خوشی سے چلا پڑی۔

”دیکھنا، کہیں تمہارا دماغی توازن نہ بگڑ جائے۔“

”ارے! تم نے خبر ہی ایسی سنائی ہے اور اس وقت میں شدید تھکن کے باوجود کوئی

سوئیٹ ڈش بنانے جا رہی ہوں۔“

”واہ تم نے تو میرے دل کی کہہ دی لیکن پہلے عائشہ سے پوچھ لو کہ یہ کیا کھانا پسند کرے گی۔“

”کیوں عائشہ؟“ وہ دونوں جیسے ہی عائشہ کی طرف متوجہ ہوئیں تو اُسے دیکھ کر حیران

رہ گئیں۔ اُس کے گلابی رخسار سرخی مائل ہو گئے تھے۔ کھنی پلکوں کے پہرے میں جینوں آنکھوں میں اچانک سنہرے سچیلے سپنوں کی بارات اُتر آئی تھی۔

”ہم نے کہا تھا ناں عائشہ! کہ ہم صرف تعبیر دیں گے۔ خواب تم خود سجاؤ گی۔“

ندا اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔ ”اور سنو میری جان! ان خواب

جزیروں پر اس یقین کے ساتھ سفر کرنا کہ جس کے حوالے سے تم یہ خواب سجا رہی ہو، وہ کبھی تم سے ناफल نہیں ہوگا۔ تمہارے انتظار میں ایک ایک ہل گنتا ہوگا۔“

ایک مدھر مسکراہٹ نے آپ ہی آپ اُس کے ہونٹوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

”ہاں چلو۔“ تینوں اپنا اپنا سامان اٹھا کر چل پڑیں۔

ندا کی منزل کراچی تھی جبکہ اُسے لاہور جانا تھا۔ اُس کا خیال تھا۔ کراچی میں اُسے ریور کرنے ڈیڈی آئیں گے پھر وہ اُن کے ساتھ لاہور جائے گی لیکن کراچی میں ڈیڈی کی جگہ می کو دیکھ کر وہ حیران ہونے کے ساتھ بے طرح خوشی ہوئی۔ کتنی دیر وہ اُن سے لپٹی اُن کے وجود کی مہک سے اپنے آپ کو سیراب کرتی رہی تھی۔ اُس کے آنسو بے اختیار بہنے لگے تھے اور می بڑے حوصلے سے اس کی پٹہ پھکتی ہوئی اسے ہر سکون ہونے کی تاکید کر رہی تھیں۔ کافی دیر بعد وہ اُن سے الگ ہوتی ہوئی کہنے لگی۔

”میرے گمان میں بھی نہیں تھا می کہ آپ یہاں موجود ہوں گی۔“

”تمہارا باپ کسی ضروری کام سے اسلام آباد جا رہا تھا۔“ می کا لہجہ ویسا ہی تھا۔ ”اُس نے مجھے فون پر کہا کہ میں تمہیں لینے یہاں آ جاؤں۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آئیے میں آپ کو ندا سے ملواؤں۔“

وہ می کو لے کر ندا کے پاس آ گئی جو اپنے گھر والوں کے درمیان خاصی چمک رہی تھی۔ اور عائشہ جس کے چہرے کو الوہی کر نہیں چھو رہی تھیں کچھ کٹی کٹی سی کھڑے تھی۔ ندا نے اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کروایا۔ اس کی می بھی ندا اور اس کے گھر والوں سے بہت اچھی طرح ملیں۔

اُن کی لاہور کی فلائیٹ دو گھنٹے بعد جانی تھی۔ ندا کا کہنا تھا کہ وہ وقت کے لیے اُن کے ساتھ چلیں لیکن اتنا وقت نہیں تھا اس لیے می نے سہولت سے منع کر دیا۔ یوں کچھ وقت وہیں کھڑے رہنے کے بعد جب ندا اور عائشہ اُس سے رخصت ہونے لگیں تو ندا بار بار اُسے عائشہ کی شادی میں شریک ہونے کی تاکید کرتی رہی، اُس نے بھی وعدہ کر لیا تھا۔

جس وقت وہ می کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی عجیب کیفیت تھی، اتنا عرصہ وہ اس گھر سے دور رہی تھی تو اسے اس گھر کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ہر چیز اُسی طرح موجود تھی جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ہر قدم پر رُک کر ایک ایک چیز کو چھو کر کہنے لگی۔

”می! یہ وال کلاک ابھی تک چل رہا ہے۔ می یہ پردے بھی وہی ہیں۔ می لگتا ہے

آپ کو میری الماری کھولنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی تھی۔“ اور می اُس کی باتوں پر مسکراتی رہیں۔

”چلو، اب تم نہا دھو کر کچھ دیر آرام کر لو، میں جب تک تمہارے لیے کھانا بناتی ہوں۔“

”آپ کیوں تکلیف کریں گی، کھانا میں خود پکاؤں گی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”نہیں بیٹا! تم اتنی دور سے آئی ہو۔“

”آپ بھی تو میرے ساتھ آئی ہیں۔“

”تم سبھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم اتنے عرصے کے بعد آئی ہو۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ انہیں کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ”آپ آرام سے بیٹھیں، کھانا میں ہی پکاؤں گی۔“

پھر وہ کچن میں آ گئی۔ اُس ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بہت دنوں کے بعد یہاں آئی ہے۔ ہر چیز اُسی طرح اپنی جگہ موجود تھی کہ وہ آنکھ بند کر کے بھی اٹھا سکتی تھی۔

پکانے سے فارغ ہوئی تو نہانے چلی گئی۔ اُس کے بعد اُس نے می کے ساتھ بیڈ پر کھانا کھایا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔

”اب تم سو جاؤ۔“ می پیار سے اُس کی ٹھوڈی چھو کر کہنے لگیں۔ ”جب شام میں اٹھو گی تو میں تمہاری کامیابی پر تمہیں ایک خوبصورت سا گفٹ دوں گی۔“

”کیا دیں گی؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”ابھی نہیں بتاؤں گی، شام میں خود ہی دیکھ لیتا۔“ وہ مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ شاید بہت دنوں کے بعد گہری اور ہلکے سکون نیند سوئی تھی کہ شام گہری ہو کر سیاہی میں ڈھلنے لگی۔ تب بھی اُس کی آنکھ نہیں کھلی۔ وہ تو می نے آکر زبردستی اُسے اٹھایا۔

”بیٹا! کیا رات میں نہیں سوتا۔“ وہ ششے سے باہر دیکھتی ہوئے کہنے لگی۔

”رات تو ہو رہی ہے۔“

”تم دوپہر سے سو رہی ہو۔“

”ارے.....“ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ”آپ مجھے پہلے اٹھا دیتیں۔“

”بہت مرتبہ تمہارے کمرے میں آئی۔ تمہیں اٹھانے کی کوشش بھی کی لیکن تم انھیں ہی نہیں۔“

”سوری می!“

”کوئی بات نہیں اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“ می چلی گئیں تو وہ بھی مسہری سے اتر آئی۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد اُس نے بالوں میں برش کیا اور کمرے سے نکل آئی۔ می چائے لے کر آ رہی تھیں۔ وہ اُن کے ہاتھ سے مگ لے کر ٹی وی الاؤنچ ہی میں بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد می اس کے پاس آ کر کہنے لگیں۔

”بیٹا! اس وقت مسز ہدانی نے مجھے بلایا تھا لیکن تم سو رہی تھیں اس لیے میں نہیں جا سکی۔ اب ذرا میں اُن کی بات سن آؤں۔“

”جی می!“

”آؤ، تم دروازہ بند کرلو۔ میں بس ابھی آ جاؤں گی۔“

وہ اٹھ کر اُن کے ساتھ چل پڑی۔ می کے جانے کے بعد اُس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور واپس آ کر ابھی بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ کال بیل بجنے لگی۔ اُس کا خیال تھا۔ می ہی ہوں گی جنہیں اچانک کوئی بات یاد آگئی ہوگی۔ اس نے جلدی سے آ کر وہ کسی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔

”آپ!“ اُس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گی۔“

ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے ہمیشہ والا جملہ دہرایا لیکن اُس نے ہمیشہ کی طرح فوراً دروازے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ نہیں دیا بلکہ دروازے پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔“

اُس کی آنکھوں کی مخصوص چمک ایک دم ہی ماند پڑ گئی اور وہ خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”کیوں؟“

”ممی پتا نہیں کیا سوچیں اور ہو سکتا ہے، وہ خفا بھی ہوں۔“

”لیکن میں خود سے تو نہیں آیا۔“

”پھر.....؟“

”کیا یہیں کھڑے کھڑے بتا دوں۔“ وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

”خولہ.....!“ وہ اُسے دیکھتا ہوا اندر آ گیا۔

”شہروز پلیر، چلے جاؤ۔“ وہ لبتی لبتی لہجے میں بولی تو اُس نے پلٹ کر اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”سنو، مجھے تمہاری می نے بھیجا ہے۔“

”کیا.....؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔“

”ناممکن بھی نہیں ہے۔“

”لیکن کیسے.....؟“

”میں نہیں جانتا۔“ وہ انجان بن گیا۔ ”ابھی جب میں آ رہا تھا تو تمہاری می سے ملاقات ہوئی انہوں نے مجھ سے کہا تم اوپر چل کر میرا انتظار کرو، میں ابھی آ رہی ہوں اور۔“

”اور کیا؟“ وہ بے تابلی سے پوچھنے لگی۔

”اور انہوں نے یہ پرچہ دیا ہے کہ تمہیں دے دوں۔“ اُس نے جیب سے تہہ شدہ کاغذ نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

”پہلے اسے تو دیکھ لو۔“ اس نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا تو وہ پہلے چونکی پھر اُس کی طرف سے پٹھہ موڑ کر تہہ شدہ کاغذ کھول کر دیکھنے لگی۔ ہیڈ رائیٹنگ می کی تھی۔ لکھا تھا۔

تمہاری کامیابی پر میری طرف سے تحفہ شہروز جنوعہ کی صورت۔ کہو کیا ہے؟

وہ ایک دم پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے کہنے لگا۔

”خاکسار کو شہروز جنوعہ کہتے ہیں۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”کیا سمجھنا چاہتی ہو.....؟“

”پتا نہیں۔“ وہ اُلجھتی ہوئی اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر جیسے ہی اندر جانے لگی۔ اُس نے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لیا۔

”سنو، یہ سب نندا اور عائشہ کا کمال ہے۔“

”لیکن وہ تو کہہ رہی تھیں کہ میرے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہی۔“

”تم اسے سازش کہتی ہو۔“

”پھر اور کیا کہوں؟“

”عجیب لڑکی ہو، ایک تو انہوں نے اتنی مشکل سے تمہاری می کو یہ یقین دلایا کہ تم میرے بغیر مری جا رہی ہو۔“

”کیا.....؟“ وہ چیخ پڑی۔ ”انہوں نے یہ سب لکھا تھا می کو۔“

”میرا خیال ہے۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔

”اس کا مطلب ہے، تم بھی اُن کے ساتھ اس سازش میں شریک رہے ہو۔“

”بجنا نہیں۔“

”جھوٹ کہتے ہو تم۔“ وہ چیخ پڑی۔ ”تم سب نے مجھے می کو منہ دکھانے کے قابل نہیں

چھوڑا۔“

”لیکن خولہ!“

”میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی، تم چلے جاؤ یہاں سے۔“ وہ اپنے آپ میں

نہیں رہی تھی۔ اُسے دروازے کی طرف دھکیلنے لگی تو اُس نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو، پہلے میری بات سنو۔“

”میں نے کہا ناں مجھ کچھ نہیں سننا۔ تم جھوٹے سازشی جاتے کیوں نہیں۔“

”خولہ.....!“ ”می اندر آتے ہوئے اس سے کہنے لگیں۔“ گھر آئے مہمان کے ساتھ

یہ کیسا سلوک کر رہی ہو۔“

”می!“ وہ اُس کی گرفت سے اپنے ہاتھ چھڑا کر می کے کندھے سے جا لگی۔ ”می! ندا

اور عائشہ نے آپ کو جھوٹ لکھا تھا میں بالکل بھی اس کے لیے نہیں مری جا رہی تھی میرا یقین

کر میں می۔“

”کیا کہہ رہی ہو بیٹا؟“ ”می متعجب تھیں۔“ ”ندا اور عائشہ نے تو مجھے ایسی کوئی بات نہیں

لکھی، بلکہ ان دونوں نے سرے سے مجھے خط لکھا ہی نہیں۔“

”ہیں!“ اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔

”تم شاید اس بات پر حیران ہو رہی ہو کہ میں نے شہروز کا پروڈیوٹر کیونکر منظور کیا؟“

وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارے ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔“

”لیکن میں نے اس بات سے انکار کیا تھا۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”ہاں، شاید تم نے میری خاطر انکار کیا تھا۔“

وہ شپٹا گئی۔

”بیٹا اگر تم اس وقت بھی مجھے حقیقت لکھ دیتیں تو میں کبھی انکار نہ کرتی کیونکہ مجھے

تمہاری خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔“

”می۔“ وہ اُن سے نظریں پڑاتے ہوئے بولی۔ ”ڈیڈی نے آپ سے کیا کہا تھا؟“

اُس کی بات پر وہ ہلکے سے مسکرائیں پھر کہنے لگیں۔

”کچھ نہیں، صرف اتنا بتایا تھا کہ انہوں نے تمہاری ہتھیلی پر حنا سے لکھا شہروز کا نام خود

اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور تمہارا باپ کچھ بھی سہی، جھوٹ کبھی نہیں بولتا، اتنا مجھے یقین

ہے۔“

وہ گہرا کر شہروز کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں میں

دباتے ہوئے ایک آنکھ بند کر لی۔

”میرے خدا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ می کے کندھے پر پیشانی ٹکاتے ہوئے اُس

نے سوچا۔

”چلو اگر تم دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے تو اُسے دور کر لو، میں جب تک کھانا

نکالتی ہوں۔“ می اُس کا گال تھپکتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئیں تو وہ ایک دم بہت زیادہ نروس

ہو گئی۔

”خولہ!“ وہ قدم بڑھا کر اُس کے سامنے آ گیا۔ ”مجھے شروع ہی سے حنا کی مہک سے

عشق رہا ہے۔ اور تمہاری ہتھیلی پر اپنا نام سجاتے ہوئے میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حنا

میری محبتوں کا قرض یوں چکائے گی۔“ وہ چپ رہی۔

”سنو، وقت کی گرد نے تمہاری ہتھیلی پر لکھا میرا نام ضرور مٹا دیا ہو گا لیکن مجھے یقین ہے کہ حنا کی مہک اب بھی نہ صرف تمہاری ہتھیلی میں بلکہ تمہاری سانسوں میں بھی رچی بسی ہوگی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ گنگنائی اور اپنی ہتھیلی اس کے سامنے کر دی جسے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹوں سے چھولیا اور اس کی ہتھیلی میں رچی بسی حنا کی مہک اُسے بے خود کر گئی۔

☆☆☆

اک دُعا نے بچا لیا ہے

اتنی تھکن کے باوجود وہ سارے پھیلاوے سینے میں لگ گئی۔ امی نے کہا بھی کہ صبح کر لیں گے لیکن وہ نہیں مانی، کیونکہ صبح اس کا جلدی اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ امی اکیلی سب سیٹتی پھریں، اس لیے وہ اس وقت تک اپنے بستر میں نہیں گئی جب تک سب سمیٹ کر برآمدے سے آنگن تک سب صاف ستھرا نہیں کر دیا اور جب اپنے بستر پر لیٹی تو حقیقتاً اُس کی چیخ نکل گئی تھی، شاید اکڑی ہوئی کمر کو سیدھا کرنے میں تکلیف ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لحاف میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کسی بھی غیر اختیاری حرکت پر وہ بے اختیار ہنستی تھی خواہ اس میں ہنسنے کا کوئی پہلو نہ ہو۔ بہر حال اتنے دنوں سے گھر میں بھائی جان کی شادی کا ہنگامہ تھا اور آج ویسے کی تقریب پر گویا اس ہنگامے کا اختتام ہوا تھا۔ اس لیے وہ سارے کام نمٹا کر اب اس اطمینان سے لیٹی تھی کہ صبح اپنی مرضی سے اٹھے گی۔ اور اس کی صبح دو پہر بارہ ایک بجے سے پہلے ممکن نہیں تھی کیونکہ سونے میں تین تو بج ہی گئے تھے۔

”رومی! ارے رومی! جلد اٹھو۔“ آٹھ بجے ہی چھوٹے بھائی نے اس کے سر سے لحاف کھینچ کر جھنجھوڑا تو وہ چیخ پڑی۔

”کیا مصیبت ہے۔ میں نہیں اٹھ رہی۔“ اس نے دوبارہ منہ چھپانا چاہا لیکن چھوٹے بھائی نے سارا لحاف کھینچ لیا۔

”بھائی! ایمان سے میں رات تین بجے سوئی تھی، بہت تھکی ہوئی ہوں تھوڑی دیر اور سونے دیں۔“ وہ نیند سے بھری آنکھوں کو بند کرتی کھولتی عاجزی سے بولی۔

”بھائی کی زندگی خراب کر کے خود چین سے سونا چاہتی ہو۔ ہرگز نہیں۔“ چھوٹے بھائی نے پتا نہیں کیا کہا تھا۔ اس کی نیند بھک سے اڑ گئی۔

”کیا، کیا کہا آپ نے؟ کس کی زندگی خراب کی ہے میں نے.....؟“

”بھائی جان کی دلہن تم نے پسند کی تھی نا؟“

”ہاں اور بھائی جان بہت خوش ہیں۔ کل دیکھا نہیں تھا، کیسے اترائے اترائے پھر رہے تھے۔“ اس نے فوراً اعتراف کے ساتھ کہا تو چھوٹے بھائی منہ بنا کر بولے۔

”خوش۔ پیارے صورت دیکھ کر خوش ہو گئے ہوں گے۔“

”جی نہیں، عادت کی بھی بہت اچھی ہیں بھابھی، پورا ایک سال تک ان کے ہاں آنا جانا رہا ہے اور ان کی صورت سے زیادہ مجھے سیرت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ جب ہی میں نے انہیں بھائی کے لیے پسند کیا۔ اگر مغرور، تک چڑھی ہوئیں تو میں کبھی امی کو لے کر نہ جاتی۔ وہ ان کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

”تمہارا مطلب ہے۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔“ چھوٹے بھائی کے غصے پر وہ عادت کے مطابق ہنستی ہوئی بولی۔

مجھے تو اب تک یہ پتا نہیں چلا کہ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔

میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ بھابھی بیگم انتہائی مغرور، تک چڑھی اور جانے کیا کچھ ہیں۔“

”یہ ایک ہی دن میں آپ کو ان کے بارے میں اتنا کچھ کیسے معلوم ہو گیا جبکہ آپ کی تو ابھی ان سے باقاعدہ ملاقات بھی نہیں ہوئی ہوگی۔“

”ہو چکی ابھی ابھی۔“ چھوٹے بھائی جل کر بتانے لگے۔ خاتون، امی کے ساتھ کچن میں کھڑی تھیں۔ میں نے سلام کیا تو انتہائی نروٹھے پن سے جواب دیا۔ پھر میں نے کہا بھابھی آپ کے تو یہ دن عیش کرنے کے ہیں یہاں کچن میں کیا کر رہی ہیں۔ اس پر انتہائی ناگواری سے بولیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔“

”نہیں بھائی!“ اسے یقین نہیں آیا۔

”ہاں بہن! جاؤ ان کا یہ اصلی روپ تم بھی دیکھ آؤ۔“ ان کے انداز پر پھر ہنسی اور لحاف کھینچ کر اپنے اوپر ڈالتے ہوئے بولی۔

”اب جب ساری زندگی ہی دیکھنا ہے تو کچھ دیر نہ دیکھنا اچھا۔“

چھوٹے بھائی اس کے لحاف پر زور دار گھونسا جھاتے اٹھ کر چلے گئے۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی لیکن لحاف کی گرمی سے کچھ دیر میں سو بھی گئی۔

پھر دوپہر میں امی کے اٹھانے پر بھی وہ نہیں اٹھی، اس کے بعد جب بھابھی نے بہت پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اٹھایا تو وہ نہ صرف اٹھ گئی بلکہ بہت حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔ بھی تم ہی تو اتنی چاہ سے مجھے بھادج بنا کر لے آئی ہو۔“

بھابھی کی نرم ودھیمی مسکراہٹ پر اس نے بے اختیار ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

”میں یقین کر رہی تھی کہ آپ واقعی اس گھر میں آ چکی ہیں۔“

”اب آ گیا یقین۔“ بھابھی نے اس ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

”چلو اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔ کیونکہ کھانا لگ چکا ہے۔“

”بس ابھی آئی۔“ وہ چٹکی بجاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈرائنگ روم میں ایک صرف چھوٹے بھائی موجود نہیں تھے اور ان کی غیر موجودگی اس نے فوراً یوں محسوس کی کہ ان کی صبح والی باتیں سوچتی آئی تھی جن کی ابھی نفی ہو گئی تھی۔ جس سے وہ یہی سمجھی کہ انہوں نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے اور کیونکہ اس کا چھوٹے بھائی سے مذاق چلتا تھا۔ اس لیے وہ ہنس کر سب کو بتانے لگی۔

”سچ امی! چھوٹے بھائی نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ ایسا خوفناک نقشہ کھینچا بھابھی کا اور

انتہائی سنجیدگی سے، مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔“

”وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ میں واقعی خوفناک ہوں۔“ بھابھی نے مسکرا کر کہا۔

”خوفناک ہوئیں تو جب آپ مجھے اٹھا رہی تھیں تب میں آپ کو دیکھتے ہی چیخ مار کر

بے ہوش جاتی۔ اس کے برعکس مجھے لگا جیسے میں پریوں کے دیس میں آ گئی ہوں۔“

اس نے پوری ایمانداری سے بھابھی کی تعریف کی تھی۔ یوں بھی وہ بہت پہلے سے

ان کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے جب اس نے کالج میں ایڈمیشن لیا تھا تو وہاں

سب سے پہلے اس کی عاصمہ سے دوستی ہوئی تھی جس کا گھر کالج کے قریب ہی تھا اور عاصمہ

کے اصرار پر ایک روز وہ اس کے گھر گئی تو اس کی باجی شبنم کو دیکھ کر اسے لگا تھا جیسے وہ کسی اور خوب صورت دنیا کی باسی ہوں۔ گلابی رنگت پر سبک ساناک نقشہ، اس پر دھیسے لہجے میں بات کرنا، وہ تو اسی وقت ان کی دیوانی ہو گئی تھی اور پھر صرف انہیں دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کے شوق میں وہ اکثر کالج سے نکلتی تو عاصمہ کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی۔ اس وقت اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ انہیں اپنی بھابی بنائے گی اور جب بھائی جان کے لیے لڑکی دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت اتفاق سے اس کے فرسٹ ایئر کے امتحان ہو رہے تھے، اس لیے اسے بس یہ پتا ہوتا تھا کہ امی کہیں نہ کہیں جا رہی ہیں۔ آپنی نے بھی اپنی سرال میں ایک دو لڑکیاں بتائی تھیں۔ امی وہ بھی دیکھ آئیں اور ایک روز جب امی اور آپنی سب دیکھی ہوئی لڑکیوں میں ایک کا انتخاب کرنے بیٹھی تھی۔ تب اچانک اسے عاصمہ کی باجی کا خیال آیا تھا اور وہ اسی وقت امی کو اس کے گھر لے گئی تھی۔

اسے یقین تھا کہ امی نے اب تک جتنی لڑکیاں دیکھی ہیں ان میں کوئی ایک بھی شبنم جیسی نہیں ہوگی اور واقعی امی نے نہ صرف اس بات کا اعتراف کیا بلکہ اس وقت تک جین سے نہیں بیٹھیں جب تک شبنم کے لیے ہامی نہیں بھروالی تھی اور وہ زیادہ خوش یوں تھی کہ جنہیں دیکھنے کے لیے بھاگ بھاگ کر ان کے گھر جانا پڑتا تھا۔ وہ آپ اس کے گھر میں آ گئی تھیں۔ شبنم بھابی کا ابھی ابھی وہی انداز تھا، دھیسے لہجے میں بات کرتیں اور ہمہ وقت ایک نرم مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیلی رہتی۔ حقیقتاً بہت محبت کرنے والی تھیں اور آتے ہی گھر کے کام کاج میں امی کا ہاتھ بھی بٹانے لگی تھیں، امی لاکھ منع کرتیں لیکن ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ انہیں بالکل اچھا نہیں لگتا کہ امی کام کریں اور وہ آرام سے بیٹھی رہیں۔ بہر حال اتنی نیک سیرت بہو سے سب ہی خوش تھے سوائے چھوٹے بھائی کے انہیں ابھی بھی یہ شکایت تھی کہ بھابی ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ جس پر کوئی بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا اور اس وقت تو وہ چھوٹے بھائی سے باقاعدہ الجھ رہی تھی۔

”آخر آپ کو ان کا انداز دھکا کیوں لگتا ہے، جبکہ میں نے تو کبھی ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا ہوتے نہیں دیکھی۔“

”دوغل ہیں وہ تمہارے سامنے ہنستی ہیں اور مجھے دیکھتے ہی پیشانی پر بل ڈال لیتی ہیں۔ تم کبھی غور کرو تو پتا چلے۔“ چھوٹے بھائی سخت شاک کی تھے۔

”اچھا اب میں غور کروں گی لیکن آپ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات نہ کہہ دیجئے گا جو واقعی ناگوار گزرنے والی ہو۔“ اس نے کہا تو چھوٹے بھائی خفگی سے بولے۔

ارے میں ایسی کوئی بات کیوں کروں گا۔ وہ ہماری بڑی بھادج ہیں۔ ان کی عزت و احترام میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ عمر میں، میں بے شک ان سے بڑا ہوں لیکن کہلاؤں گا چھوٹا دیور۔“

”اچھا خاموش ہو جائیں۔ بھابی آرہی ہیں۔“ بھابی کو آتے دیکھ کر اس نے دھیمی آواز میں کہا پھر فوراً ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”آئیے بھابی! کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کریں۔“

”اس وقت نہیں بیٹھ سکتی کیونکہ چولہے پر دودھ رکھ کر آئی ہوں۔ بس جلدی سے یہ بتاؤ کہ چائے کے ساتھ تم لوگ کچھ کھانا پسند کرو گے؟“ بھابی بہت عجلت سے بولیں تو وہ چھوٹے بھائی کو دیکھنے لگی۔

”آپ بتائیں بھابی!“

”ارے بھابی جو کھلا دیں کھالیں گے۔“ چھوٹے بھائی نے کہا تو بھابی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

”اچھی بات ہے۔“

”اب بتائیے۔“ بھابی کے جاتے ہی اس نے چھوٹے بھائی کو ٹوکا۔ ”ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے یا شعلے نکل رہے تھے؟“

”تمہارے سامنے ایسی ہیں۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ درمیان میں بول پڑی۔ ”میری بھلا حیثیت ہی کیا ہے وہ مجھ سے خائف ہوں گی۔ مجھ سے تو آپنی کے بچے بھی نہیں ڈرتے۔ جتنا رعب ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں اتنا سر چڑھتے ہیں۔“

”تم رعب ڈالنے کے ساتھ ہنستی جو ہو اور بچوں میں بچہ بھی بنی رہتی ہو۔“

”بہر حال آپ بھابی کو غلط سمجھ رہے ہیں جبکہ ان کے بارے میں امی کا یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ ایسی نیک، پاک باز اور محبت کرنے والی بہو قسمت والوں کو ہی ملتی ہے اور اس معاملے میں امی خوش قسمت ترین خاتون ہیں۔“ وہ کہتی ہوئی چھوٹے بھائی کے پاس سے

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ اب چھوٹے بھائی کی باتوں پر دھیان نہیں دیتی تھی اور زیادہ وقت بھابھی کے ساتھ لگی رہتی۔ بلکہ بھابھی خود ہی اسے اپنی ساتھ لگائے رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ بچن کے کاموں میں بالکل اناڑی تھی۔ ایک چائے بھی بناتی تو پورا سامان پھیلا دیتی تھی اور بھابھی نے بہت طریقے سے اسے ٹرینڈ کرنا شروع کیا تھا۔ خاص طور پر اس سے کوئی کام نہیں کہتی تھی۔ بس باتوں باتوں میں کچھ نہ کچھ اس کے ہاتھوں میں تھما دیتیں۔

”یہ پیاز کاٹ دو۔ میں جب تک گوشت دھو لوں۔“

”اف! تمہارے بھائی جان تو آتے ہی کھانا مانگیں گے اور ابھی آنا بھی گوندھنا ہے۔“ وہ اپنے آپ آنا نکال کر گوندھنے لگی۔

”نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ تم ذرا سالن بھون دو روٹی! میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“ اور اسے ہتا بھی نہیں چلتا تھا کہ اس نے کھڑے کھڑے اتنے کام کر لیے ہیں۔ ورنہ امی تو ذرا سا بچن میں جھانکتے کو کہتی تھیں اور وہ صاف منع کر دیتی تھی۔ اصل میں وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس لیے بھی ذرا لاڈلی تھی۔

پھر ایک تو اس کے مزاج میں شوخی کے ساتھ کچھ لا پرواہی تھی۔ دوسرے ہلا گلا پسند کرتی تھی۔ جب آپنی کے بچے آتے اس وقت سارے گھر میں بس اس کی آواز اور قہقہے سنائی دیتے تھے۔ اس وقت بھابھی اس پر سالن بھوننے کی ذمہ داری ڈال کر نماز پڑھنے گئی تھیں کہ آپنی آگئیں اور بچوں کی آواز سننے ہی وہ چولہا بند کیے بغیر بھاگی آئی تھی۔

”خالہ! میں فرسٹ آیا ہوں۔“ کاشی نے اسے دیکھتے ہی چیخ کر بتایا۔

”ارے واہ واہ! پھر تو مٹھائی بھی لائے ہو گے؟“ وہ کاشی کو اٹھا کر اسے گول گول چکر دیتی ہوئی اس سے اونچی آواز میں بولی۔

”ثانی لایا ہوں اچھی والی۔“ کاشی نے کہا تو وہ ایک دم رک گئی۔

”ہٹو کجوس! اتنی بڑی خالہ کے لیے اتنی سی ثانی۔“

”کتنی بڑی؟“ عقب سے دولہا بھائی نے اس کی چوٹی کو جھٹکا دے کر کہا تو وہ چیخ

پڑی۔

”آپ سے بات نہیں کر رہی۔“

”واقعی پھر تو میری بچت ہو گئی۔“ دولہا بھائی نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”چلو بچو! خالہ ہمارے ساتھ نہیں جا رہیں۔“

”کہاں.....؟“ اس نے فوراً پوچھا تو دولہا بھائی انجان بن کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

”میں فرسٹ آیا ہوں ناں خالہ! ابو کہہ رہے تھے۔ ہمیں بہت ساری سیر کرائیں گے اور مٹھائی بھی کھلائیں گے۔“ کاشی کے بتانے پر وہ اچھل پڑی۔

”ہاں تو میں چل رہی ہوں ناں۔ بس ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔“ اس نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

کچھ دیر بعد جب وہ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی تو سارے بچن میں دھواں پھیلا تھا اور سب کھانے رہے تھے۔ پھر بھی اسے یاد نہیں آیا کہ وہ سالن بھوننے میں چھوڑ آئی تھی۔ کھانستے ہوئے پوچھنے لگی۔

”یہ دھواں کیسا ہے؟“

”تمہاری کارستانی ہے، ذرا سا سالن نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ کم از کم چولہا ہی بند کر دیتیں۔“ امی نے اسے بری طرح ڈانٹنا شروع کیا۔

”چولہا بند کرنے کو تو نہیں کہا تھا بھابھی نے۔“ وہ بسور کر بولی۔

”تمہیں خود عقل نہیں ہے۔ بس خالی کھی کھی آتی ہے یا سیر سپاٹے چاہئیں تمہیں۔ کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی۔“ امی سخت غصے میں اور اس کا موڈ بھی خراب ہو گیا وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ پھر لاکھ کاشی نے اس کا دروازہ پیٹا آپنی نے کتنی بار آ کر پکارا لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا حالانکہ اس کی ناراضگی زیادہ دیر کی نہیں ہوتی تھی پتا نہیں اس وقت کیا ہو گیا تھا جو وہ کان بند کیے بیٹھتی تھی۔ پھر رات کے کھانے پر جب بھابھی نے دھمکی دی کہ اس کے بغیر وہ بھی کھانا نہیں کھائیں گی تب دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

”دیکھا، کیسا پریشان کیا سب کو۔“

”تو تم جان بوجھ کر پریشان کر رہی تھیں۔ بہت بری بات ہے۔ آپنی بھی ناراض ہو کر

گئی ہیں۔“ بھابھی نے ویرج نے سرزنش کی۔

”امی کو نہیں دیکھا تھا آپ نے، سب کے سامنے ڈانٹ کر رکھ دیا۔“

”غلط تو نہیں ڈانٹا تھا۔ خیر چلو کھانا کھاؤ۔“ بھابھی بھی بات ختم کرتی آگے بڑھ گئیں تو وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑی کہ ان کی بات نالنا اختیار میں نہیں تھا یا شاید وہ موقع ہی نہیں دیتی تھیں۔ جانے کیسا سحر تھا ان کی شخصیت میں کہ گھر کا کوئی فرد ان کی کسی بات سے اختلاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ چھوٹے بھائی بھی نہیں جو ابھی بھی انہیں مغرور اور دوغلی کہتے تھے۔ جس پر وہ پہلے ان کے ساتھ الجھ پڑتی تھی اور اوھر کچھ عرصے سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اسے برا بہت لگتا تھا کیونکہ اس چھ ماہ میں اس نے تو بھابھی میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی تھی۔ کبھی امی سے اونچی آواز میں نہیں بولیں۔ نہ اس پر کوئی تنقید اور جب آپلی آئیں تب بھی ان کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آتا تھا بلکہ ان کے بچوں کے کام بھی کر دیتی تھیں۔ پھر پتا نہیں چھوٹے بھائی کس حساب سے انہیں ایسا کہتے تھے۔ بہر حال ان کے کہنے یا سمجھنے سے گھر میں کوئی رنجش نہیں ہوئی تھی اور شاید اس کا کریڈٹ بھی بھابھی کو جاتا تھا جو چھوٹے کی اکثر الٹی سیدھی باتوں کو یکسر نظر انداز کر دیتی تھیں۔

☆☆☆

یونہی کتنے دن گزر گئے۔ وہ امتحانوں سے فارغ ہوئی تو اس دن آپلی کے گھر جانے کو تیار ہو گئی۔ کیونکہ اتنے دنوں سے گھر میں کوئی ہلاک نہیں ہوا تھا اور کہیں جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اب فارغ ہوئی تھی تو آرام سے بیٹھنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ پہلے تو چھوٹے بھائی کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاتے تھے لیکن اب ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ امی کے سر ہو گئی کہ اسے آپلی کے ہاں چھوڑ آئیں، وہ کچھ دن وہیں رہے گی اور امی کو اس کے جانے پر نہیں وہاں رہنے پر اعتراض تھا۔

”وہاں رہنے کی کوئی تک نہیں ہے، بس شام تک واپس آ جانا۔“

”کیوں واپس آ جانا۔ اتنے دنوں بلکہ مہینوں کے بعد جا رہی ہوں آپلی بھی نہیں آنے دیں گی۔“ وہ کہتی ہوئی تیار ہونے چلی گئی اور جب واپس آئی تو ہاتھ میں بیگ بھی تھا جسے دیکھ کر بھابھی تعجب سے پوچھنے لگیں۔۔۔

”تو تم واقعی وہاں رہو گی.....؟“

”جی ہاں، کیونکہ اب مابدولت کی چھٹیاں ہیں۔“ وہ اتر کر بولی۔

”چھٹیوں کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اپنا گھر چھوڑ کر۔“

”ارے بھابھی! وہ بھی اپنا گھر ہے۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔ ”دولہا بھائی کوئی

غیر تھوڑی ہیں اپنے چچا زاد ہیں۔“

”ہوں۔“ بھابھی سر ہلا کر رہ گئیں۔

آپلی سے زیادہ کاشی اور چنگی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے اور جب اس نے بتایا کہ وہ کچھ دن ان کے پاس رہے گی تو دونوں اچھل اچھل کر تالیاں بجانے لگے۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ مل گئی۔

”یہی باتیں مانگتی ہے یہ، بھلا بتاؤ اتنی بڑی ہو گئی۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔“ امی، آپلی

سے کہہ رہی تھیں۔

”کوئی اتنی بڑی نہیں ہوئی۔ یہی تو دن ہوتے ہیں پھر کہاں زندگی میں فرصت ملتی

ہے۔“ آپلی نے اس کی طرف واری میں کہا۔

”لڑکیوں کے یہ دن گھر داری سیکھنے کے ہوتے ہیں۔“

”فکر نہیں کریں، سیکھ جائے گی سب، ابھی بھی بہت کچھ کر لیتی ہے۔ ایک صرف کھانا

پکانا نہیں آتا۔ کچھ دن بھابھی کے ساتھ لگا دیں گی تو اس کام میں بھی ماہر ہو جائے گی۔“

”یہ آپ دونوں میرے خلاف کیا سازش کر رہی ہیں.....؟“ وہ دھم سے امی اور آپلی کے درمیان گرتی ہوئی بولی۔

”امی کہہ رہی ہیں۔ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔“ آپلی نے اس کے پہلو میں

چنگی کاٹ کر کہا تو وہ اچھل پڑی۔

”جی نہیں، پہلے چھوٹے بھائی کی ہوگی، وہ بڑے ہیں مجھ سے۔“

”بھائی جان بھی مجھ سے بڑے تھے لیکن پہلے میری ہوئی۔“

”کچھ بھی ہو، میں نہیں کروں گی۔“ وہ لاپرواہی سے کہتی اٹھ کر چنگی کے پیچھے بھاگ

گئی۔

پھر شام میں جاتے ہوئے امی اسے بہت تاکید کر گئی تھیں کہ دو دن بعد وہ آپلی اور دولہا

بھائی کے ساتھ آجائے ورنہ وہ چھوٹے بھائی کو بھیج دیں گی اور اس نے کوئی ٹکرا نہیں کی تھی۔ البتہ ان کے جانے کے بعد کاشی اور پنکی کو سمجھا دیا کہ جب بھی وہ جانے کی بات کرے دونوں نے رورو کر گھر سر پر اٹھالینا ہے۔ اس طرح وہ بہت سارے دن ان کے پاس رہے گی اور بچے تو چاہتے ہی یہی تھے۔

یہ یہیں تھا کہ وہ اپنے گھر سے فرار چاہتی تھی بس اتنے دنوں سے جو امتحان کا ہوا تھا اس سے نکل کر اب وہ کچھ دن انجوائے کرنا چاہتی تھی بلکہ تھوڑی عیاشی، جس کی گھر میں اجازت نہیں تھی۔ یعنی وی سی آر، اور اسے جتنا گھومنے پھرنے کا شوق تھا اتنا ہی فلمیں دیکھنے کا اپنے گھر میں پہلے تو صرف بھائی جان وی سی آر کے خلاف تھے مزید بھی ان سے دو ہاتھ آگے نکلیں کہ وہ ٹی وی پروگرام بھی نہیں دیکھتی تھیں اور یہاں ایسا کوئی قصہ نہیں تھا۔ آپنی بھی اس کے شوق سے واقف تھیں اس لیے رات میں جب سونے جانے لگیں تو اسے ایک فلم لگا کر اور دوسری تھا کر گئی تھیں۔

اور وہ دونوں فلمیں دیکھ کر سوئی تھی۔ اس لیے اگلے دن دوپہر تک سوتی رہیں۔ پتا نہیں آپنی نے اسے اٹھایا تھا کہ یہیں اس کی آنکھ تیل کی آواز پر کھلی تھی۔ جانے کون تھا جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ بٹن دبا کر ہاتھ ہٹالینا چاہیے۔ اس نے پہلے لیے لیے آپنی کو دو بٹن آوازیں دیں جواب نہیں آیا تب بے حد جھنجھلا کر گیٹ پر آئی تھی۔

”اے مسٹر!“ دوسری سمت دیکھتے شخص کو اس نے انتہائی بدتمیزی سے مخاطب کیا جس کی انگلی ابھی بھی تیل کے بٹن پر تھی۔ آواز پر فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ مزید گویا ہوئی۔

”صلیے سے تو پڑھے لکھے شریف آدمی نظر آ رہے ہیں، پھر یہ کیا حرکت ہے۔“

”جی۔“ وہ سمجھا نہیں۔

”برائے مہربانی بٹن پر سے انگلی ہٹالیں۔ مجھ سمیت تمام محلے والے جاگ گئے ہیں۔“ اس نے ہنوز سابقہ انداز میں کہا تو وہ شپٹا کر ہاتھ نیچے گرایا ہوا بولا۔

”اوہ سوری۔“

”ساری نیند خراب کر کے رکھ دی اور۔ خیر کس سے ملنا ہے.....؟“

”آذر صاحب کا گھر یہی ہے؟“ وہ اس کے اکھڑ لہجے سے پریشان ہو گیا تھا۔

”یہی ہے، لیکن اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں۔ شام میں آئیے گا۔“ اپنی طرف سے وہ

بات ختم کر کے گیٹ بند کرنا چاہتی تھی کہ وہ فوراً بول پڑا۔

”ایک منٹ پلیز، آپ ان کی مسز.....؟“

”کیا۔“ وہ دھاڑی۔ ”میں آپ کو مسز نظر آتی ہوں اور وہ بھی آذر بھائی کی۔ شرم نہیں آتی۔“

”آئی ایم سوسوری۔ آپ پلیز کسی اور کو بلا دیں.....“

”اور کوئی ہوتا تو مجھے گیٹ کھولنے آنا پڑتا؟“

”لیکن آذر صاحب نے تو مجھے اسی وقت بلایا تھا۔“ وہ گھڑی دیکھتا ہوا یوں بولا جیسے اس کی بات کا یقین نہ کر رہا ہو۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ وہ اپنا لہجہ بدلنے پر تیار ہی نہیں تھی۔ اس شخص نے سر تا پا اسے دیکھا پھر ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”اوکے، وہ آئیں تو۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس وقت دولہا بھائی کی گاڑی آ کر رکی تھی۔

”آگئے آذر بھائی۔“ وہ کہتی ہوئی اندر آگئی اور منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اسے آپنی کا خیال آیا اور یہ کہ وہ کہیں نظر نہیں آئیں۔

”رومیلا! رومی!“ دولہا بھائی پتہ نہ رہے تھے۔ وہ جلدی سے ٹل بند کر کے واش روم سے نکل کر آئی تو پوچھنے لگے۔ ”تمہاری آپنی نہیں آئیں ابھی تک؟“

”کہاں گئی ہیں.....؟“ وہ الٹا ان سے پوچھنے لگی۔

”بچوں کو اسکول سے لینے گئی ہوں گی۔“

”مجھے اکیلا چھوڑ کر اور وہ بھی سوتا ہوا اگر کوئی آ کر مجھے قتل کر دیتا تو اس وقت یہاں میری لاش پڑی ہوتی۔ اف میں نہیں رہوں گی یہاں، مجھے ابھی گھر چھوڑ کر آئیں۔“ وہ ایک دم سے تصور کر کے بولنے لگی تھی۔

”اگر تم فوراً خاموش نہیں ہوئیں تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“ دولہا بھائی نے ڈانٹ کر اسے چپ کرایا پھر کہنے لگے۔ ”ایک شریف آدمی سے بدتمیزی سے پیش آ کر تم نے جاہل اور گنوار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔“

”جی نہیں، میں کوئی جاہل گنوار نہیں ہوں بلکہ وہ ہے جسے آپ شریف آدمی کہہ رہے

ہیں۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”شٹ اپ، خبردار جو۔“

”آپی!“ آپنی کو آتے دیکھ کر وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ ”دولہا بھائی کو دیکھیں کس بری طرح ڈانٹ رہے ہیں۔ میرے مہمان ہونے کا خیال بھی نہیں کر رہے۔“

”لیجیے یہ مہمان ہو گئیں۔ چھوڑو اسے اور جلدی سے کھانا کراؤ، میرا مہمان آچکا ہے۔“

دولہا بھائی کہتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے تو آپنی اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

”جاؤ تم کاشی اور چنگی کا یونیفارم چنچ کراؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔“

”چلو۔“ وہ دونوں بچوں کو لے کر ان کے کمرے میں آگئی، اور ان کے کپڑے نکالتے ہوئے اپنے آپ بڑبڑاتی بھی جا رہی تھی۔ دولہا بھائی پر غصہ آ رہا تھا اور ان کے مہمان پر بھی کہ مزید اس نے شکایت لگائی ہوگی۔

پھر بچوں کو ڈرائنگ روم میں بھیج کر وہ خود بچن میں چلی گئی۔ آپنی نے بلایا بھی لیکن وہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی۔ یہ اس کی ناراضگی کا اظہار تھا اور اسے منانے کے لیے شام میں دولہا بھائی کو کھمانے لے جانا پڑا۔ تب کہیں اس کی ناراضگی دور ہوئی تھی اور موڈ خوشگوار ہوا تو وہ مزے لے لے کر آپنی کو دوپہر کا واقعہ سنانے لگی۔

”بہت بری بات ہے۔ اتنے مہذب آدمی سے تمہیں اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پتا نہیں کیا سوچتے ہوں گے وہ۔“ آپنی نے ساری بات سن کر کہا تو وہ لا پرواہی سے بولی۔

”جو چاہے سوچیں۔ ہمیں کیا۔“

”ہمیں کیا نہیں رومی! وہ آذر کے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ میں ان کے گھر جا چکی ہوں۔ ان کی امی اور بہن کا اخلاق اتنا اچھا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

”ادوہ آپنی! مجھے کسی کے اخلاق کا کیا پتا۔ میں تو نیل کی مسلسل آواز سے جھنجھلا گئی تھی۔ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں آج کون سی فلم دکھا رہی ہیں.....؟“ وہ موضوع بدل گئی۔

”سب وہیں رکھی ہیں جو چاہے دیکھ لینا، لیکن ایک، ورنہ پھر صبح اٹھو گی نہیں۔“ آپنی آخر میں سرزنش کرتی چلی گئیں۔

اگلے روز شام سے پہلے ہی چھوٹے بھائی اسے لینے آ گئے تو اس کے اشارے پر کاشی اور چنگی نے رونا اور چلنا شروع کر دیا۔

”خالہ نہیں جائیں گی، خالہ نہیں جائیں گی۔“

”کس نے کہا میں جا رہی ہوں، ماموں تو ایسے ہی تم لوگوں سے ملنے آئے ہیں۔“

کیوں چھوٹے بھائی؟“ اس نے بہت چالاکی سے بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا کر کہا۔

”ہاں ہاں۔ میں تو ایسے ہی۔“ چھوٹے بھائی کو بھی بچوں کا رونا گوارا نہیں تھا۔ فوراً

انہیں بہلایا اور جب وہ مطمئن ہو کر اپنے کھیل میں لگ گئے۔ تب چھوٹے بھائی اس سے کہنے لگے۔

”چلو رومی! ایک تمہارے نہ ہونے سے گھر بہت خالی خالی لگنے لگا ہے۔ بہت

بوریت ہو رہی ہے۔ بات کرنے کو کوئی نہیں ملتا، امی پتا نہیں کن کاموں میں الجھی رہتی ہیں

اور بھابھی کے مزاج نہیں ملتے۔“

”آپ کو تو پتا نہیں بھابھی سے کیا دشمنی ہے۔ اتنا تو وہ آپ کا خیال رکھتی ہیں۔ وقت

بے وقت چائے اور کھانے کے اوقات بھی آپ کے سب سے الگ ہیں۔ وہ گرم کر کے دیتی

ہیں۔“

”اچھا بس چلو تم۔“ چھوٹے بھائی نے ٹوک دیا۔ پھر کسی نہ کسی طرح بچوں کو بہلا کر

اسے گھرانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اور وہ آئی تو منہ پھلا کر تھی لیکن آگے بھا بھی نے

اتنی محبت سے گلے لگایا کہ وہ خوش ہو گئی اور ان کے پیچھے کھڑے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر کہنے

لگی۔

”اتنی محبت کرتی ہیں بھابھی! آپ پھر بھی کچھ لوگ آپ سے ناراض رہتے ہیں۔“

”کون، کون ناراض رہتا ہے مجھ سے.....؟“ بھابھی نے فوراً پوچھا تو چھوٹے بھائی

کے بری طرح گھورنے پر وہ شیشا گئی۔

”کوئی نہیں میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ بھلا آپ سے کوئی ناراض ہو سکتا ہے۔“

پھر آنے والے دن اس کے لیے بھی بوریت لے کر آئے۔ کیونکہ بھابھی کی طبیعت

گری گری رہنے لگی تھی۔ وہ ماں بننے والی تھیں اور ابتدائی دنوں میں ایک تو ڈاکٹر نے انہیں

کچھ آرام کا مشورہ دیا تھا دوسرے امی ڈاکٹر بنی ہوئی تھیں۔ شاید پوتے کی خوشی سن کر بوکھلا گئی

تھیں جو انہیں پلنگ سے اترنے ہی نہیں دیتی تھیں۔ مزید اسے بھی زیادہ ان کے پاس بیٹھنے سے منع کرتیں۔

”اسے پہلے ہی چکر آتے ہیں، تمہاری باتیں اور چکر اڑتی ہوں گی۔“

اور بھابی سے زیادہ وہ چکر اگئی تھی۔ سارا دن بولائی بولائی پھرتی۔ کوئی پلچل جو نہیں تھی، نہ کہیں آتا جانا اور اس نے امتحانوں سے نمٹتے ہی سوچا تھا کہ اب آگے نہیں پڑھے گی لیکن اب شدت سے رزلٹ کی منتظر تھی تاکہ دوبارہ کالج جوائن کر سکے۔ ایک ایک کر کے اسے اپنی ساری سہیلیاں یاد آ رہی تھیں جنہیں جب وہ آخری پیپر دے کر نکلی تھی تو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ آئی تھی۔ اس وقت وہ بظاہر ٹی وی پر نظریں جمائے ان ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جبکہ بھائی جان بڑے انہماک سے خبر نامہ سن رہے تھے۔ کہ معا چھوٹے بھائی نے آکر انہیں مخاطب کر ڈالا۔

بھائی جان! میں نے آپ کو اپنے ڈاکو میٹس دیے تھے ان میں ایک کاپی اور بجٹل چلی گئی ہے۔“

”ہاں وہ میرے بریف کیس میں رکھی ہے۔ لے لو۔“ بھائی جان ان سے کہہ کر دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر غالباً خیال آنے پر اس سے کہنے لگے۔ ”دیکھنا رومی! چھوٹے بھائی سے کہو بریف کیس میں نہ ملے تو دراز میں دیکھئے۔“

”کیا چیز؟“ وہ چونک کر بولی۔

”چھوٹے بھائی کو پتا ہے، جاؤ وہ میرے کمرے میں ہوگا۔“

”اچھا جی!“ وہ فوراً لاؤنج سے نکل کر بھائی جان کے کمرے تک آئی تھی کہ بھابی کی آواز نے اس کے قدم دروازے پر ہی روک دیئے وہ شاید چھوٹے بھائی سے مخاطب تھیں۔

”تم اس طرح منہ اٹھائے اندر کیوں چلے آئے ہو۔ دستک نہیں دے سکتے تھے۔ جاؤ جو بھی کام ہے۔ رومی سے کہو۔“

”مجھے اپنے کاغذات لینے ہیں جن کا رومی کو پتا نہیں ہے۔“ احساس تو ہیں سے چھوٹے بھائی کی آواز سخت ہو گئی تھی۔

”میں یہ سب نہیں جانتی۔“

بھابی کا حد درجہ زور دھوا انداز وہ پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ جبکہ چھوٹے بھائی اوّل روز

سے کہہ رہے تھے۔ وہ حیران ہو کر دروازے کو دیکھنے لگی جسے ایک دم کھول کر چھوٹے بھائی غصے میں نکلے اور اسے دیکھ کر سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے پیچھے جائے یا بھابی کے پاس جا کر ان کے تلخ رویے کی بابت پوچھے۔ اسی شش و پنج میں کھڑی تھی کہ بھابی نکل کر آ گئیں۔

”ارے رومی! تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ آؤ اندر آؤ۔“ بھابی نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کے کمرے میں لے جانا چاہا تو وہ ایک دم ان کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”چھوٹے بھائی کو تو نکال دیا آپ نے۔“

”نکالوں گی کیوں؟ البتہ کمرے میں آنے کے آداب بتائے ہیں۔“ بھابی اپنے رویے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھیں۔

”اب آپ، انہیں آداب سکھائیں گی؟“ وہ بھائی کی محبت میں ان سے شاکي ہو رہی تھی۔ میرا خیال ہے، وہ آپ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔“

”مجھے اس سے انکار نہیں ہے رومی! اور میں اپنے رویے پر بھی شرمندہ نہیں ہوں۔“

بھابی دھیرج سے کہہ کر دوبارہ کمرے میں چلی گئی تھیں۔

”کتنی اجتناب میں ہوں میں ہمیشہ چھوٹے بھائی کو جھٹلاتی رہی ہوں۔ کبھی بھولے سے بھی

بھابی کو آزار مانے کا خیال نہیں آیا کہ آخر چھوٹے بھائی کس حساب سے انہیں دوغلا کہتے ہیں

وہ ہیں ہی دوغلی، سب کے سامنے کیسی معصوم فرشتہ بنی رہتی ہیں۔“

وہ اسی وقت سے نہ صرف منفی سوچوں میں گھر گئی بلکہ اس کا بھابی سے اختلاف بھی

شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ بھابی کے سابقہ رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسی طرح اس کا

خیال رکھتیں اور وہی محبت بھرا انداز تھا، جسے وہ جھٹک دیکھا اور سمجھنے لگی تھی اور کسی کسی وقت یہ

بھی ضرور سوچتی کہ آخر انہیں دکھاوا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال اپنی اپنی سوچوں

کے ساتھ وہ بھابی سے کھینچ کھینچی بھی رہنے لگی تھی اور کچھ ضد میں آکر ان کی ہر بات کا

الٹ بھی کرنے لگی تھی۔ جس پر کئی بار امی نے اسے ٹوکا لیکن اسے کوئی دھیان نہیں دیا۔

اپنے تینوں وہ چھوٹے بھائی کا بدلہ لے کر خوش ہو رہی تھی اور یہ نہیں تھا کہ بھابی نے اس

کی تبدیلی محسوس نہیں کی تھی۔ بہت دن تک وہ صرف اس لیے نظر انداز کرتی رہیں کہ شاید

اسے خود احساس ہو جائے لیکن وہ کچھ حد سے گزر رہی تھی اور اس میں نقصان بھی اس کا

اپنا تھا۔ بھابھی اگر چاہتیں تو بڑے آرام سے ”مجھے کیا سوچ سکتی تھیں لیکن ان کی نظر میں وہ ابھی نا سمجھ نادان بھی اور اسے سمجھانا اپنا فرض سمجھتے ہوئے اس روز بھابھی اس کے پاس آ بیٹھتیں خاص اسی مقصد سے۔

وہ اس وقت ٹانگیں پھیلا کر لیٹی ہوئی کوئی فلمی میگزین دیکھ رہی تھی۔ بھابھی کی آمد کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا نہ کوئی لحاظ نہ ٹانگیں سمیٹ لے۔

”تمہارا زلٹ کب آ رہا ہے؟“ بھابھی نے اسے متوجہ کرنے کی غرض سے پوچھا تو وہ میگزین سے نظریں ہٹائے بغیر بولی۔

”ہنا نہیں۔“

”مجھے لگتا ہے۔ تمہارا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ بھابھی نے کہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں۔ تب کچھ انتظار کے بعد بھابھی نے اس کے ہاتھوں سے میگزین لے لیا اور ایک طرف رکھتی ہوئی بولیں۔

”پڑھنی ہی ہے تو کوئی اچھی کتاب پڑھو۔ یہ فلمی میگزین کیا سکھاتے ہیں۔ بے حیائی، بے شرمی اور۔“

”جی نہیں۔“ وہ درمیان میں بول پڑی۔ ”کتابیں اچھا برا کچھ نہیں سکھاتیں۔ انسان زندگی کے تجربات سے سیکھتا ہے۔“

”تب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم دوسروں کے تجربات سے سیکھ لیں۔“

”آپ نے کیا کچھ سیکھ لیا جواب مجھے سکھانا چاہتی ہیں۔“ اس کی طنزیہ مسکراہٹ بھابھی یکسر نظر انداز کر گئیں۔

”میں کیا سکھاؤں گی۔“

”اور کچھ نہیں تو سسرال والوں کو بے وقوف بنانے کا طریقہ تو سکھا ہی سکتی ہیں۔“ اس کے بغیر کسی لحاظ کے کہنے پر بھابھی تاسف سے اسے دیکھنے لگیں۔

”تم بہت معمولی بات پر مجھ سے متنفہ ہو رہی ہو رومی! اور صرف بھائی کی محبت تم پر غالب ہے۔ اگر غیر جانبداری سے سوچو تو تمہاری سمجھ میں آئے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔ چھوٹے بھائی کو اس طرح میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا اور اگر میں

نے ٹوک دیا تو کون سا گناہ کیا۔ البتہ نہ ٹوک کر ضرور گناہ گار ہوتی۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ ایک حد قائم رکھنی چاہیے ورنہ ان کی پاکیزگی قائم نہیں رہتی۔ مجھے چھوٹے بھائی سے کوئی بغض نہیں ہے نہ ہی خدا نخواستہ میں ان کے بارے میں غلط سوچ سکتی ہوں۔ وہ بہت اچھے ہیں، میری عزت کرتے ہیں اور گو کہ میرے دل میں بھی ان کے لیے بالکل بھائیوں جیسی محبت ہے لیکن وہ میرے بھائی نہیں ہیں اور یہ بات مجھے اپنی زندگی کے کسی تجربے نے نہیں سمجھائی بلکہ سب سے اچھی کتاب نے سکھائی ہے کہ دیور نا محرم ہوتا ہے۔ اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔“

”میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں اور میں نے چھوٹے بھائی کو تو کچھ نہیں کہا بلکہ اس رشتے کو۔“

”چھوڑیں بھابھی! اب آپ لاکھ بات کو گھمائیں لیکن مطلب یہی ہے۔ آپ کو چھوٹے بھائی سے بات نہیں کرنی نہ کریں۔ ایسے مفروضے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کم فہم تھی اور سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔

”یہ مفروضہ نہیں ہے رومیلہ! کیا تم نے۔“

”خدا کے لیے۔“ اس نے بھابھی کی بات پوری نہیں ہونے دی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”بخشیں مجھے۔ آپ کے وقفا کو سی خیالات سے مجھے کوئی استفادہ نہیں کرنا اور بے فکر رہیں میں آپ کے کسی معاملے میں خل نہیں دوں گی۔“

”مجھے تمہاری مداخلت کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔“ بھابھی کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں۔

”خدشہ نہیں تھا تو صفائی پیش کرنے کیوں آ بیٹھی تھیں۔“ وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگی تھی۔

☆☆☆

اس کا زلٹ آیا تو محض بوریت اور یکسانیت سے چھٹکارے کی خاطر اس نے تھرڈ ایئر میں ایڈمیشن لے لیا اور کالج جانے آنے لگی، حالانکہ اسے پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا اور گھر میں پابند رہنا تو اور بھی برا لگتا تھا اس لیے مجبوراً پڑھنے کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن ابھی زیادہ

دن نہیں ہوئے تھے اسے کالج جوائن کیے ہوئے کہ گھر میں اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں جن میں آپنی اور دلہا بھائی پیش پیش تھے۔ اسے جس روز تھوڑی سن گن ملی وہ اسی روز کالج سے سیدھی آپنی کے گھر چلی گئی۔

”یہ آج کل آپ امی کو کیا پٹی پڑھا رہی ہیں؟“ اس نے چھوٹے ہی آپنی کو گھیر لیا۔

”ایمان سے رومی! بہت اچھا پڑ پڑا ہے، خبردار منع نہیں کیا۔“ آپنی سے خوشی سے بتانے کے ساتھ تنبیہ بھی کی۔

”منع تو جب کروں گی جب کوئی مجھ سے پوچھے گا اور مجھے یقین ہے کوئی بھی مجھے اتنی اہمیت نہیں دے گا۔ اس لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں کہ اتنا تو معلوم کر لوں، کون ہے، کیا ہے خوب صورت بھی ہے یا۔“

”تم نے دیکھا ہے اسے۔“ آپنی نے فوراً کہا اور اس نے بھی فوراً پوچھا۔

”کب؟ کہاں؟“

”جب تم یہاں تھیں تو تمہارے دو دلہا بھائی کے دوست آئے تھے، احسن نام ہے ان کا۔“ آپنی نے بتایا تو وہ کچھ دیر ذہن پر زور ڈالنے کے بعد اچھل پڑی۔

”ہائے آپنی وہ۔ ان کے ساتھ تو میں بہت بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔ کیا انہوں نے خود آپ سے کہا ہے؟“

”نہیں، ان سے تو اس روز کے بعد سے ملاقات ہوئی ہی نہیں کیونکہ وہ یہاں نہیں کوئٹہ میں ہوتے ہیں۔ مجھ سے ان کی امی نے کہا ہے۔ وہ شاید بہت دنوں سے ان کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ اس روز ہمارا جانا ہوا تو مجھ سے بہت سے کرید کرید کر میرے گھر کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ پھر ابھی کچھ دن پہلے ان کا فون آیا کہ وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے امی سے بات کی، یوں اتوار کا دن طے پایا ہے۔ بس تم ذرا اپنے آپ کو ڈھنگ سے پیش کرنا۔“ آپنی نے تفصیل سے بتانے کے ساتھ کہا۔

”ڈھنگ سے پیش کرنے کا کیا مطلب ہے؟“ وہ تنک کر بولی۔

”مطلب یہ کہ امپریشن تم نے احسن پڑا لیا تھا ذرا اس سے پرہیز کرنا۔“

”کوئی فائدہ نہیں، وہ تو دیکھ چکے ہیں اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ اسی بدتمیز لڑکی سے ان کی بات چلائی جا رہی ہے تو صاف انکار کر دیں گے اور مجھے بھی وہ کوئی اتنے اچھے نہیں

لگے تھے جو میں اپنے گزشتہ رویے پر پچھتاؤں کہ ہائے کاش ایسا نہ ہوتا اور دیا ہوتا بلکہ آپ مزید انہیں بتا دیجیے گا کہ میں اس سے بھی زیادہ بدتمیز اور سر پھری ہوں۔“ جیسے لاشعور میں کہیں خجالت موجود ہو جس کی نفی کے لیے بندہ بڑھ چڑھ کر بولنے لگے تو شاید اس کی بھی وہی کیفیت تھی۔

”بکومت، تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے زیادہ بولنے کی۔“ آپنی نے اسے ڈانٹ دیا تو وہ منہ پھلا کر۔

”تو آپ کیوں میرے پیچھے پڑی ہیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔ نہ مجھے گھر داری آتی ہے نہ بچے سنبھال سکتی ہوں۔“

”اسی لیے تو میں اس رشتے کے حق میں ہوں کیونکہ احسن کی امی بہت اچھی ہے۔ سب سکھادیں گی تمہیں ورنہ اگر کسی روایتی ساس سے پالا پڑ گیا تو روتی رہو گی ساری عمر۔“

”ساس اچھی دیکھ رہی ہیں آپ اور وہ جن کے ساتھ میں نے بدتمیزی کی تھی۔“

”وہ بھی اچھے ہیں بلکہ بہت اچھے ہیں۔“ آپنی نے اسے گدگد کر کھلکھلانے پر مجبور کیا تھا۔

☆☆☆

پھر اتوار کے دن آپنی صبح سے ہی آگئی تھیں اور بھابھی کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی سترائی سے لے کر مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے جانے کتنے لوازمات تیار کر ڈالے ساتھ ساتھ اسے بھی کوئی نہ کوئی نصیحت کر جاتی تھیں، جیسے وہ بڑے آرام سے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا رہی تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہاں بات بننے والی نہیں ہے۔ پھر کسی کو یہ کہنے کا موقع کیوں دے کہ خود کو پسند کروانے کے لیے کیسا خول چڑھالیا حالانکہ وہ بدتمیز نہیں تھی۔ اس روز اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا نیند خراب ہونے پر ایسا ہی مظاہرہ کرتا بہر حال اب ایسا بھی نہیں تھا کہ مہمانوں کے سامنے وہ خود کو بدتمیز ہی ظاہر کرتی۔ اوّل تو اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی اور اگر کرتی بھی تو اسے کامیابی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ مہمانوں کے سامنے جانے ہی فطری ہجک اور گھبراہٹ نے اسے سر تو کیا نظریں بھی نہیں اٹھانے دی تھیں سوالوں کے جواب بھی بس جی اور جی نہیں میں دیئے۔ جس پر اپنے آپ حیران بھی ہو

رہی تھی اور بعد میں تو جھلانے لگی تھی۔

”اف مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں ایسی کنفیوز ہونے والی تو نہیں ہوں۔“

”جناب ایسے موقع پر اچھے اچھے کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ آپ کیا چیزیں ہیں۔“ آپی نے اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا تو بھابی نے ان کی تائید کی۔

”جی نہیں، ضرور آپ لوگوں نے مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا ہو گا جو مجھ سے سر بھی نہیں اٹھایا گیا اور کارٹون دیکھ کر بھی ہنسی نہیں آئی۔ ورنہ میری بیتی کبھی اندر رہتی ہے۔“ اس نے کہا تو آپی متجب ہوئیں۔

”کارٹون۔ کیا مطلب.....؟“

”ارے وہ جو میرے سامنے حضرت بیٹھے تھے۔ سارا وقت اپنی شکل بگاڑتے رہے۔“ وہ اب سوچ کر ہنسنے لگی۔

”وہ احسن کا بھائی ہے لیکن میں نے تو اسے شکل بگاڑتے نہیں دیکھا۔“

”میں دیکھ رہی تھی۔ کبھی یوں کبھی یوں۔ کبھی آنکھیں جھینکی کر رہا تھا۔“ وہ اسی کی طرح شکل بگاڑ رہی تھی۔ ساتھ ہنستی بھی جا رہی تھی۔ پھر جب ہنسی تھی پھر بولی۔ ”ویسے آپی ان کی بہن بڑی کیوٹ سی ہے۔ کیا کرتی ہے.....؟“

”گر بیجوشن کیا ہے اس نے اور میرا خیال ہے، دونوں بہن بھائی کی ساتھ ساتھ شادی ہوگی۔“ آپی نے بتایا تو بھابی پوچھنے لگیں۔

”کہیں بات طے ہوگئی اس کی.....؟“

”میرا خیال ہے۔“ آپی نے یقین سے نہیں کہا تو بھابی فوراً بولیں۔

”اگر نہیں تو ہم چھوٹے بھائی کے لیے بات کرتے ہیں۔ بہت اچھی جوڑی رہے گی ان کی۔“

”چھوٹے بھائی کے لیے کوئی کمی نہیں ہے۔ اس سے اچھی مل جائے گی۔“ بھابی کی بات حالانکہ اس کے بھی دل کو لگی تھی اس کے باوجود اختلاف کرنے سے باز نہیں آئی۔ اور دیکھا بھی ایسی نظروں سے جیسے کہہ رہی ہو آپ کو ان کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس پر بھابی خاموش ہو رہی تھیں۔

پھر چند دنوں میں ہی احسن کی امی نے دو تین چکر لگا لیے تھے۔ اور بھائی جان کو گھرا نہ تو پسند تھا لیکن احسن سے ملے بغیر وہ کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور احسن غالباً مصروفیت کی بنا پر آ نہیں پارہے تھے۔ آپی اور دولہا بھائی کی پر زور حمایت کے باوجود بھائی جان نے بڑے صبر و سکون سے ان کا انتظار کیا۔ کیونکہ انہیں اس کی شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ پہلے وہ گر بیجوشن کر لے اور ساتھ کچھ گھر واری بھی سیکھ لے۔ خصوصاً کھانا پکانا۔

اس سلسلے میں پہلی بار انہوں نے خود اسے ٹوکا تھا کہ اسے کچن میں بھابی کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ اور شروع میں تو وہ خود بھابی کے ساتھ لگی رہتی تھی تو اسی بہانے بھابی کچھ نہ کچھ کام اس سے کروا لیتی تھیں لیکن جب سے چھوٹے بھائی کو وہ کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تک چھوڑ دیا تھا۔ اور اب بھائی جان کے ٹوکے پر مجبوراً ان کے ساتھ کچن میں کھڑی ہونے لگی تھی۔

پھر ان ہی دنوں احسن چھٹی پر آئے تو ان کی امی نے سب کو کھانے پر بلایا تھا۔ تاکہ امی اور بھائی جان احسن کو دیکھ کر مل کر جلد فیصلہ کریں۔ اور واقعی اس کے بعد بھائی جان نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی تھی کیونکہ انہیں احسن بہت پسند آئے تھے۔ اور ان کے واپس کو سنبھالنے سے پہلے گھر کی چھوٹی سی تقریب میں منگنی کی رسم بھی ادا کر دی۔

اور وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ احسن کے آنے پر وہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ منگنی کی انگوٹھی پہن کر بھی بے یقین سی تھی اور مسلسل سوچ رہی تھی کہ یا تو احسن کو وہ پہلا ملاقات ہی یا نہیں ہے یا پھر انہیں دھوکے میں رکھا گیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ ان کی منگنی اس سے نہیں بلکہ آپی کی کسی اور بہن سے ہو رہی ہے۔ جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور ایسی صورت میں جب ان پر حقیقت کھلے گی تو ظاہر ہے وہ کتنے شکا کڈ ہوں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے بدلے میں اس کی زندگی اجیرن کر دیں۔ وہ اپنے آپ جانے کیا کچھ سوچ کر اتنی زندگی پریشان ہو گئی کہ اسی وقت لابی میں آکر ان کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کچھ دن پہلے اُن کی بہن عائشہ نے اسے اپنا نمبر دیا تھا۔ بہر حال دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی۔ اس نے مدھم سی روشنی میں رسٹ وائچ پر نظر ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ پھر بھی وہ بڑے سکون سے انتظار کرنے

لگی، کتنی دیر بعد ریسور اٹھانے کے ساتھ نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔
”ہیلو۔“

”آپ کون.....؟“ اس نے آواز دبا کر فوراً پوچھا تو ادھر سے سوال آیا۔

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”جی احسن سے۔“ وہ گہرا بھی رہی تھی کہ کہیں کوئی اٹھ کر نہ آجائے۔

”فرمائیے۔“ گویا اعتراف تھا، میں ہی احسن ہوں۔

”آپ احسن۔ سوری، میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب کیا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ صبح تو آپ کو کوئی نہ چلے جاتا ہے۔ اور مجھے آپ کو بتانا بہت ضروری تھا۔“ وہ بہت روانی میں بول کر خاموش ہو گئی تھی۔

”کیا بتانا ضروری تھا؟“ ان کے ٹوکے پر وہ پھر شروع ہو گئی۔

”یہی کہ جس لڑکی کے ساتھ آپ کی منگنی ہوئی ہے۔ وہ آذر بھائی کے گھر میں آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ اگر نہیں یاد تو میں بتاتی ہوں۔“

”ایک منٹ۔“ ادھر سے ٹوک کر کہا گیا۔ ”پہلے یہ بتائیں، آپ کون ہیں؟“

”میں۔“ اس نے شینا کرفون بند کر دیا۔ اور بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی تو اس کا

دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پھر اگلے کئی دن وہ انتظار کرتی رہی کہ ادھر سے کوئی بھی بہانا کر کے منگنی توڑنے کا

اعلان ہوگا، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کے برعکس احسن کی امی نے آتے ہی جلد

شادی پر زور دینا شروع کیا تو اسے لگا جیسے گزشتہ دنوں انتظار کے ساتھ اس کے اندر بے

شمار اندیشے بھی تھے جواب نہیں رہے تھے۔ اور وہ بہت مطمئن اور مسرور ہو کر بھابھی کے

ساتھ کچن میں کھڑی لوازمات سے ٹرائی سجار رہی تھی کہ عائشہ دروازے سے جھانک کر

بولی۔

”میں آسکتی ہوں؟“

”ضرور۔“ بھابھی نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا جبکہ وہ صرف مسکرائی تھی جس پر عائشہ

اندرا آتے کہنے لگی۔

”آذر بھائی نے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے کہ تم بہت باتونی، شوخ چنچل

اور ہنگامہ خیز ہو لیکن مجھے تو تم بہت معصوم لگ رہی ہو۔“

”یہ واقعی بہت معصوم ہے۔“ بھابھی نے اس پر پیار بھری نظر ڈال کر کہا تو عائشہ اس

سے پوچھنے لگی۔

”اب بتاؤ۔ کس کی بات کا یقین کروں؟“

”میرا خیال ہے، دولہا بھائی نے جو کہا ہے، وہی سچ ہے۔“ اپنی طرف سے اس نے

خاصی دیدہ دلیری دکھائی تھی۔ جس پر بھابھی فوراً کہنے لگیں۔

”تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ باتونی، چنچل اور ہنگامہ خیز لڑکیاں معصوم نہیں

ہوتیں۔ جبکہ اس کی سادگی و معصومیت ابھی ثابت ہو گئی ہے۔ ورنہ اگر یہ ہوشیار اور چالاک

ہوتی تو مزید خود کو پوز کرنے لگتی۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ عائشہ نے بھابھی کی تائید کی پھر اس سے کہنے

لگی۔ ”چلو تم اندراؤ، عمیر بھائی تم سے ملنے کو بے قرار بیٹھے ہیں۔“

”چلو۔“ وہ بھابھی کے سامنے ٹرائی چھوڑ کر کچن سے نکل آئی۔ اور ڈرائنگ روم میں آ

کر احسن کی امی کو سلام کیا پھر عمیر کے برابر صوفے پر بیٹھنے ہی کہنے لگی۔

”آج تو آپ ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں۔ یقیناً کسی نفسیاتی ڈاکٹر سے علاج کرایا ہو

گا؟“

”کیا مطلب.....؟“ عمیر سمجھا نہیں۔

”وہ جو اس روز آپ مسلسل اپنی شکل بگاڑ رہے تھے۔ مجھے پتا ہے اس کا علاج

صرف نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس ہوتا ہے۔ اچھا کیا جلد رجوع کر لیا ورنہ.....“ وہ بہت

کوشش کے باوجود اپنی ہنسی روک نہیں سکی اور جب ہنس پڑی تو روکنے کی کوشش ترک کر

دی۔ عمیر نے بڑے سکون سے انتظار کیا جب اس کی ہنسی ختم ہوئی تب کہنے لگا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ اسی ڈاکٹر نے اب مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کہہ رہا

تھا باقی علاج تمہاری بھانج کر میں گی۔“

”ارے..... میں تو ایسا علاج کروں گی کہ تم۔ سوری۔“ عمیر کو تم کہہ کر فوراً احساس بھی

ہو گیا تھا جب ہی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا گئی۔

”نوسوری، میں احسن بھائی سے چھوٹا ہوں، آپ مجھے تم تو کیا ٹو بھی کہہ سکتی ہیں۔“

”آج عائشہ نہیں آئی.....؟“

”نہیں، پتا نہیں کیوں نہیں آئی۔“ اس نے لاپردائی سے جواب دیا۔

”پھر تم کیوں جارہی ہو؟“ بھابھی کا انداز سبیدھاسا داکھا۔ پھر بھی وہ تنک کر بولی۔

”کیوں عائشہ نہیں جائے گی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ آگے ساری زندگی مجھے اس

کے ساتھ تو نہیں چلنا۔“

”عمیر کے ساتھ بھی نہیں چلنا۔“ بھابھی کہہ کر جانے لگی تھیں کہ وہ ایک دم ان کے

سامنے آگئی۔

”کیا چاہتی ہیں آپ، جس طرح آپ چھوٹے بھائی کی تذلیل کرتی ہیں اس طرح

عمیر کے ساتھ کروں، یہ کہوں کہ اس طرح منہ اٹھائے کیوں چلے آئے ہو۔“

”اس لہجے میں بات نہیں کرو ورنہ میلہ! چھوٹی ہو مجھ سے۔“ بھابھی نے نرمی سے ٹوکا۔

تب ہی ادھر سے امی نے پکارا تو وہ سر جھٹکتی آئے بڑھ گئی۔ اس کا موڈ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

عمیر نے دیکھتے ہی محسوس کر لیا اور جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تب پوچھنے لگا۔

”یہ اچانک آپ کا مزاج کیوں بدل گیا؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”اے اس طرح منہ پھلا کر آپ بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ آئینہ دیکھیں۔“ عمیر نے مرر

کارخ اس کی طرف کیا تو اس پر نظر پڑتے ہی وہ ہنس پڑی۔

”یہ ہوئی ناں بات۔ ویسے کسی کسی دقت میں بہت حیران ہوتا ہوں کہ کیا جوڑی ملائی

ہے اللہ نے، احسن بھائی اور آپ کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہاں وہ اتنے

بردبار، سنجیدہ، لیے دیے رہنے والے اور آپ۔“ عمیر نے آخر میں اسے دیکھ کر کندھے

اچکائے تو وہ بے نیازی سے بولی۔

”تو تمہیں ان کے مزاج کے مطابق لڑکی پسند کرنی چاہیے تھی۔“

”یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں احسن بھائی سے کہیے جنہوں نے آپ کو پسند کیا۔“

عمیر نے کہا تو وہ اچھل پڑی۔

”کیا کہا، احسن نے مجھے پسند کیا؟“

”دیکھیں، کم از کم مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کریں، بلکہ سیدھے سیدھے بتائیں کہ

آپ لوگ کب، کہاں ملے تھے اور یقیناً کوئی کٹ منٹ ہوگی جب ہی تو احسن بھائی نے امی

عمیر نے کہا تو عائشہ اس کی تائید کرتی ہوئی بولی۔

”دیکھ لیں، ہم نے آپ کو کتنا معتبر کر دیا ہے۔“

”شکریہ۔“ وہ آداب بجالائی پھر عمیر کو دیکھ کر کہنے لگی۔ ”ہاں آپ کیا کہہ رہے تھے،

ڈاکٹر نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے؟“

”جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا آپ کے پاس ہر غم کا علاج ہے۔ درد دل، درد جگر۔“

”درد سر۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ جس پر عمیر اور عائشہ بے ساختہ ہنسے تھے۔

☆☆☆

وہ ان دنوں بہت خوش تھی۔ کیونکہ زندگی میں جیسی پہلی وہ پسند کرتی تھی تو عائشہ اور

عمیر بھی ویسے ہی تھے۔ ہر دوسرے دن آکر اس سے اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کرتے اور وہ

جیسے پہلے سے تیار ہوتی تھی، کوئی تفریح گاہ چھوڑی نہیں تھی۔ کسی دن بازار کے چکر لگتے۔

عائشہ کی شادی بھی اس کے ساتھ ملے تھی، اس لیے دونوں اپنی اپنی پسند سے شاپنگ کر رہی

تھیں۔ جبکہ گھر میں امی نے اس کے لیے پہلے سے جو کچھ بنا کر رکھا تھا۔ اس پر بھابھی اور

امی مل کر کام کر رہی تھیں۔ یعنی کپڑوں کی سینٹنگ، ڈیزائننگ کہ کس پر کیا کام بننا ہے، اور ان

کپڑوں کے ساتھ میچنگ چیزوں کی خریداری وہ کر رہی تھی۔ ویسے بھی ان دنوں بھابھی

بازاروں کے چکر نہیں لگا سکتی تھیں۔ اس لیے امی نے اسے عائشہ اور عمیر کے ساتھ جانے کی

آزادی دے رکھی تھی۔ اس وقت وہ امی سے کچھ چیزوں کی لسٹ بنوا رہی تھی کہ عمیر آگیا۔

”خاتون! فوراً چلنے کے لیے تیار ہو جائیں، ادھر امی جیولر کے پاس آپ کا انتظار کر

رہی ہیں۔ آپ چل کر ڈیزائن پسند کریں تاکہ وہ آڈر کر سکیں۔“ عمیر نے بہت غلٹ کے

مظاہرے کے ساتھ کہا تو اس نے پہلے امی کو دیکھا پھر ان کی اجازت ملنے پر اٹھتے ہوئے

بولی۔

”میں ابھی آتی ہوں، تم جب تک چائے وغیرہ پیو۔“ پھر بھابھی کہ چائے کا کہہ کر

اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ کپڑے تیار تھے اس لیے تیاری میں بھی اسے زیادہ وقت

نہیں لگا۔ بالوں میں جلدی جلدی برش کر کے کمرے سے نکلی تو بھابھی اسے روک کر پوچھنے

لگیں۔

کی بتائی ہوئی تمام لڑکوں کو رجحیکٹ کر کے آپ کا نام لیا تھا۔“ عمیر نے کہا تو وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”تم غلط کہہ رہے ہو۔ میری احسن سے صرف ایک ملاقات ہوئی ہے اور اس میں مجھے پسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ پھر اس نے اپنی پہلی ملاقات کا احوال کہہ سنایا تو عمیر بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”اگر آپ سچ کہہ رہی ہیں تو غلط میں نے بھی نہیں کہا، آپ عائشہ سے پوچھ لیجئے گا کہ کیسے احسن بھائی نے اس کے سامنے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ وہ شادی کریں گے تو اسی لڑکی سے۔“ عمیر آخر میں مزے لے کر بتا رہا تھا اور وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

پھر امی کا خیال تھا کہ بھابھی کی ڈیوری کے بعد اس کی شادی کریں گے لیکن احسن کی امی نہیں مانیں، ان کا فوری شادی پر اصرار ایک طرح سے ٹھیک ہی تھا کہ احسن کو سنہ میں اکیلے ہوتے تھے، دوسرے عائشہ کے سرال والے بھی نہیں ٹھہر رہے تھے۔ یوں آنا فانا شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو بھائی جان نے خاص طور پر اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔ جس پر اس نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا لیکن سمجھ گئی کہ یہ بھابھی کی کارستانی ہے۔ یقیناً انہوں نے ہی بھائی جان کو اکسایا ہوگا۔ ورنہ پہلے تو کبھی انہوں نے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دیا تھا۔ ہر بات، ہر معاملہ امی پر چھوڑ رکھا تھا۔ بہر حال اب زیادہ دن نہیں تھے اس لیے اس نے بھابھی سے الجھنے یا ان پر کچھ جتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یوں بھی ان دنوں ہ کچھ گمن اور کچھ خواب بننے میں لگی ہوئی تھی، پھر انہیں اپنے پسندیدہ رنگوں سے سجانا۔ گویا ندگی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ اس پر مہربان تھی۔

”تمہارے جانے سے گھر سونا سونا ہو جائے گا۔“ اس وقت بھابھی اس کے پاس آ کر بیٹھی تھیں اور کچھ اتنی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا کہ وہ کسی طرح اس محبت کو جھٹلا نہیں سکتی اور بدلے میں بے اختیار ان کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر بولی۔

”یہ سونا پن زیادہ دن نہیں رہے گا۔“ آپ کا ننھا مہمان آنے والا ہے۔ پھر اس کی ہنسی

اور شرارتیں میری کی محسوس بھی نہیں ہونے دیں گی۔“

”وہ تو جب آئے گا، ابھی تو میں بہت مس کروں گی تمہیں۔ اور تم جا بھی رہی کو سنہ۔“

”آپ تو کہہ رہی ہیں جیسے سات سمندر پار جا رہی ہوں۔ ویسے مجھے سمندر پار جانے کا بہت شوق ہے۔ احسن سے کہوں گی ضرور ٹرائی کریں۔ امریکہ، جاپان کہیں بھی۔“ بہت اشتیاق سے کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بھابھی نے پیار سے اس کا گال چھوا پھر کہنے لگیں۔

”تمہارا سرال اچھا ہے۔ سب لوگ اچھے ہیں، احسن کو بس ایک ہی بار دیکھا ہے۔ یقیناً وہ بھی بہت اچھے ہوں گے، تم انشاء اللہ خوش رہو گی۔“

”آپ کی دعائیں ساتھ ہونی چاہیں بھابھی!“ وہ بڑے موڈ میں تھی۔

”میری محبتیں، میری دعائیں سب تمہارے ساتھ ہیں پھر بھی میں کہوں گی کہ صرف میری دعاؤں سے کام نہیں چلے گا، تمہیں خود تھوڑا سمجھ دار ہونا چاہیے۔ گو کہ تمہاری ساس بہت اچھی ہیں لیکن وہ بھی ایک حد تک تمہیں گائیڈ کریں گی، اور تم اس طرح لا پر دائی سے ہر بات کو مت ٹال دینا۔“ بھابھی نے اس کا موڈ دیکھ کر نرمی سے سمجھانا شروع کیا تھا۔

”آپ کو نہیں پتا۔ میں بہت سمجھ دار، بہت چالاک ہوں۔“ وہ اترا کر ہنسی۔

”سمجھ دار ہوتیں تو مجھے تمہیں سمجھانا نہ پڑتا۔ عائشہ کو دیکھو، کتنی تیز ہے۔ یہاں آتی ہے تو ہر طرف نظر رکھتی ہے۔ خیر یہ بھی اچھا ہے کہ تم سے پہلے اس کی شادی ہو جائے گی، باقی عمیر ہے، اس کے ساتھ زیادہ بے تکلفی کے بجائے تم اپنا رویہ تھوڑا سخت کر لو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔“

”اللہ بھابھی! یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں تو چھوٹے بچوں پر رعب نہیں ڈال سکتی اور عمیر تو.....“ اس نے نفی میں سر ہلا کر معذوری ظاہر کی تو بھابھی بات ختم کرتی ہوئی بولیں۔

”بہر حال اس سے ہوشیار رہنا۔“

اور وہ کیونکہ اچھے موڈ میں تھی، اس لیے ہنس کر چپ ہو رہی۔ اس کے بعد بھابھی کو یوں فراغت سے اس کے پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پھر آپی بھی آ گئی تھیں۔ جن کے بچوں کی موجودگی میں وہ کسی اور کی سنتی ہی نہیں تھی۔ اور یہ تھوڑے سے دن بڑی افراتفری میں نکل گئے۔ جانے کس

”خواتین میں آپ کا کوئی کام نہیں۔ چلیے وہیں سے واپس ہو جائیں۔“
 ”جی نہیں، میں اپنی بھانج کو دیکھنے اور ان کا حال احوال پوچھنے آیا ہوں۔“ وہ فوراً
 آگے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور آہستہ سے اسے کندھا مار کر بولا۔ ”کیسی ہے.....؟“
 ”جیسی پہلے تھے۔“ اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔
 ”گویا احسن بھائی کوئی تبدیلی لانے میں ناکام ہو گئے۔ چہ چہ۔“ عمیر نے شونہ کی
 تاسف کا اظہار کیا تو وہ دانت پیس کر بولی۔
 ”فوراً اٹھ جاؤ میرے پاس سے ورنہ کسی کا خیال نہیں کروں گی۔“ وہ ہنسا ہوا اٹھ کر چلا
 گیا۔

احسن ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے تھے اور یہ پورا ہفتہ دعوتوں میں گزر گیا۔ اس کے بعد
 وہ بہت شوق سے کوسٹ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جبکہ احسن کی امی خاصی فکر مند تھیں۔
 ”لہن وہاں اکیلی کیسے رہے گی، تم تو سارا دن آفس میں ہو گے، کیا یہ پریشان نہیں ہو
 گی؟“

”نہیں۔“ احسن کا جواب مختصر تھا،
 ”کیسے نہیں، ابھی تو اسے ٹھیک سے کھانا پکانا بھی نہیں آتا۔ کیا کھائے گی پھر ایک ایک
 کام کے لیے بیٹھی رہے گی۔“
 ”کیا چاہتی ہیں آپ، یہیں چھوڑ جاؤں اسے؟“ احسن زچ ہو کر بولے تو امی
 قدرے شپٹا گئیں۔

”نہیں، یہاں کیوں چھوڑ جاؤ گے۔“
 ”پھر کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں، خواہ مخواہ کی فکر، کوئی پریشان نہیں ہوگی یہ اور نہ
 بھوکے رہے گی۔ سر پر پڑتی ہے تو سب کام آجاتے ہیں۔ یہ بھی سیکھ جائے گی۔“
 ”احسن ٹھیک کہہ رہے ہیں امی۔“ احسن کے تیز لہجے کی تلافی میں وہ امی کے گلے میں
 بانہیں ڈالتی ہوئی کہنے لگی۔ ”آپ یونہی پریشان ہو رہی ہیں، اور یہ آپ سے کس نے کہا کہ
 مجھے کام نہیں آتا۔ سب کر لیتی ہوں، کھانا بھی پکا لیتی ہوں، بس یہ پتا نہیں چلتا کہ کیا پکا
 ہے۔“
 ”ہا ہا ہا۔“ عمیر نے بہت زور سے قہقہہ لگایا تو احسن اسے گھور کر بولے۔

بات، کسی نصیحت کو اس نے پلو میں باندھا بھی تھا یا اسی دہلیز پر چھوڑ گئی تھی۔
 ☆☆☆

جس وقت احسن کمرے میں داخل ہوئے، وہ ان سے اپنی پہلی ملاقات سوچ کر محظوظ
 ہو رہی تھی، اور انہوں نے بھی بیٹھے ہی اسی حوالے سے پوچھا تھا۔
 ”جناب! آج چلیے سے کیسا نظر آ رہا ہوں؟“ اس نے بے اختیار ان پر ایک نظر ڈال
 کر سر جھکا لیا۔

”ارے، آپ کو شرمنا بھی آتا ہے۔ میرا تو خیال تھا، اس وقت بھی آپ میری اچھی
 خاصی کلاس لیں گی۔ اس لیے میں بہت تیار ہو کر آیا تھا۔ ویسے اچھی، لگ رہی ہو۔“
 ان کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور نظروں کی دائرگی محسوس
 کر کے وہ بہت نروس ہو رہی تھی۔ انہوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ بس آہستگی سے اس کے
 ٹھنڈے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں دبا کر اپنی ذات کا اعتماد بخشا تھا۔ اور وہ واقعی حیران تھی
 کہ اس کا دھڑ دھڑ کرتا دل ایک پل میں ٹھہر گیا تھا

صبح عائشہ نے اسے تیار کر کے وہیں کمرے میں ناشتا کرایا۔ وہ دو دن پہلے اس گھر
 سے رخصت ہوئی تھی۔ اور اب بھائی کی شادی میں پیش پیش تھی۔ ناشتے کے بعد جیسے ہی
 احسن کمرے سے نکل کر گئے، ان کی کزنز آگئیں اور کچھ شوق سے اور کچھ تنقیدی نظروں سے
 اسے دیکھنے لگیں۔

”بھابھی تو اچھی لائی ہو عائشہ۔“ کسی کزن نے کہا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

”خاصی کم عمر، یعنی احسن بھائی کے مقابلے میں۔“

”یہ کیوٹ سی لڑکی، احسن بھائی کی پسند ہے۔“ عائشہ نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو

حیرت میں ڈوبی آواز آئی۔

”واقعی، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”مجھے بھی مشکل سے یقین آیا تھا۔“ عائشہ ہنستی ہوئی بولی۔ تب ہی عمیر نے کمرے

میں داخل ہو کر زوردار سلام کیا۔

”السلام علیکم۔ خواتین ہی خواتین۔“

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“

”سوری بھائی!“ عمیر نے سر کھاتے ہوئے اسے دیکھا، وہ ہونٹ بھیج کر کہی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں رومیہ! تمہاری تیاری مکمل ہو گئی؟“ احسن نے اٹھتے ہی اس سے پوچھا۔
”جی!“

”چلو عمیر! ہمارا سامان گاڑی میں رکھو، اور ہاں امی کا خیال رکھنا۔ زیادہ دیر گھر سے باہر رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بظاہر بہت سنجیدگی سے اپنی بڑائی کا رعب جمار ہی تھی، اور عمیر نے بھی اس وقت تک سر جھکا کر سعادت مندی کا مظاہرہ کیا جب تک احسن موجود رہے پھر جیسے وہ کمرے سے نکل کر گئے، بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ کر بازو پیچھے موڑتا ہوا بولا۔
”ہاں اور کیا کیا کرنا ہے۔ جلدی بتائیں؟“

”اف میرا بازو۔“ وہ تکلیف سے جھک گئی۔ تو امی کے ڈانٹنے پر عمیر اس کا بازو چھوڑ کر پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

”یہ رعب احسن بھائی پڑا لیے گا۔“

”وہ پہلے ہی مرعوب ہو چکے ہیں۔“ وہ ہنستی ہوئی بھاگ کر احسن کے پیچھے آئی تھی، اور تمام راستہ بھی وہ یونہی ہنستی کھلکھلاتی رہی تھی، پھر کوسنہ کی برف باری نے تو اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ بے اختیار احسن کا بازو تھام کر بولی۔

”کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں؟“

”رکومت، اندر چلو، ورنہ یہیں جم جاؤ گی۔“ احسن نے اس کا اشتیاق نظر انداز کر کے اسے اندر دھکیل دیا پھر دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”تم ان موسموں کی عادی نہیں ہو۔ لہذا تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ چلو بیڑاں کرو اور لحاف میں بیٹھو۔“
”میں واقعی ایسے سخت موسموں کی عادی نہیں ہوں۔“ وہ روٹھ کر بولی۔ اشارہ ان کے تحکمانہ انداز کی طرف تھا اور وہ سمجھ کر بے ساختہ مسکرائے۔

”آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی۔“

”جی نہیں، موسم کو بدلنا ہوگا ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔“

”اس سے پہلے اگر چائے پلا دو تو تمہاری بڑی مہربانی۔“ وہ خود بیڑاں کرتے ہوئے

بولے۔ تو وہ چیخ پڑی۔

”یعنی آپ کو میری خودکشی سے کوئی مطلب نہیں؟“

”نہیں۔“ ان کی مسکراہٹ بڑی واضح تھی اور آنکھوں سے چھلکتی شوخی نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

☆☆☆

وہ احسن کی سنگت میں بہت خوش تھی۔ کیونکہ اس کے معاملے میں ان کا روپ بڑا دلکش تھا۔ بہت محبت کرنے والے اور اس کا بے حد خیال رکھتے، اپنی کوئی بات جبراً نہیں منواتے تھے بلکہ اس کی خوشی دیکھتے۔ اسے اگر ان سے کوئی شکایت تھی تو صرف اتنی کہ وہ کم بولتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کبھی نہیں ٹوکا۔ وہ جنتی دیر بولتی رہتی گو کہ ہر بات کا جواب نہیں دیتے لیکن سنتے ضرور تھے۔ اور اس کا انہیں احساس تھا۔ خصوصاً شام میں جب وہ گھر میں داخل ہوتے تو اس کے چہرے پر سارا دن کی بوریت سے چھا جانے والی بیزارگی واضح نظر آتی تھی۔

”کیا سوچتی ہو گی تم، میں نے تمہیں یہاں لا کر قید کر دیا، شاید امی ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ تم یہاں اکیلی پریشان ہو جاؤ گی۔ اور میں نے ان کی بات کو اہمیت نہیں دی، اپنا سوچا۔“ وہ اس وقت اس کی اکتائی ہوئی شکل دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

”جناب! میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔ بے شک سارا دن میں بور ہوتی ہوں لیکن پھر اسی حساب سے آپ کو پریشان بھی تو کرتی ہوں۔ اتنا بہت سارا بول کر۔ ویسے اگر آپ کو میری پریشانی کا زیادہ ہی احساس ہوتا ہے تو اپنی ٹرانسفر کیوں نہیں کروا لیتے۔“ اس نے آخر میں اس بات پر زور دیا جو کئی دنوں سے کہہ رہی تھی۔

”اس سلسلے میں میں تمہیں کوئی جھوٹی تسلی بھی نہیں دینا چاہتا۔ یعنی میں اپنی ٹرانسفر نہیں کروا سکتا۔ کیونکہ یہاں براؤنچ کھولنے کا مشورہ میرا تھا۔ اور میرے ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ہی ایم ڈی نے اس پر عمل کیا تھا۔ اب اگر میں ہی.....“

”بس یہ آفیشل باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں اور جو میرے سمجھنے کی بات تھی، وہ میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید تفصیل سے روک کر بولی۔

”کیا سمجھ گئی ہو؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

یہی کہ آپ کی ٹرانسفر نہیں ہو سکتی اور آئندہ میں اس سلسلے میں کچھ نہ کہوں؟“ وہ حسب عادت اتر کر لمبی جیسے کوئی تیر مار لیا ہو۔

”گلد، تم شروع سے اتنی سمجھ دار ہو یا میری صحبت کا اثر ہے؟“ انہوں نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا تو وہ مزید گردن اکڑا کر بولی۔

”شروع سے یعنی بچپن سے، ہر بات بہت جلدی سے سمجھ لیتی ہوں۔ بس ایک بات آج تک سمجھ نہیں آئی۔“

”وہ کیا؟“ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

”وہ یہ کہ میں تو آپ کے گھر آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی سے پیش آئی تھی پھر آپ نے کیسے مجھے پسند کر کے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا؟“ وہ اکثر سوچتی تھی اور پوچھ آج رہی تھی۔ جس پر وہ کہنے لگے۔

”یہ بات تو تمہیں اول روز ہی پوچھنی چاہیے تھی۔ بہر حال اس کا جواب یہ ہے کہ مجھے لڑکیوں کا اجنبیوں سے اخلاق برتنا اچھا نہیں لگتا۔ اس روز اگر تم یہ کہتیں کہ جی آؤ رہائی تو گھر پر نہیں ہیں، آپ بھی گئی ہوئی ہیں۔ آپ ڈرانگ روم میں بیٹھ کر انتظار کر لیں وغیرہ وغیرہ تو شاید میں کبھی بھی تمہارے بارے میں نہ سوچتا۔“

”اور میرا خیال تھا یا تو آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ آپ کی شادی مجھ سے ہو رہی ہے یا پھر انا تھا مگر رہے ہیں۔“

”ہوں۔ اور مجھے خبر دار کرنے کے لیے تم نے رات کے دو بجے فون کیا تھا۔“ انہوں نے قدرے سوچتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ صاف مگر گئی۔

”جی نہیں، میں نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔“

”اچھا۔ پھر وہ کون تھی جو بہت محبت جتا رہی تھی پھر منتیں کرنے لگیں کہ خدا را اس واقعے کو بھول جائیں، میں بہت شرمندہ ہوں۔“ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہے تھے یہ سنتے ہی اچھل پڑی۔

”محبت کب جتا ئی تھی میں نے اور منتیں۔“ ان کے ہونٹوں پر پھیلتی مسکراہٹ سے وہ پہلے ٹپٹا گئی پھر جھینپ کر بولی۔ ”بہت خراب ہیں آپ۔ اب بات نہیں کیجیے گا مجھ سے۔“

”اچھی بات لیکن ایک خوشخبری سن لو، تم ایک عدد جیتنے کی پھوپھی جان بن چکی ہو۔“

انہوں نے اچانک یاد آنے پر بتایا تو وہ خوشی سے چلائی ہوئی بولی۔ ”سچ، آپ کو کیسے پتا!“

”آج آفس میں تمہارے چھوٹے بھائی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا اور ہاں تمہیں سلام وغیرہ بھی کہہ رہے تھے۔“

”ولیکم السلام، کیسے ہیں سب لوگ؟ آپ گھر میں فون کیوں نہیں لگوا لیتے۔“ اسے ایک دم فون کی کمی محسوس ہونے لگی۔

”کہہ رکھا ہے مکان مالک سے، اس مہینے لگ جائے گا۔ نہیں تو ہم گھر بدل لیں گے۔“

”چلیں۔ جیتنے کی خوشی میں آپ کو زبردست چائے پلاتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ جبکہ دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ سب لوگ یاد آنے لگے تھے، امی، بھابھی، بھائی جان، چھوٹے بھائی اور اب ننھا بھتیجا۔ کتنی خوش ہوں گی امی اور اس گھر میں کتنی رونقیں سمٹ آئی ہوں گی۔ اس وقت اس کا دھیان ادھر رہنے لگا تھا۔

ایک دو بار احسن سے کہا بھی کہ کچھ دنوں کے لیے چلیں اور انہوں نے ٹالا تو نہیں، نہ ہی فوری جانے کی ہامی بھری، صاف گوئی سے اپنی مصروفیت بتا کر اگلے مہینے چلنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ تو دن گننے لگی تھی۔ اور ابھی کچھ دن باقی تھے کہ عمیر، امی کو لے کر آ گیا۔ ان کی آمد سے بھی وہ بہت خوش ہو گئی تھی۔

”کتنی کمزور ہو گئی ہے بچی۔ اپنوں سے دور لا کر اکیلی جو کر دیا ہے تم نے اسے۔“ امی، احسن پر خفا ہونے لگیں۔ ”یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ پہلی بار بچی گھر والوں سے دور ہوئی ہے۔ مہینے پندرہ دن بعد ملانے لے جاتے۔ تم تو یوں قبضہ جما کر بیٹھ گئے ہو جیسے اب اور کسی کا حق ہی نہیں رہا اس پر۔ کئی بار اس کی امی کا فون آچکا ہے۔ چھوٹے ہی پوچھتی ہیں کہ کب آ رہے ہیں بچے۔“

”بچے بڑے ہو جائیں، ان کے پر نکل آئیں تو وہ اپنا الگ گھونسلہ بنا لیتے ہیں۔“ امی کی خفگی پر وہ جزبہ ہو کر بولے۔

”یہی فرق ہے انسانوں اور جانوروں میں کہ انسان اپنا پہلا گھونسلہ کبھی نہیں بھولتا۔ گھوم پھر کر وہاں ضرور آتا ہے خواہ سستانے کو ہی سہی۔ تم دنیا سے نرالے ہو کیا؟“

”آپ خواجواہ بگڑ رہی ہیں۔ ہم اب کچھ دنوں میں آنے والے تھے۔ پوچھ لیں

رومیہ سے۔“ انہوں نے چائے لاتی رومیہ کو دیکھ کر کہا تو وہ فوراً بولی۔
”جی امی! ہمارا اسی مہینے کا پروگرام تھا۔ چلیں اچھا ہوا آپ آگئیں مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

”بیٹا! تمہاری امی تمہارے لیے بہت اداس ہیں۔ تمہیں ان سے ملنے جانا چاہیے۔ تم احسن سے کہتی نہیں ہو یا یہ تمہاری بات نہیں مانتا؟“ امی نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے نرمی سے پوچھا تو وہ قدرے رک کر بولی۔

”ان کی مصروفیت دیکھتے ہوئے میں نے خود ہی نہیں کہا۔“
”خیر، اب تم ہمارے ساتھ چلنا، میں خاص طور پر تمہیں لینے آئی ہوں۔“ امی نے کہا تو وہ احسن کو دیکھنے لگی۔ جانے وہ متوجہ نہیں تھے یا قصداً انجان بن گئے تھے۔
”میں زیادہ دن نہیں رہوں گی، کیونکہ عمیر کو بس تین دن کی چھٹی ملی ہے۔ آج کا دن تو یوں بھی نکل گیا۔ پرسوں چلیں گے۔“

”پرسوں نہیں امی، آپ ہمارے ساتھ چلیے گا۔ عمیر کو جانے دیں۔“ اس نے کہا تو عمیر فوراً بولا۔

”جی نہیں، امی میرے ساتھ ہی جائیں گی، آپ بے شک اپنے پروگرام کے مطابق آئیے گا۔“

”کوئی پروگرام کے مطابق نہیں، یہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔“

امی کے حتمی انداز پر وہ خاموش ہو رہی تھی، لیکن رات میں احسن سے ضرور کہا کہ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اور چاہتے تو وہ بھی یہی تھے لیکن پھر انہیں امی کی بات ٹھیک لگی کہ وہ اگر ساتھ گئے تو تین چار دن بعد واپس آتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ لانا چاہیں گے اور اتنے کم دنوں میں نہ تو وہ میسے میں رہ سکے گی نہ امی کا اسے اپنے ساتھ رکھنے کا ارمان پورا ہوگا یوں امی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے انہوں نے اسے بھی سمجھا دیا کہ وہ دس پندرہ دن بعد اسے لینے آجائیں گے۔

پھر گو کہ احسن نے اسے اپنی طرف سے اطمینان دلادیا تھا پھر بھی وہ ان کی فکر ساتھ لے کر آئی تھی۔ کہ انہیں کھانے کی پرالیم ہوگی۔ کپڑے خود پر لیں کرنے پڑیں گے اور زیادہ ان کی تنہائی کا خیال تھا۔

”آفس سے آنے کے بعد بہت بور ہوں گے احسن۔“ شام اتر رہی تھی جب اس نے عمیر کو دیکھ کر کہا تو وہ چھوڑ کر بولا۔

”جی نہیں، شکر کر رہے ہوں گے بھائی کہ جان مٹھوٹی ایسی باتوں کی لڑکی سے۔ کچھ دن عیش کریں گے، دیکھا نہیں تھا جب آپ آ رہی تھیں تو وہ کتنے خوش ہو رہے تھے۔“
”وہ تمہیں خوش نظر آ رہے تھے؟“ وہ چیخ کر چیخی۔

”اور کیا پوری بیتی باہر تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ان کے دانت نہیں دیکھے تھے۔“ عمیر اس کے غصے سے مظلوم ہو رہا تھا۔

”تم بالکل احمق ہو، تمہیں خوشی اور غم کی کیفیت میں تمیز نہیں ہے۔“
”آپ کا مطلب ہے، وہ غمزدہ تھے۔ اچھا اچھا۔ میں سمجھ گیا کہ آپ کی جدائی کے خیال سے نہ صرف پریشان بلکہ یوں بوکھلا گئے تھے کہ آنسو کے بجائے دانت نکال رہے تھے۔“ عمیر نے اس کی گھورتی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

”تم.....!“ وہ اسے مارنے کے لیے ادھر ادھر کوئی چیز تلاش کرنے لگی تو وہ ہنستا ہوا اٹھ کر بھاگ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح جب عمیر آفس جانے کے لیے تیار ہوا تو امی سے اجازت لے کر وہ بھی اس کے ساتھ نکلی آئی، کیونکہ اب اس سے مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔ جب تک دوسرے شہر میں تھی تو اور بات تھی۔ اب تو ایک رات بھی بھاری گزری تھی۔ امی کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے چلانا شروع کر دیا۔

”امی! بھابھی! میں آگئی۔“

امی اپنے کمرے سے اور بھابھی کچن سے نکل کر آگئیں۔ تو دونوں سے گلے مل کر اس نے فوراً منے کا پوچھا۔

”تو بھتیجے کی محبت کھینچ لائی ہے تمہیں۔“ امی نے ایک بار پھر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔

”صرف اس کی نہیں آپ سب کی محبت۔ تب ہی بھابھی منے کو لے کر آگئیں اور اس

کی گود میں ڈالتے ہوئے بولیں۔

”اللہ تمہیں بھی ایسا ہی چاند سا بنیادے۔“

”آمین!“ امی نے کہا پھر پوچھنے لگیں۔ ”کس کے ساتھ آئی ہو، احسن کہاں ہیں؟“

”احسن نہیں آئے۔ مجھے کوئٹہ سے امی اور عمیر لے کر آئے ہیں۔ اور ابھی یہاں عمیر چھوڑ کر گیا ہے۔“ اس نے منے کے ساتھ کھیتے ہوئے امی کی بات کا جواب بھی دے دیا۔

”عمیر کو اندر نہیں بلایا؟“

”وہ آفس جا رہا تھا۔ چلا گیا۔“

اس کی مصروفیت ہنوز تھی۔ جب ہی امی نے مزید سوال جواب بعد کے لیے اٹھار کھے اور بھابھی کو چائے لانے کا اشارہ کر کے اسے منہ کے ساتھ کھلکھلاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ اس کے چہرے پر دیسی خوشیوں کا نکھار تھا جن کی ایک ماں اپنی بیٹی کے لیے آرزو کرتی ہے، دعائیں مانگتی ہے اور اپنی دعاؤں کی قبولیت پر امی کے اندر جہاں ڈھیروں اطمینان اتر رہا تھا شکر بھی کر رہی تھیں۔

پھر امی کے فون کرنے پر دو پہر میں آپنی بھی بچوں کے ساتھ آگئیں تو گھر میں خوب رونق ہو گئی۔ جس پر وہ اپنے آپ ہی حیران ہو کر کہنے لگی۔

”میں ایسی بالکل کے بغیر زندہ ہوں، حیرت ہے۔“

”یہ بالکل بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، کوئی آثار ہیں؟“ آپنی نے فوراً احساس دلا کے پوچھا تو اس نے جھینپ کرنی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں، چھ مہینے تو ہو گئے ہیں تمہاری شادی کو، کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔“

”نہیں۔“ بھی خیال ہی نہیں آیا۔ ”اس کی صاف گوئی پر آپنی کہنے لگیں۔

”کوئی ٹوکنے والا جو نہیں ہے وہاں۔ یہاں سسرال میں سب کے ساتھ رہتی ہوتیں

تب تو خیال آتا۔ بہر حال اس معاملے میں لاپرواہی نہیں کرنا بلکہ یہیں سے اپنا چیک اپ کر دالو تو اچھا ہے۔ وہاں جا کر پھر بھول جاؤ گی۔“ اس نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

پھر تیسرے ہی دن عمیر اسے لینے آ گیا۔ جبکہ وہ امی سے پانچ چھ دن کا کہہ کر آئی تھی اور انہوں نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ خوشی سے اجازت دی تھی اور عمیر سے بھی اس نے یہی کہا لیکن وہ بھند تھا۔

”آپ کو ابھی چلنا ہے کیونکہ گھر میں کافی لوگ صرف آپ سے ملنے کے شوق میں آ رہے ہیں اور عائشہ بھی آئی ہوئی ہے۔ آپ دو چار دن وہاں رہ لیں پھر جب کہیں گی یہاں لے آؤں گا۔“

”عمیر ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹی!“ امی، عمیر کی بات سمجھ کر کہنے لگیں، شادی ہوتے ہی تو تم کوئٹہ چلی گئیں۔ اب آئی ہو تو سب سے مل لو۔ دو چار دن میں پھر آ جانا۔“

”میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔“ عمیر اسے اٹھتے دیکھ کر بولا تو وہ کچھ رد شدہ روٹھے انداز میں اسے گھورتی ہوئی باہر نکل آئی۔

گھر میں عائشہ اس کی منتظر تھی اور وہ بھی اسے دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئی۔ اس سے گلے ملنے کے بعد باقاعدہ اس کے سراپے کا جائزہ لینے لگی تو وہ اپنے سامنے دو پٹہ پھیلاتے ہوئے ٹوک کر بولی۔

”کچھ خیال کر دو، عمیر بھائی آرہے ہیں۔“ وہ اپنی حرکت پر خود ہی ہنسنے لگی۔ اور جیسے ہی عمیر قریب آیا اسے دیکھ کر بولی۔

”سنا ہے۔ تم ماموں جان بننے والے ہو.....؟“

”جبکہ مجھے چاہا بننے کا زیادہ شوق ہے۔ کب بتا رہی ہیں؟“ عمیر نے الٹا اسے بوکھلا دیا تھا۔ جس پر عائشہ کو ہنسنے کا موقع مل گیا۔ اس نے باری باری دونوں کو دیکھا پھر ایک دم صوفے سے کٹھن کھینچ کر عمیر پر یوں برسنا شروع کیا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ بمشکل عمیر اس کے ہاتھ سے کٹھن لے کر جوابی کارردائی کرنا چاہتا تھا کہ وہ امی کو پکارتی ہوئی ان کے کمرے میں بھاگ گئی۔

پھر سارا دن عائشہ کے ساتھ بیٹھی وہ کبھی اس کے حالات سنتی کبھی اپنے بتاتی۔ اور اس کی ہر بات کی تان اس پر ٹوٹ رہی تھی کہ اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے وہ بہت بورر رہی تھی جس پر عائشہ نے اسے کئی مشورے دے ڈالے۔ کوئی کلب جو آئن کر لو، کوئی گنگ کی کلاسیں لے لو یا کوئی لینگوئج کورس وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ہر مشورے پر یوں سر ہلایا جیسے اسے بہت پسند آیا ہو اور یہ صرف عائشہ کو دکھانے کے لیے تھا۔ درنہ خود اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کسی ایک پر بھی عمل نہیں کرے گی۔ بہر حال شام تک عائشہ کے ساتھ اس کا بہت اچھا وقت گزرا۔ پھر اس کا شوہر آصف اسے لینے آ گیا تو اس نے زبردستی انہیں رات کے کھانے

تک روکا تھا۔ اور اس دوران کئی بار انہیں کوسہ آنے کی دعوت دی۔ پھر ان کے جانے کے بعد امی عشاء کی نماز کے لیے اٹھ کر گئیں تو وہ عمیر کے پاس آ کر کہنے لگی۔

”سنو، مجھے کوئی اچھی سی فلم لادو۔“

”آج کل ساری فلمیں بکواس آرہی ہیں۔“ عمیر کا انداز ٹالنے والا تھا۔

”چلو۔ میں بکواس ہی دیکھ لوں گی۔“ وہ بھی ٹلنے والی نہیں تھا۔ جس پر وہ چڑ کر بولا۔
”دیکھنی ضرور ہے۔“

”ہاں۔ کیونکہ مجھے نیند نہیں آرہی، اٹھو پلیز۔ اچھے بھائی ہوناں۔ میں تمہیں فرسٹ کلاس چائے پلاؤں گی۔ اور ہاں فی وی اور وی سی آر میرے کمرے میں رکھ دینا۔“ اس اتنی لجاجت سے کہا کہ عمیر نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”آپ بھی چلیں، ذرا آؤ تنگ ہو جائے گی۔ اور فلم بھی اپنی پسند سے لے لیجیے گا۔“

”لیکن میں تو تمہارے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں۔“ اس نے اس انداز سے کہا جیسے پوچھ رہی ہو پھر چائے تو نہیں پوگے ناں۔

”چائے رہنے دیں، آئس کریم کھائیں گے۔“ عمیر گاڑی کی چابی اٹھاتا ہوا بولا۔ تو وہ خوش ہو کر امی کو بتانے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”اپنے شہر کی کیا بات ہے۔“

وہ جگمگاتی روشنیوں اور ٹریفک کے اڑدھام کو دیکھ کر بار بار یہی جملہ بول رہی تھی۔ احسن کے ساتھ تو اس نے زندگی کو اس انداز سے انجوائے کیا ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس فوراً ہی روٹین لائف شروع ہو گئی تھی اور وہ اس میں خوش تھی کیونکہ احسن کی شخصیت ہر پہلو سے متاثر کرنے اور چھا جانے والی تھی۔ اور غالباً ان کے سحر میں گرفتار ہو کر اس کے لیے باقی ساری باتیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اب اچانک دل میں اس خواہش نے انگڑائی لی تھی کہ کاش عمیر کی جگہ احسن ہوتے۔

”پتا ہے۔ میں اس وقت آپ کو طارق روڈ کیوں لے جا رہا ہوں۔“ عمیر نے ایک اچنتی نظر اس پر ڈال کر کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”آئس کریم کھلانے۔“

”صرف آئس کریم کھلانے نہیں۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے۔“

”کوئی لڑکی پسند کر لی ہے۔“ اس نے فوراً کہا تو عمیر نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں اور سیدھا ہو کر پہلے پارکنگ کے لیے جگہ تلاش کی پھر اسے بیٹھ رہنے کا اشارہ کر کے خود ہی آئس کریم لینے چلا گیا۔ جس سے وہ یہی سمجھی کہ اس کی بات اسے پسند نہیں آئی۔

”لیجیے۔“ عمیر نے بیٹھنے سے پہلے آئس کریم اسے تھما دی۔ پھر احتیاط سے گاڑی ٹریفک میں سے نکال کر مین شاہراہ پر آیا تو پوچھنے لگا۔ ”ہاں تو کیا کہہ رہی تھی آپ؟“

”میں نہیں، تم کچھ کہنے والے تھے۔ کوئی ضروری بات۔“ اس بار وہ سنجیدہ تھی۔ ”ضروری بات وہی ہے جو آپ نے سمجھ لی، یعنی مجھے فضا سے عشق ہو گیا ہے۔“ عمیر کے نزدیک اب یہ کوئی دھماکے والے خبر نہیں رہی تھی کیونکہ وہ پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ لیکن اس نے تو یونہی شرارتا کہا تھا تصدیق پر اچھل پڑی۔

”واقعی، کون ہے فضا؟“

”آفس میں میرے ساتھ کام کرتی ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ امی کو جواب کرنے والی لڑکیاں پسند نہیں ہیں اور شاید احسن بھائی کو بھی۔ اس لیے آپ کو میری مدد کرنی ہے یعنی ان دونوں تک نہ صرف میری بات پہنچائیں بلکہ فضا کے حق میں فیصلہ بھی کروانا ہے۔“ عمیر نے مسئلہ بتا کر باقی ذمہ داری اس پر ڈال دی تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔

”تمہاری بات تو میں ان تک پہنچا سکتی ہوں اور جہاں تک ممکن ہو، سفارش بھی کر دوں گی لیکن۔“

”اوں ہوں۔“ وہ ٹوک کر بولا۔ ”میں لیکن ویکن نہیں سننا چاہتا ویسے مجھے یقین ہے آپ کی سفارش سے ہی میرا کام ہو جائے گا، کیونکہ احسن بھائی اور امی بھی آپ کو بہت چاہتی ہیں۔“

”یہ تو ہے.....“ وہ گردن اکڑا کر ہنسی پھر کہنے لگی۔ ”پہلے مجھے فضا سے ملواؤ میں دیکھوں گی، آیا وہ لڑکی اس قابل ہے کہ اس کی سفارش کی جائے۔“

”جناب! وہ ہر لحاظ سے آپ سے۔“ وہ کہنے جا رہا تھا اچھی ہے لیکن فوراً سنبھل کر بولا۔ ”کم ہے یعنی کم تر۔“

”بڑے استاد ہو۔“

کچھ دیر پہلے اس کے ہونٹوں پر مضبوط ہاتھ تھا جس نے اس کی آواز دبا دی تھی۔ اور اب وہ اپنے ہی ہاتھ ہونٹوں پر جمائے بیٹھی تھی۔ اس کے باوجود وقفے وقفے سے اس کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جو اسے مزید خوفزدہ کر رہی تھیں۔ قیامت تو وہی تھی۔ جو اس پر گزر گئی تھی۔ اب کیا رہ گیا تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا۔ اپنے بدن کا پورا زور لگا کر اتنی زور سے چیخے کہ اس تاریک سنائے میں اس کی آواز صور پھونکنے کا کام دے لیکن اس کے بدن میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی۔ خود اپنے آپ کو بمشکل سہارا دیے ہوئی تھی۔ انتہائی صدمے کی کیفیت میں وہ کچھ سوچ نہیں پا رہی تھی۔ بس گھورانہ دھیرے میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ زندہ قبر میں اتاری دی گئی ہے۔

کتنی دیر بعد لائٹ آئی تو اس کا کمرہ ایک دم سے بہت روشن ہو گیا۔ اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں ایک پل کو چھپکی تھیں اس کے بعد وہ زوردار چیخ کے سراتے بھاگتی ہوئی امی کے کمرے میں آئی اور انہیں جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

”کیا بات ہے بیٹی؟“ امی نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی اور اس کے آنسو رخساروں پر تسلسل سے بہہ رہے تھے جس سے وہ مزید ہول گئیں۔

”سب خیر ہے ناں، احسن اور وہ عمیر کہاں ہے؟“ امی اٹھنے لگی تھیں کہ وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں مرجاؤں گی۔ میں مرجاؤں گی۔“

”کچھ بتاؤ تو۔ میرے بچے سب کہاں ہیں۔ خیریت سے ہیں ناں؟“ امی کو اپنے بچوں کی فکر لاحق ہو گئی۔

”وہ.....“ وہ سچ بتانے جا رہی تھی کہ کسی نادیدہ ہاتھ نے اس کے ہزٹ دبا دیے۔ اور وہ ایک نلک امی کو دیکھ گئی۔ یہ عورت کتنی شفیق، کتنی مہربان ہے اس کی ماں جیسی لیکن اس کی ماں نہیں ہو سکتی۔

”میں عمیر کو اٹھاتی ہوں۔“ امی پھر اٹھنے لگیں۔

”نہیں۔“ اس نے بے اختیار ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے اور ٹیپ کی طرح شروع ہو گئی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ شاید میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلی تو لائٹ بھی نہیں تھی۔ پورا اندھیرا تھا۔ میں اور ڈر گئی۔ آپ مجھے اپنے پاس سلا لیں۔ میں اکیلی نہیں

”ایک منٹ، میں آپ کے لیے فلم لے آؤں۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی۔ اس نے اتر کر ویڈیو سینٹر کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر گھر پہنچنے تک وہ اسے فضا کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا۔ اور جب ٹی وی اور وی سی آر اس کے کمرے میں رکھنے کا مرحلہ آیا تو اس سے پہلے وعدہ لیا کہ امی کو فضا کے حق میں ہموار کیے بغیر وہ کوئٹہ نہیں جائے گی، اور اس نے بھی بڑے آرام سے وعدہ کر لیا تھا۔ پھر اسے فلم سیٹ کرنے کا کہہ کر وہ دبے پاؤں امی کے کمرے میں آئی اور انہیں سوتے دیکھ کر اسی احتیاط سے لائٹ آف کر کے نکلی۔ گھر کے سارے دروازے بند کیے اس کے بعد چائے بنانے کی غرض سے کچن میں آئی تھی۔ لائٹ چلی گئی۔

”لا حول ولا۔“ وہ بری طرح جھنجھلائی بلکہ تلملائی۔ کیونکہ اس وقت اپنے بستر میں بیٹھ کر چائے پینے کے ساتھ فلم دیکھنے کا خیال سے وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ اور اس لائٹ نے سارا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح جھنجھلائی اندھیرے میں ماچس تلاش کرنے لگی۔ اور کیبٹ میں ماچس تو نہیں ملی۔ البتہ موم بتی ہاتھ آ گئی۔ وہ اسے لیے ہوئے اندھوں کی طرح راستہ چلتی اپنے کمرے تک آئی اور عمیر کا پکار کر پوچھنے لگی۔

”عمیر! ماچس ہے تمہارے پاس؟“

”جی!“ عمیر غالباً اس خیال سے اس کے بستر پر دراز ہو گیا تھا کہ ابھی لائٹ آ جائے گی تو اس کا کام کر کے اپنے کمرے میں جائے گا۔ اس کی آواز پراٹھ کر بیٹھا اور جیبوں میں تلاش کر کے ماچس نکالی پھر تیلی کو شعلہ دکھایا تو وہ جو دروازے میں رک گئی تھی اندر آتی ہوئی بولی۔

”کم بخت لائٹ کو اسی وقت جانا تھا۔“

”ابھی آ جائے گی۔“ عمیر نے اسے تسلی دی اور اس کے ہاتھ میں موم بتی دیکھ کر اسے جلانا چاہتا تھا کہ شعلہ بجھ گیا۔ پھر دوسری تیلی جلانے میں اسے ایک پل لگا تھا اور اس ایک پل میں دو انسانوں کے بیچ آنے والا وہ شیطان تھا جس نے تیلی کے شعلے کو موم بتی تک پہنچنے سے پہلے اس کے وجود میں دھکا دیا تھا کہ وہ کسی طرح اس آگ سے اپنا دامن بچا سکا نہ گھر کی ناموس کا۔

سو سکتی۔“

”ہاں ہاں یہاں سو جاؤ۔“ امی اپنی اولادوں کی طرف سے اطمینان سے ہو کر ایک طرف ہٹ کر لیٹ گئیں تو ان کے برابر لیٹتے ہی اس نے خود کو چادر میں چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد ہی امی کے خراٹوں کی آواز آنے لگی تھی۔ اور اس کی پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح کے قریب جا کر نیند مہربان ہوئی تھی۔

پھر بازو میں سوئی چھپنے سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے دیکھا ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا تھا اور اس کے پیچھے عمیر کی ایک جھلک دیکھ کر ہی اس کے بدن کو عجیب سا جھکا لگا۔ جس سے ڈاکٹر کے ہاتھ میں انجکشن بھی مل گیا تھا۔

”بخار بہت تیز ہے۔“ ڈاکٹر عمیر سے کہنے لگا ”برف کے پانی میں کپڑا بھگو کر سر اور ماتھے پر رکھیں۔ ایک گھنٹے میں اگر ٹمپریچر کم نہ ہو تو مجھے اطلاع کیجیے گا اور یہ میڈیسن چار چار گھنٹے پر دیں۔“

وہ آنکھیں سختی سے بند کیے آوازیں سن رہی تھی۔ پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی اس کے بعد امی کی آواز آئی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے بیٹی؟“ وہ چپ چاپ انہیں دیکھنے لگی تو وہ اس کے پاس بیٹھتی ہوئی کہنے لگیں۔

”تم نے تو رات مجھے بھی ڈر دیا تھا۔ خیر اب اکیلی نہیں سونا۔ تمہارے لیے نئی جگہ ہے ناں اگر چار چھ مہینے یہاں رہی ہو تیں۔ تب تو مانوس ہو تیں اور ہاں صبح احسن کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تو وہ بھی ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا وہ ڈرنے والی نہیں ہے آپ کو تنگ کر رہی ہو گی اس کے اندر درد کی لہر اٹھی تھی جس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہیں چھپانے کی خاطر اس نے پلکیں موند لیں۔ تب ہی عمیر نے کھانسنے کا غالباً اپنی آمد سے خبردار کیا تو اس نے اپنا چہرہ دوسری سمت موڑ لیا۔

”امی! یہ ان کی دوائیں ہیں، یہ دو ٹیبلٹ ابھی دینی ہیں لیکن اس سے پہلے انہیں کھلا دیں۔“ عمیر نے اس کو ساری دوائیں دکھا کر دو ٹیبلٹ الگ سے تھما کر کہا تو امی اٹھتی ہوئی بولیں۔

”ہاں صبح سے ایسے ہی پڑی ہے۔ میں دودھ ڈبل روٹی لاتی ہوں۔“

”وہ.....“ امی کے جاتے ہی عمیر اس سے کہنے لگا۔ ”آپ اگر جاگ رہی ہیں تو پلیز میری بات سن لیں۔ دیکھیں، میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرا یقین کریں جو کچھ ہوا۔ اس میں میرے ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا۔ آپ بخدا آپ میرے لیے بہت محترم ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے اور کرتا رہوں گا۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں یا جو چاہیں سزا دیں، میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔“

”پہلے میں اپنی سزا تو تجویز کر لوں۔“ اس کی آواز میں دکھ کے ساتھ آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔

”نہیں، آپ کا کوئی قصور نہیں۔ میرے اندر کے حیوان نے آپ کو۔“

”تم چلے جاؤ یہاں سے، خدا کے لیے چلے جاؤ۔“ وہ اچانک چیخ پڑی تو عمیر، امی کے آنے کے خیال سے فوراً کمرے سے نکل گیا۔

پھر شام میں احسن کا دوبارہ فون آ گیا، شاید اس لیے کہ صبح اس سے بات نہیں ہو سکتی تھی اور گو کہ اس وقت بھی وہ بخار میں بے سدھ پڑی تھی لیکن ان کے فون کا سنتے ہی اٹھ کر بھاگی آئی اور جھپٹنے کے انداز میں امی سے ریسپور لے لیا۔

”احسن! آپ نے فون کیوں کیا؟ خود کیوں نہیں آئے۔ میں انتظار کر رہی ہوں، فوراً آ جائیں اسی وقت، نہیں تو میں۔“ وہ تیز سانسوں کے درمیان بے ربط بول رہی تھی۔

”رومیل! کیا ہوا ہے، تم ٹھیک تو ہو؟“ ادھر سے انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

”نہیں۔ آپ کو نہیں پتا۔ بس آپ آ جائیں۔“

”اوکے اوکے۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ اسے تسلی دے کر بولے۔ ”ذرا امی کو فون دو۔“

”وہ اسے کمرے میں جا چکی ہیں۔ آپ کو ان سے جو بات کرنی ہے۔ یہاں آ کر کریں۔“ وہ مسلسل آنے پر زور دے رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم اپنا خیال رکھو، میں کچھ ضروری کام نہناتے ہی آ جاؤں گا۔“

”آپ کو سارے ضروری کام چھوڑ کر آنا ہے۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور گو کہ کوئی دھمکی نہیں دی تھی نہ کوئی قسم لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو احسن سارے ضروری کام چھوڑ کر اگلے روز پہلی فلائیٹ سے آن موجود ہوئے اور اسے امی کے کمرے میں لیٹے دیکھ کر تعجب سے بولے۔

”تم واقعی ڈر گئی تھیں۔ لیکن یہاں تو کوئی ایسی خوفناک چیز نہیں ہے۔“
 ”سو تے میں ڈر گئی تھی۔“ اس کے خاموش رہنے پر امی نے کہا پھر پوچھ لگیں۔ ”تم
 ناشتا کرو گے؟“

”جی جو چیز موجود ہے، وہی دے دیں چائے کے ساتھ۔“ انہوں نے بیٹھنے کے لیے
 کرسی بیڈ کے قریب کھینچی لیکن جیسے ہی امی کمرے سے نکل کر گئیں۔ وہ کرسی پیچھے دھکیل کر
 اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے سوتے ہوئے چہرے پر نظریں جمائی تھیں کہ وہ ان کا ہاتھ
 تھام کر رو پڑی۔

”احسن! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے خود سے جدا نہیں کریں، میں مر جاؤں
 گی۔“

”ارے!“ وہ کچھ حیران سے ہو گئے۔ ”میں نے تمہیں زبردستی تو نہیں بھیجا تھا۔“
 ”بس آئندہ نہیں۔ میں آپ کے بغیر کبھی کہیں نہیں جاؤں گی، آپ وعدہ کریں مجھ
 سے۔ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔“ وہ بے سوچے سمجھے بول رہی تھی۔
 ”بے وقوف یہ خیال کیوں آیا تمہیں۔ ان چند دنوں کی دوری سے تمہیں بدحواس کر دیا یا
 مجھ سے بدگمان۔“

”بدحواس۔“ دروازے سے عمیر کی آواز آئی تھی۔ احسن اس کا ہاتھ دبا کر اٹھ ہوئے تو
 وہ پیشانی گھٹنوں پر ٹکا کر اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔
 ”تم بھادج کو لے تو آئے لیکن ان کا خیال نہیں رکھا۔“ احسن، عمیر سے گلے ملنے کے
 بعد شکوہ کر رہے تھے۔

”یہ صرف آپ کو بلانے کا بہانا ہے بھائی! اور کچھ نہیں۔“ عمیر کن اکھیوں سے اسے
 دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مجھ سے شرط لگائی تھی انہوں نے کہ ان کے بلانے پر آپ فوراً چلے
 آئیں گے۔“

”واقعی۔“ احسن کو یقین نہیں آیا۔

”پوچھ لیں ان سے لیکن پہلے ناشتہ، جائیے امی بلا رہی ہیں۔“ عمیر نے بہت سنبھل
 کر اسے مزید سوال جواب سے بچالیا اور احسن کے جاتے ہی آواز دبا کر اس سے کہنے لگا۔
 ”یہ کیا حماقت کر رہی ہیں آپ، بند کریں رونادھونا ورنہ آپ کے لیے بہت مشکل ہو

گی اور خبردار اس معاملے میں کسی پر بھروسہ کیا تو ساری زندگی سر پکڑ کر روئیں گی یہ میرا آپ
 کو مخلصانہ مشورہ ہے، آگے آپ کی مرضی۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ آپ اتنی نادان ہو سکتی
 ہیں۔ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ مرد ساری خطائیں معاف کر سکتا ہے ایک یہی نہیں۔ چھوڑیں
 بستر اور احسن بھائی کو یقین دلائیں کہ انہیں دیکھتے ہی آپ.....“

عمیر بات یہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تو وہ کچھ دیر یونی گم سمٹ بیٹھی رہی اور پھر بستر
 چھوڑ کر سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس وقت بھی اسے ہلکا ٹمپر پچر تھا پھر بھی وہ وارڈ
 روم سے کپڑے نکال کر واش روم میں بند ہو گئی۔

”تمہیں بخار میں نہانے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ جیسے ہی واش روم سے نکلی، احسن
 نے ٹوکا۔

”بخار نہیں تھا۔“ وہ کہتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل پر جا بیٹھی اور کنگھا اٹھا کر بال سلجھانے
 لگی، تو قدرے توقف سے احسن اسے آئینے میں دیکھ کر بولے۔
 ”سنو! میں کل واپس چلا جاؤں گا۔“
 ”کیا مطلب ہے آپ کا، یعنی مجھے چھوڑ کر۔“ وہ پوری ان کی طرف گھوم گئی۔
 ”تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، کل جائیں یا، ابھی۔“ وہ حتمی انداز میں کہہ کر پھر
 آئینے کی طرف گھوم گئی۔

”اچھی بات ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں اور اس وقت اگر تم بہتر محسوس کر رہی ہو تو
 چلو عائشہ کی طرف، اس کے بعد تمہاری امی کے گھر سے بھی ہولیں گے۔“

انہوں نے کہا تو وہ فوراً چلنے کو تیار ہو گئی۔ جیسے یہی چاہ رہی تھی کہ اس گھر سے نکل کر پھر
 کبھی پلٹ کر نہ دیکھے۔ اس کا دل ابھی تک سہا ہوا تھا، اور بہت کوشش سے بھی احسن کے
 سامنے وہ اپنے ہونٹوں پر ذرا سی مسکراہٹ نہیں لاسکتی تھی، جسے ابھی تک تو احسن اس کی
 طبیعت کی خرابی پر ہی محمول کر رہے تھے۔

عائشہ کے گھر پہ بھی وہ چپ چپ سی تھی اور اس کے بعد امی کے گھر میں بھی اس کی
 خاموشی نہیں ٹوٹی حالانکہ دروازے پہلے وہ بہت چہکتی ہوئی آئی تھی، جب ہی امی اور بھابھی بار
 بار ٹوکتی رہیں کہ اسے اچانک کیا ہوا ہے، اس دن تو اچھی بھلی تھی۔

”احسن تو ٹھیک ہیں ناں تمہارے ساتھ۔“ بھابھی بھی نے آخر میں کچھ رازداری سے پوچھا۔ تو وہ الما ان سے پوچھنے لگی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ مرد اپنی بیوی کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے سامنے کچھ اور پوز کرتا ہے۔“ بھابھی نے دامن نہیں بچایا بلکہ حقیقت بتائی۔

”کاش! احسن بھی ایسے ہوتے پوز کرنے والے تو انہیں دھوکا دینا کتنا آسان ہوتا۔“ اس نے دکھ سے سوچا پھر کہنے لگی۔

”احسن بہت اچھے ہیں بھابھی! میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اب دیکھیں۔ کل مجھے بخار ہوا آج یہ پہنچ گئے۔ امی پر خفا ہوئے اور عمیر پر بھی کہ مجھے لے کر آئے تھے تو میرا خیال کیوں نہیں رکھا۔ خیر چھوڑیں یہ بتائیں کہ آپ کو نیند کب آرہی ہیں؟“ آخر میں اس نے موضوع بدل دیا۔

”ابھی تو منا چھوٹا ہے۔ جب چلنے والا ہوگا تب آئیں گے۔ ویسے تم تو ابھی بہیں ہو ناں؟“

”نہیں۔ میں کل احسن کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ اس نے بتایا تو بھابھی واحد خاتون تھی جنہوں نے کہا۔ ”اچھا ہے، تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہیے۔“ ورنہ ان سے پہلے سب نے ٹوکا تھا کہ اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو اور بھابھی کی بات پر وہ کتنی دیر تک انہیں دیکھتی رہی تھی۔

پھر دوپہر کے کھانے تک امی نے زبردستی انہیں روکا اور اچھا خاصا اہتمام بھی کر ڈالا۔ چھٹی کا دن تھا۔ بھائی جان اور چھوٹے بھائی بھی گھر پر تھے اس لیے احسن بور نہیں ہوئے۔ ورنہ صرف خواتین میں وہ کھانے تک رک ہی نہیں سکتے تھے۔ اور کھانے کے بعد بھی وہ بھائی جان کے ساتھ بڑے اطمینان سے بیٹھتے تھے۔ جانے کس موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ وہ سن رہی ہوتی تب تو پتا چلتا۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ پھر کچھ اکٹا کر برآمدے میں نکل آئی۔ امی وہیں نماز کے لیے کھڑی ہو رہی تھیں، اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”کھانے میں دیر ہو گئی۔ ادھر نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ تم بیٹھو میں بس ابھی فارغ ہو جاتی ہوں۔“ اس نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا پھر بھابھی کو دیکھنے لگی جو وضو کے بعد

آستین نیچے کرتی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ بہت تھکے تھکے انداز میں وہی بیٹھ گئی۔

”رومیلا!“ چھوٹے بھائی کے پکارنے پر اس نے چونک کر دیکھا تو وہ اس کے قریب کرسی کھینچتے ہوئے بولے۔ ”ذرا منے کو اٹھا لاؤ۔“

”آپ خود لے آئیں۔“ وہ اٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔

”میں بھابھی کے کمرے میں نہیں جا سکتا۔ تمہیں پتا تو ہے۔ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ اول درجے کی دوغلی خاتون ہیں۔“ چھوٹے بھائی تنفر سے کہہ رہے تھے اور اسے اچانک جانے کیا ہوا۔ ان کے پاس سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی بھابھی کے کمرے میں آئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے ہانپنے لگی تھی۔

”کتابیں اچھا برا کچھ نہیں سکھاتیں۔ انسان اپنے تجربات سے سیکھتا ہے۔“ اسے اپنا تنفر یاد آیا اور جواب میں بھابھی کا دھیما انداز۔

”تب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم دوسروں کے تجربات سے سیکھ لیں۔ اور مجھے یہ بات اپنی زندگی کے کسی تجربے نے نہیں سمجھائی بلکہ دنیا کی سب سے اچھی کتاب نے سکھائی ہے کہ دیورنا محرم ہوتا ہے اس سے دور رہی رہنا چاہیے۔“

”رومیلا!“ بھابھی نے نماز میں سلام پھیرا تو نظر اس پر پڑی، وہ دروازے کے ساتھ لگی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ جا نماز پلیٹ کر اس لے چو جب چلی آئیں اور آہستہ سے اس کا کندھا ہلا کر پوچھا۔

”رومیلا! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”وقت گزر چکا ہے۔ میں لٹ گئی اس لیے کہ.....“ وہ اچانک حواسوں میں آ کر وحشت بھری نظروں سے بھابھی کو دیکھنے لگی کہ کہیں اس کے سامنے وہ کچھ اگل تو نہیں گئی۔

”کیا کہہ رہی ہوں۔ آؤ یہاں آکر بیٹھو۔“ بھابھی اسے تھام کر بیڈ تک لے آئیں۔ اور اپنے ساتھ بٹھا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں تو وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بولی۔

”پتا نہیں بھابھی۔ پرسوں رات میں خواب میں ڈر گئی تھی، اس کے بعد عجیب سی کیفیت ہے۔ بہت خوفزدہ ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بہت سارے لوگ ہاتھوں میں پتھر اٹھائے مجھے مارنے آرہے ہیں۔ کیوں سچ مجھے سگسا کر دیں گے۔“

”نہیں۔“ وہ اسی ناگواری سے کہہ کر اپنے سوٹ کیس پر جھک گئی۔
 ”دیکھیں۔ آپ فاذل کھیل رہی ہیں۔ آپ کو میرا کام کرنا پڑے گا ورنہ“ عمیر نے فوراً اپنے ہونٹ بھیجنے کے لیے جیسے انجانے میں اس کے منہ سے ورنہ نکل گیا ہو یا روانی میں، عام حالات میں یہ دھمکی آمیز لفظ کوئی معنی رکھتا لیکن اس وقت وہ اپنی جگہ سن ہو گئی تھی۔
 ”سوری۔ آپ کچھ غلط نہیں سمجھئے گا لیکن پلیز میرا کام..... میں فضا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے بعد بھی کتنی دیر وہ بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

کونسل آ کر وہی روز و شب شروع ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی زندگی میں شاید خوشی، سکون، طمانیت سب وہیں تک تھا۔ جب وہ یہاں سے نہیں گئی تھی۔ اب تو سب ختم ہو گیا تھا۔ اس گھر میں پہلے بھی وہ سارا دن اکیلی ہوتی تھی۔ بڑے شوق سے گھر کے کام کاج نمٹاتی، میوزک سنتی، ٹی وی دیکھتی اور شام اترنے سے پہلے گوکہ سولہ سنگھار نہیں کرتی تھی پر بھی خود کو یوں سنوارتی کہ احسن دیکھتے ہی خوش ہو جائیں۔ اور وہ واقعی خوش ہو جاتے تھے پھر وہ سارا دن کا کوٹہ پورا کرتی یعنی بے شمار باتیں۔ اور اب تو اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ سارا دن تنہا ہوتی تو جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ کوئی اچھی خوشگوار سوچ نہیں تھی۔ اس کے برعکس خوفزدہ کر دینے والی سوچیں تھیں جو اسے ذہنی طور پر مفلوج کر رہی تھیں۔ اور اس کی ظاہری صحت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ جس کی خود اسے بالکل پروا نہیں تھی۔ کیونکہ اندر احساس گناہ بہت شدید تھا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ خود کو کمزور، مظلوم، بے بس عورت کہہ کر اس احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر اسے لگتا جیسے احسن کی امانت میں خیانت کے بعد ان سے چھپا کر ایک اور گناہ کر رہی ہے اور اس سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ وہ احسن کو سب کچھ بتا کر ان سے رحم کی اپیل کرے لیکن یہاں عمیر کی بات یاد آتی۔

”مرد ساری خطائیں معاف کر سکتا ہے، ایک یہی نہیں۔“

”کیا کروں؟“ اس وقت ان اذیت ناک سوچوں نے اسے غڈ حال کر دیا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر وہ اپنے سر کو زور سے جھٹکے دینے لگی۔ یہ بھی

”ہشت بگلی، جانتی ہوں سگسار کے کیا جاتا ہے؟“ بھابھی نے ہمیشہ کی طرح پیار سے اس کا گال تھپک کر ٹوکا پھر اسے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولیں۔ ”تم تو میری اتنی اچھی پیاری بہن ہو۔ اللہ نہ کرے جو تم سے کوئی ایسا گناہ سرزد ہو۔ اللہ تمہیں ہر برائی سے محفوظ رکھے۔“

اس کا وجود برف ہو رہا تھا۔

”لگتا ہے۔ تم نے کوئی بہت ہی بھیا تک خواب دیکھ لیا ہے۔ شکر و کرو خواب تھا۔ اور اسے اس طرح خود پر طاری کرنے کی بجائے اپنے لیے کوئی اشارہ سمجھو۔ کبھی کبھی خواب راہنمائی کرتے ہیں۔“

”ہاں!“ اس نے دھیرے سے اپنا سر بھابھی کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس وقت وہ پناہوں کی آغوش میں بڑی شانتی تھی۔ اس کا دل چاہا، گہری نیند سو جائے لیکن اسی وقت امی نے پکار لیا۔ وہ بھابھی کے ساتھ کمرے سے نکل آئی تو احسن جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

”چلتا نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا تو اس نے ذرا سا سر ہلایا پھر باری باری سب سے مل کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

گھر آتے ہی اس نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ حالانکہ امی، احسن کے ساتھ الجھ رہی تھیں کہ وہ اسے کیوں ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اس کے باوجود وہ پینلنگ میں لگی رہی کیونکہ اسے ہر حال میں جانا تھا، اور وہ بہت سوچ سوچ کر اپنی چیزیں سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ جیسے دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔

”جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔“ عمیر نے اچانک کمرے میں آ کر کہا تو وہ جو اپنے دھیان میں تھی اچھل پڑی۔ پھر فوراً پیشانی پر بے شمار شکنیں ڈال کر ناگواری سے بولی۔
 ”تم اس طرح منہ اٹھائے کیوں چلے آتے ہو۔ تمہیں اتنی تیز نہیں ہے کہ کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دستک دے لیا کرو۔“

”ارے۔ آپ تو ناراض ہونے لگیں۔ شاید میں نے آپ کو ڈر دیا۔“ وہ یہی سمجھا کہ اس کے اچانک آنے پر وہ خفا ہو رہی ہے۔ جب ہی نادم ہوئے بغیر کہنے لگا ”خیر، میں یہ کہنے آیا تھا کہ میرا کام کیے بغیر آپ کیسے جا رہی ہیں۔ کیا آپ کو اپنا وعدہ یاد نہیں۔“

معالے میں خود پر جبر نہیں کرنا۔“ انہوں نے بہت محبت سے تنبیہ کی تھی۔

پھر ان ہی دنوں گھر میں فون لگ گیا تو وہ دن میں بھی احسن سے بات کرنے لگی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب اس تاریک رات کے خیال سے خوفزدہ ہوتی تو احسن کی محبت بھری باتوں میں پناہیں ڈھونڈتی۔ اور اس کا دھیان تو کسی حد تک بٹ جاتا تھا۔ لیکن ادھر احسن پریشان ہو جاتے تھے کہ آخر وہ کن خدشات میں گھر گئی ہے جو بار بار پوچھتی ہے۔ آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے یا اپنے آپ کہنے لگتی ہے۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی، ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی، وغیرہ وغیرہ۔

”تمہیں یہ خدشہ کیوں ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟“ اس رات اس کے بالوں میں لٹکائیاں پھنسا کر انہوں نے دھیرج سے پوچھا تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ انجانے میں وہ مزید حقائق کر رہی ہے۔ تب بہت سنبھل کر بولی تھی۔

”کیا کروں۔ اکیلی ہوتی ہوں تو عجیب عجیب وہم آتے ہیں۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں اور شاید آپ کو بھی پریشان کرنے لگی ہوں۔ سوری آئندہ آپ کو آفس میں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔“

”سوال میرے ڈسٹرب ہونے کا نہیں ہے۔ تمہارے واہموں کا ہے آخر ان کا کچھ علاج تو ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں ان دنوں تمہیں ریلیکس رہنے کی ضرورت ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر جیسے اس مسئلے کا حل سوچنے لگے۔ تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر بولی۔

”یہ کوئی ایسا مسئلہ تو نہیں ہے جسے آپ باقاعدہ سوچنے بیٹھ گئے۔ پھر سارا دن تو میں ٹھیک ہی رہتی ہوں بس کسی وقت کوئی خیال پریشان کرتا ہے تب میں آپ کو فون کر لیتی ہوں۔ اور آپ سے بات کر کے فوراً اطمینان سے ہو جاتی ہوں۔“

”کوئی اور پرابلم تو نہیں ہے نا؟“ ان کا انداز ایسا تھا۔ ”جیسے تم کچھ چھپاؤ تو نہیں رہیں۔“

”نہیں۔“ وہ ان کے اندز سے نظریں چراگئی تھی۔

اس کے بعد اسے بہت محتاط ہونا پڑا۔ خصوصاً اس وقت جب خوفزدہ اور پریشان ہوتی تو فون کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ اپنے آپ ادھر سے ادھر چکراتی رہتی اور اسے لگتا اس کے پیروں تلے انگارے دبک رہے ہوں اور ساری زندگی ان ہی انگاروں پر چلنا ہے۔

خیال نہیں رہا کہ احسن بھی وہیں موجود ہیں۔ انہوں نے پہلے چونک کر اسے دیکھا پھر اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے اور آہستہ سے اس کی کلاںیاں تھام کر پوچھنے لگے۔

”سر میں درد ہے کیا؟“ اس نے بیک وقت نفی اور اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے پھر پوچھا۔

”ٹیبلیٹ لو گی یا ڈاکٹر کے پاس چلیں؟ میرا خیال ہے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، تم بہت ویک ہو رہی ہو، چلو اٹھو۔ ہری آپ۔“ انہوں نے زبردستی اسے اٹھایا تھا۔

”مجھے احساس ہے رومیلہ! میں تمہیں وقت نہیں دے پا رہا۔ راستے میں وہ اس سے کہنے لگے، ”سارا وقت تمہیں اکیلے رہنا پڑتا ہے۔ بہت پریشان ہو گئی ہو تم۔ اور مجھے بھی اب احساس ہو رہا ہے کہ امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ تم ان ہی کے پاس رہتیں۔ تو میں ہر ویک اینڈ پر وہاں جا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے، ہمیں ایسی ہی سیٹنگ کر لینی چاہیے۔ تم بھی خوش رہو گی۔“

”نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ وہاں جانے کے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔

”ارے۔ تم تو یوں پریشان ہو گئیں جیسے میں پناہیں تمہیں کہاں بھیج رہا ہوں۔ میں کراچی کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے گھر کی۔ پھر وہاں تمہارے گھر والے بھی ہیں۔“

”پھر بھی نہیں۔ مجھے بس آپ کے ساتھ رہنا ہے، مجھے خود سے الگ کرنے کی بات نہیں کریں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔“ اس نے کہا تو احسن نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا پھر زیر لب مسکرا کر بولے۔

”میرا خیال تھا۔ صرف میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

پھر ڈاکٹر کے پاس سے آکر وہ بہت خوش تھے۔ کیونکہ اس نے نئے مہمان کی آمد کی نوید دی تھی۔ اور وہ بھی کسی حد تک بہل گئی تھی۔ اس رات دیر تک احسن کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ بچے کی اس کے مستقبل کی اور اس کے کتنے نام تجویز کر لیے۔

”تم یونہی بولتی رہا کرو، اچھی لگتی ہو۔“ انہوں نے اس کی گزشتہ دنوں کی خاموشی کو اس انداز سے جتایا تھا۔ جس پر وہ سوچ کر کہنے لگی۔

”میرا خیال تھا آپ کو میرا بولنا اچھا نہیں لگتا جب ہی میں خاموش رہنے لگی تھی۔ اور اس کے لیے مجھے خود پر بہت جبر کرنا پڑا۔“

”بے وقوف۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں پہلے ہی تمہیں ٹوک دیتا۔ آئندہ کبھی کسی

”میں نے تو ابھی اپنے راستوں کے پھول بھی نہیں چنے تھے پھر یہ انگارے۔“ اس وقت وہ بہت دل گرفتہ سی سوچ رہی تھی کہ معاڈورنیل نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ یہ احسن کے آنے کا وقت نہیں تھا اس لیے دروازہ کھولنے سے پہلے اس سے حسب عادت پوچھا۔

”کون.....؟“

”میں ہوں عمیر۔“ عمیر کی آواز سنتے ہی اس کی پیشانی پر بے شمار شکنیں پڑ گئیں۔ ٹیکھے لہجے میں پوچھنے لگی۔

”کیوں آئے ہو؟“

”پہلے دروازہ تو کھولیں پھر اپنی آمد کا مقصد بھی بتاؤں گا۔“ عمیر نے سیدھے سادے انداز میں کہا۔

”دروازہ نہیں کھلے گا۔“ اس نے صاف منع کر دیا۔

”کیوں۔ کیا احسن بھائی آپ کو لاک کر کے گئے ہیں؟“

”احسن ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔ تمہیں اگر ان سے ملتا ہے تو اسی وقت آنا۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کر گئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا یعنی ایک گھنٹہ میں یہاں دروازے پر کھڑا ہوں۔“ ادھر سے وہ جھنجھلا کر بولا۔

”تمہاری مرضی یہیں کھڑے رہو یا کہیں جا کر بیٹھ جاؤ۔“

وہ انتہائی نروٹھے پن سے کہہ کر دروازے کے پاس سے ہٹ گئی اور اس کے بعد یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ آیا وہ دروازے پر کھڑا ہے یا کہیں چلا گیا ہے۔ نہ اسے یہ خیال آیا کہ اگر اس نے احسن سے کہہ دیا تو ان کی باز پرس پر وہ کیا جواب دے گی۔ اسے بس یہ فکر تھی کہ وہ کیوں آیا ہے۔ اور اپنے آپ جانے کیا کچھ سوچ کر وہ اتنی پریشان ہو گئی تھی کہ جب احسن آئے اس وقت اس میں دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گھر میں داخل ہوتے ہی احسن اسے نکال باہر کریں گے اور پھر یہ دروازہ اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے جا کر دروازے کا لاک کھولا اور احسن کے اندر آنے سے پہلے ہی بھاگ کر کمرے میں بند ہو گئی۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی۔ اور خود نارمل کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔

”رومیلا! رومیلا!“ احسن پکار رہے تھے۔ وہی ہمیشہ والا انداز تھا تب اسے لگا جیسے وہ ایک دم سے ان کی پناہوں میں آ گئی ہو۔ بہت احتیاط سے دروازہ کھول کر کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی الاؤنج میں آئی تو احسن اسے دیکھتے ہی بولے۔

”دیکھو، عمیر آیا ہے۔“

”السلام علیکم!“ عمیر نے فوراً سلام کیا۔ تو وہ ذرا سا سر ہلا کر رہ گئی۔

”کوئی چائے وغیرہ ملے گی؟“ اس کے بیٹھنے سے پہلے احسن نے چائے کا کہہ دیا تو وہیں سے پلٹ کر کچن میں آ گئی۔ چوہے پر چائے کا پانی رکھا پھر اسٹول پر بیٹھ کر خود کو سرزنش کرنے لگی کہ وہ کیوں اس طرح کے مظاہرے کر کے احسن کو شبہ کرنے کے مواقع فراہم کر رہی ہے۔ اور اسے عمیر سے بھی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کبھی احسن کے سامنے کچھ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اور یونہی خود کو سمجھاتی وہ چائے لے کر الاؤنج میں آئی تو احسن، عمیر سے کہہ رہے تھے۔

تمہاری بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے پاس کسی عورت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ امی یہاں آ نہیں سکتیں۔ ایسا کرو تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

وہ جو ابھی خود کو سمجھا کر کچھ نارمل ہوئی تھی احسن کی آخری بات پر ہذیاتی کیفیت میں مبتلا ہو کر چائے کی ٹرے پھینک کر چیخنے لگی۔

”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”رومیلا! رومیلا!“ احسن نے بھاگ کر اسے تھام لیا۔ ”یہ کیا پاگل پن ہے۔ ہوش کرو۔“

”نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ان کے بازوؤں میں چل رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ اور احسن اسے سنبھالنے کی کوشش میں ناکام ہوئے جا رہے تھے۔

”چلا نا بند کر رومیلا! میں تمہیں کہیں نہیں بھیج رہا۔“ وہ اسے جھنجھوڑنے لگے پھر بہت مجبور ہو کر زوردار تھپس اس کے منہ پر مار کر خاموش کر لیا اور وہ یوں خاموش ہوئی کہ ان کے باؤں میں جھول گئی تھی۔

”مائی گاڈ!“ اسے وہیں صوفے پر لٹا کر انہوں نے دوا دی، ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ تو وہ جو مجرمانہ احساس سے دوچار ہو کر خود کو ملامت کر رہا تھا بس اتنا کر سکا کہ انہیں کندھوں سے

لیتا تو بہت برا ماننا، چلو اٹھو، اپنے کمرے میں چل کر لیٹو۔“

”نہیں میں کہیں نہیں جا رہی۔“

”کم آن یارا میں تمہیں کہیں جانے دوں گا بھلا، اپنے کمرے میں چلنے کی بات کر رہا ہوں۔ خیر اب وہ بھی نہیں کروں گا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اسے بازوؤں پر اٹھا کر کمرے میں لے گئے تھے۔

☆☆☆

احسن اس کی امی کو بلانا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے ان ہی دنوں چھوٹے بھائی کی شادی طے ہو گئی تو وہ خود اسے لینے آ گئے اور ان کے ساتھ جانے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خوشی سے تیار ہو گئی جس پر احسن کو تعجب ضرور ہوا لیکن ٹوکا نہیں کیونکہ وہ اسے کسی بھی طرح خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ چھوٹے بھائی کی شادی میں ابھی پندرہ دن تھے اور انہوں نے اس پر بھی اعتراض نہیں کیا وہ اتنے دنوں کے لیے کیوں جا رہی ہے، بلکہ اس کی خوشی دیکھتے ہوئے شادی کے لیے اچھی خاصی شاپنگ کرائی اور مزید اخراجات کے لیے رقم دے کر بھیجا تھا۔

گھر آ کر وہ امی، بھابھی اور خصوصاً منے کے ساتھ اور بھی بہل گئی تھی۔ سارا وقت اس کے ساتھ لگی رہتی کیونکہ اور کوئی کام امی اسے کرنے نہیں دیتیں تھیں۔ چار پانچ دن اسی طرح گزر گئے۔ یہیں اس کا سرال تھا ایک دو بار امی نے کہا بھی کہ وہ اپنی ساس سے مل آئے لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ جب احسن آئیں گے تب جائے گی اس کی یہ بات امی کی سمجھ میں نہیں آئی، اور اس نے سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اپنے تئیں وہ بالکل ٹھیک کر رہی تھی لیکن اس روز صبح ہی صبح احسن کا فون آ گیا اور اس تمام عرصے میں پہلی بار وہ اس پر خفا ہوئے۔

”کیا تمہیں خاص طور سے یہ سمجھانے کی ضرورت تھی کہ تم امی کے پاس بھی ضرور چلی جانا۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ ان کی بہو وہاں ہے۔“

”آپ کو ہوتا ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پھر کس کے ساتھ جاؤں یہاں سب مصروف ہیں۔“ وہ ان کی خفگی سے خائف ہو کر بولی۔

تمام کمرے میں پڑھایا اور خود یوں سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے اپنے لیے سزا سننے کا منتظر ہو۔

”ہتا نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو۔“ کتنی دیر بعد احسن اسے مخاطب کیے بغیر بتانے لگے۔ ”جب سے یہ تم لوگوں کے ساتھ کراچی گئی ہے، اس کی یہی کیفیت ہے۔ امی نے بتایا تھا یہ وہاں ڈر گئی تھی۔ تمہیں ہتا ہے کی چیز سے ڈری تھی؟“

عمیر نے کم صم انداز میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

”بس یہی خوف ہے اسے کہ کہیں میں اسے چھوڑ نہ دوں۔ میری یقین دہانیوں کے باوجود پریشان رہتی ہے۔ کیا خیال ہے کسی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔“ انہوں نے پوچھا تو عمیر اپنی جگہ پہلو بدل کر بولا۔

”نہیں بھائی ایسی حالت میں انہیں سائیکلو جسٹ کی پاس لے جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

عمیر کا اشارہ اس کی پرنسپلٹی کی طرف تھا انہوں نے سمجھ کر پرسوج انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔

”ایسا کرو۔ تم امی کو یہاں لے آؤ۔ یہ اکیلی ہونے کی وجہ سے بھی زیادہ گھبراتی ہے۔“

”امی فوراً تو نہیں آسکتیں کیونکہ ادھر عائشہ آئی ہوئی ہے۔ اور ڈیوری تک امی کے پاس رہے گی۔ آپ ان کی والدہ کو کیوں نہیں بلا لیتے۔“

عمیر نے امی کی مجبوری بتا کر کہا۔ تو انہوں نے کچھ بے دھیانی میں سر ہلایا کیونکہ اسے دیکھنے لگے تھے جو غالباً ہوش میں آ رہی تھی پھر اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے اور آہستہ آہستہ اس کا گال تھپک کر پکارنے لگے۔

”رومیل! رومیل! میری طرف دیکھو۔ میں تمہیں کہیں نہیں بھیج رہا۔ تم یہیں رہو گی میرے پاس۔“

”وہ اتنے سارے لوگ میری طرف آرہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر ہیں مار ڈالیں گے مجھے۔“ اس کے ہونٹوں سے الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ پریشان ہو کر عمیر کو دیکھا تو وہ فوراً اٹھ کر باہر نکل گیا۔

”رومیل! ہوش میں آؤ۔ کوئی نہیں مار سکتا تمہیں۔“ وہ پھر اس پر جھک گئے۔

”ہوں۔“ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ ”وہ شیطان چلا گیا؟“

”کون عمیر؟“ احسن بے ساختہ مسکرائے۔ ”تم عمیر کو شیطان کہہ رہی ہو۔ وہ اگر سن

اس لیے کہ تم اس دینے والے کا شکر ادا نہیں کرتیں۔“

”آ..... آپ کو کیسے پتا کہ میں مضطرب رہتی ہوں؟“ یہ سچ سچ پریشان ہو گئی۔

”تمہارا ہر انداز ظاہر کرتا ہے، آج صبح جب سے احسن کا فون آیا ہے تم پریشان پھر رہی ہو، انہوں نے کچھ کہا ہے؟“ بھابھی نے ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے پوچھا تو اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر کیا بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں بھابھی! بس یونہی اپنے آپ دل گھبرانے لگتا ہے، پھر عجیب عجیب سے خیال آتے ہیں، کبھی اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی ہے کبھی ساری دنیا سے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولنے لگی تھی۔ کبھی خود کو پاتال میں اترا دیکھتی ہوں کبھی آگ میں، حالانکہ میرے دل میں گناہ کا خیال تک نہیں تھا۔ پھر یہ اذیت میرے حصے میں کیوں آئی۔ شاید اس لیے کہ میں نے آپ کو جھٹلایا تھا ہیں ناں۔“

”مجھے..... مجھے کب جھٹلایا تھا تم نے اور یہ تم کس گناہ کی بات کر رہی ہو؟“ بھابھی نے اس کا ہاتھ ہلا کر پوچھا تو وہ ایک دم ہوش میں آ کر پریشان ہو گئی کہ پتا نہیں انجانے میں کیا کہہ گئی ہے۔

”بتاؤ ناں۔“ بھابھی کے اصرار میں کوئی شک شبہ نہیں تھا جس سے وہ قدرے مطمئن ہو کر بولی۔

”یہ آپ کی بڑائی ہے بھابھی! کہ آپ نے یا نہیں رکھا ورنہ میں نے آپ کے ساتھ خاصی بدتمیزی کی تھی جس سے یقیناً آپ کی دل آزادی ہوئی ہوگی، اور کسی کی دل آزادی کرنا بڑا گناہ ہے ناں۔“

”تم بہت سادہ اور بہت حساس ہو ورنہ میلہ اور یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں اپنی غلطی کا نہ صرف احساس ہوا بلکہ تم اس پر شرمندہ بھی ہو، اور جس گناہ پر انسان شرمندہ ہو کر معافی مانگے تو پھر وہ گناہ نہیں رہتا۔“

بھابھی ہلکے ہلکے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں ”گو کہ میں نے تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانا تھا پھر بھی اگر تمہیں اپنے اضطراب اور بے سکونی کا یہی سبب نظر آتا ہے تو اول تو میرے سامنے ندامت کا اظہار کرنے سے ہی تمہارا وہ گناہ دھل گیا اور اگر تم اس پر بھی

”تم فون کر دیتیں۔ عمیر تمہیں لے جاتا۔“ ان کے لیے اس کا عذر قابل قبول نہیں تھا۔

”عمیر اسی کام کے لیے رہ گیا ہے کیا؟“ وہ چڑ گئی۔ ”مجھے نہیں اچھا لگتا، کل کو اس کی بیوی آجائے گی تو وہ بھی اعتراض کرے گی کہ وہ کس حساب سے میری نوکری کر رہا ہے۔“

”اس میں نوکری کی کیا بات ہے؟“

”بالکل ہے۔ مجھے میکے یا کہیں بھی لانے لے جانے کی ذمہ داری اس کی نہیں ہے، بہر حال میں آج کل میں امی یا اگر چھوٹے بھائی نارن ہوئے تو ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ اس کے روٹھنے پر احسن نے نہ صرف اپنا اہجہ بلکہ موضوع ہی بدل دیا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہنوز منہ پھلا کر بولی۔

”اور مزاج؟“ وہ ان کی مسکراہٹ محسوس کر کے بولی۔

”بہت خراب۔“

”اوکے، جب مزاج ٹھیک ہوگا۔ تب بات کروں گا۔ خدا حافظ۔“ انہوں نے فون بند کر دیا تو کچھ دیر ان کی گیمیں تائیں کھوئے رہنے کے بعد جس اسے سسرال جانے کا خیال آیا تو اس کی وہی کیفیت ہو گئی، پریشان سبھی ہوئی سی کبھی ادھر جاتی کبھی ادھر غائب! اس کے لاشعور میں ایک خوف جڑ پکڑ گیا تھا اور جہاں اس گھر میں عمیر کا نام آتا وہ اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا، دوپہر میں اپنا ادھیان بٹانے کے لیے وہ منہ کو لیے بھابھی کے کمرے میں آئی تو اسے سوتے دیکھ کر مایوسی سے واپس پلٹنے لگی تھی کہ بھابھی نے پکار لیا، وہ جا نماز پر بیٹھی تھیں۔ اسے رکنے کا اشارہ کر کے بقیہ نماز میں مصروف ہو گئیں تو وہ بہت سست روی سے بیڈ کے قریب جا کھڑی ہوئی اور سوئے ہوئے منہ کو دیکھنے لگی پھر کچھ اکتا کر وہاں سے اُٹھ، اور بھابھی کے قریب گھسنے لگی۔ ٹیک کر بیٹھی اور کبھی ان کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی کبھی ان کے ہونٹوں کو پھر ایک دم نکلا نکالیاں تھام کر عاجزی سے بولی۔

”بھابھی! میرے لیے دعا کریں۔“ بھابھی نے بس ایک نظر اسے دیکھا پھر جب نماز سے فارغ ہو گئیں تب کہنے لگیں۔

”تم نماز پڑھا کرو، اللہ نے تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں دی پھر بھی تم مضطرب پھرتی ہو تو

مطمئن نہیں تو معافی مانگ لو۔“

”آپ معاف کر دیں گی؟“ اس نے بہت سادگی سے پوچھا تھا۔

”اللہ معاف کر دیتا ہے، بڑے سے بڑا گناہ، میں کیا چیز ہوں۔ اب پلیز تم مجھ سے معافی مانگنے نہ بیٹھ جانا کیونکہ میں خود بڑی گناہ گار ہوں، اور بہت توبہ کرتی ہوں اللہ سے، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔“ بھابھی کی انتہائی عاجزی نے اسے بھی راستہ دکھا دیا تھا۔

☆☆☆

اس مختصر سے عرصے میں احسن اس میں یہ دوسرا انقلاب دیکھ رہے تھے پچھلی بار جب وہ کراچی سے آئی تھی تو بے حد خوفزدہ، مضطرب اور کسی حد تک نفسیاتی مریض لگنے لگی تھی۔ اور اس بار کسی پرسکون ندی کی مانند اس کے ہر انداز میں دھیمپن اور محسوس کی جانے والی نرمی سمٹ آئی تھی۔ بولنے میں، ہنسنے میں اور چلنے میں تو لگتا تھا جیسے ہر قدم سوچ کر اٹھا رہی ہو پھر بھی سبک رومی میں فرق نہیں آیا تھا، اور جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ پھیلا کر بیٹھی تو لگا تھا کہ اپنے اگلے پچھلے سارے گناہ بخشوا کر ہی اٹھے گی۔ بہر حال اس کا یہ انقلاب بہت خوبصورت تھا جس نے احسن کو اس کا پہلے سے زیادہ گرویدہ بنا دیا تھا، اس وقت وہ اپنے موڈ میں تھے جب وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ان کے پاس آ کر بیٹھی تو کہنے لگے۔

”تمہاری دعائیں کچھ مختصر نہیں ہو سکتیں، ویسے اتنی دیر تک کیا مانگا کرتی ہو؟“

”معافی؟“ اس کے ایک لفظ میں بہت کچھ تھا اور احسن نادان نہیں تھے جب ہی حیران ہو گئے کہ مختصر جواب کے بعد اس نے مزید سوال کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی البتہ تائید کے بغیر نہیں رہ سکے۔

”واقعی انسان کو معافی اور توبہ کرتے رہنا چاہیے۔“ پھر اس کے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا تو نے کر بولے ”چلو اللہ کے حقوق تو پورے کر آئیں، اب ذرا اس کے بندے کے حقوق کا بھی خیال کرو۔“

”بندے کے حقوق ذرا میڑھے ہیں اس لیے۔“

”شٹ اپ؟“ انہوں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

یونہی وقت گزرتا چلا گیا۔ وہ پہلے بیٹے پھر بیٹی کی ماں بن کر اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانے میں لگ گئی تھی۔ اور یہ نہیں تھا کہ وہ سسرال سے بالکل ناتواں بیٹی تھی۔ ہر عید، ہر عید پر تو احسن ساتھ لے کر جاتے، اس کے علاوہ جب بچوں کی چھٹیاں ہوتیں تو امی کے بلانے پر وہ دونوں بچوں کی چھٹیاں ان ہی کے پاس رہتی، اسی کی سفارش سے عمیر اور فضلہ کی شادی ہو پائی تھی۔ اور وہ دونوں بھی خوش تھے بس یہ تھا کہ اس کے اور عمیر کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی تھی جسے کبھی دیکھنے والے بھی محسوس کرنے لگے تھے خصوصاً فضلہ تو کتنی بھی ضرور تھی۔

”بھابھی! میرا خیال ہے۔ آپ عمیر سے عمر میں چھوٹی ہی ہوں گی لیکن ان کے ساتھ بی بیویوں کرتی ہیں جیسے دس گنا بڑی ہوں۔“

”رشتے میں تو بڑی ہوں ناں۔“

”اتنی بھی نہیں کہ وہ آپ کو دیکھتے ہی باادب بالملاحظہ ہو جاتے ہیں آئی مین دیور بھابھی کا رشتہ تو یوں بھی خاصا شوخ چنچل سا ہوتا ہے، مجھے تو حسرت ہے کہ میرا کوئی دیور ہوتا۔“

”اچھا ہے نہیں ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

”عمیر کے مزاج میں تو خاصی شوخی اور رنگینی ہے پھر آپ کو کیسے بخش دیتے ہیں۔ وہ“ فضلہ پھر اسی بات کو لے کر آئی تھی۔ ”اتنا تو وہ احسن بھائی سے بھی نہیں ڈرتے جتنا آپ سے۔“

”ڈرے گا کیوں؟ ہاں عزت کرتا ہے میری۔“ وہ خاصی جزبہ ہو کر بولی تھی۔

”عزت تو وہ اپنے سے بڑے سب کی کرتے ہیں لیکن اس طرح انٹینشن کسی کے سامنے نہیں ہوتے۔“ فضلہ نے کہا تو اسے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”تو تمہیں اس پر اعتراض ہے؟ کہہ دو عمیر سے کہ میرے سامنے انٹینشن نہ ہوا کرے۔“

”ارے آپ تو برا مان لگیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔“

فضلہ کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنی بات سمجھانے میں ناکام رہی ہو، حالانکہ ایسا نہیں تھا

سیدھی سادی بات اور وہ سمجھ بھی گئی تھی لیکن جواب میں اسے کیسے سمجھائے کہ ایسا کیوں ہے۔ اس لیے الجھ گئی تھی۔ اور بس ایسی ہی باتیں تھیں جو اسے ڈسٹرب کر دیتی تھیں کبھی سوچنے بیٹھتی تو اسے لگتا کہ اس کا گناہ وہ نہیں تھا جو رات کی تاریکی میں سرزد ہوا کیونکہ اس میں تو ایک اس کے ارادے کو دخل تھا نہ نیت وہ دوسرے اس شیطان کے اہنی شکنجے میں وہ بے بس و مجبور تھی۔ اس سے بڑا گناہ وہ تھا جو اس نے بھابھی کی باتیں سمجھنے کے بجائے مفروضے کہہ کر سننے سے ہی انکار کر دیا تھا پھر ان سے ضد بھی باندھ لی اور ساری خرابی وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ روزانہ ان کے سامنے عمیر کے ساتھ نکل جانا، بے شک اس کے دل میں برائی نہ سہی لیکن یہ کیا کم برائی تھی کہ ایک نامحرم پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لینا، وہ یقیناً اس بڑے گناہ کی طرف جانے والی پہلی سیڑھی تھی جس پر اس نے بھابھی کی ضد میں قدم رکھا تھا، اور اب اس کے اندر ملال ہی ملال تھا کہ کاش اس نے بھابھی کی باتیں سنی اور سمجھی ہوتیں پھر ان پر عمل پیرا ہو کر بے شک دوغلی کہلاتی لیکن یوں گناہ گار نہ ہوتی۔ جیسا کہ بھابھی نے کہا تھا، تب وقت گزر چکا ہوتا ہے، اور جو دوسروں کے تجربات سے نہیں سیکھتے، انہیں پھر اپنا تجربہ صرف سکھاتا ہی نہیں رلاتا بھی ہے۔ جسے وہ روتی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں وہ کراچی آئی ہوئی تھی۔ بچوں کی سر دیوں کی چھٹیاں تھیں اور اتفاق سے عید بھی انہی دنوں میں آرہی تھی، اس لیے چھٹیاں ہوتے ہی احسن نے امی کے بلاوے پر اسے بچوں کے ساتھ بھیج دیا تھا اور خود انہیں ہمیشہ کی طرح عید سے ایک دن پہلے آنا تھا، بہر حال بچے، دادی کے پاس آ کر حسب سابق بہت خوش تھے۔ اس کی بیٹی مریم اور عمیر کی بیٹی فرح میں بس دو چار دن کا فرق تھا جب کہ عثمان ان دنوں سے بڑا تھا اور غالباً پہلا اور اکلوتا پوتا ہونے کے ناتے دادی کا بے حد لاڈ بھی تھا اور ان ہی کے لاڈ کے باعث یہاں آ کر کچھ زیادہ شرارتیں کرنے لگتا تھا، وہ ٹوکتی تو امی اکٹا کر اسے ٹوک دیتیں کہ بچہ ہے کہ کھیلنے دو جس سے وہ جربز ہو کر رہ جاتی۔

اس وقت اسے بچوں کی عید کی شاپنگ کے سلسلے میں بازار جانا تھا۔ اس معاملے میں اب وہ کسی کی محتاج نہیں رہی تھی۔ البتہ اسے عمیر سے گاڑی لینی تھی۔ دنوں بچوں کو پہلے

تیار کر کے اس نے عثمان سے کہا کہ وہ چاچو سے گاڑی کی چابی لے آئے۔ اس کے ساتھ مریم بھی چاچو چاچو پکارتی بھاگ گئی تو وہ جلدی سے اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلی گئی، کچھ دیر بعد تیار ہو کر نکلی تو پہلے امی کے کمرے میں جا کر انہیں اپنے جانے کا بتایا پھر اس خیال سے کہ عثمان چابی لے کر گاڑی کے پاس پہنچ چکا ہوگا باہر آئی تو برآمدے کی سیڑھیوں پر فضا اور عمیر بیٹھے نظر آئے، وہ ان کی پشت پر تھی۔ اس لیے بڑے آرام سے انہیں نظر انداز کر کے لان میں مریم اور فرخ کے پیچھے بھاگتے عثمان کو پکارنا چاہتی تھی کہ اس سے پہلے فضا نے اسے پکار لیا پھر اپنے ساتھ بیٹھے عمیر سے کہنے لگی۔

”عمیر! تم نے غور کیا، احسن بھائی کا بیٹا ان سے زیادہ تم سے مشابہت رکھتا ہے۔“

”اف.....!“ وہ اپنی جگہ سن ہو گئی۔ ”یہ فضا کیا کہہ رہی ہے؟“

”دیکھو یہ ہنسا بالکل تمہاری طرح ہے، اس کے ہونٹوں کی تراش، اس کی ناک بس صرف آنکھیں احسن بھائی جیسی ہیں، باقی سب انداز بھی تمہارے جیسے ہیں، مجھے تو یہ احسن بھائی سے زیادہ تمہارا.....“

”شٹ اپ!“ عمیر بڑی زور سے چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جس تیزی سے پلٹا، اسے دیکھ کر اسی تیزی سے دوبارہ اسی جگہ ڈھکے گیا تو وہ فوراً سنبھل کر آگے آئی ہوئی بولی۔

”فضا! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“ اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سخت تنبیہ تھی۔

”کوئی غلط بات کہی میں نے؟ کیا عثمان، عمیر سے مشابہت نہیں رکھتا؟ اور اس میں کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے، چچا سمجھتا ہیں، ایک ہی خون۔“ فضا نے یوں کندھے اچکا کر کہاں جیسے ان دونوں کا رویہ اس کی سمجھ میں نہ رہا ہو۔

”عمیر گاڑی کی چابی دو۔“ وہ فضا کی بات نظر انداز کر گئی اور چابی لیتے ہی بچوں کو اشارہ کرتی برآمدے کے اسٹیپ اتر آئی کیونکہ حرید ایک پل نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو گیا تھا اور اندر ایسا شور تھا کہ باہر کی کوئی آواز سنائی ہی نہیں دے رہے تھی۔ بچے شہر کی رونقیں دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور اس سے جانے کیا کیا سوال کر رہے تھے۔ وہ بس ہوں ہاں میں سر ہلاتی رہی۔ شاپنگ بھی ڈھنک سے نہیں کر سکی، پتا نہیں اور کتنے عذابوں سے گزرنا تھا اسے اس سے تو اچھا تھا کہ پہلے مقام پر سنگار ہو جاتی۔

رات میں وہ سوئے ہوئے عثمان کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی جب فضا پکارتی ہوئی

اندرا کر بولی۔

”بھابھی! وہ گاڑی کی چابی دے دیں، صبح عمیر کو آفس جانا ہے۔“ اس نے یونی کم صم انداز میں ٹیل کی طرف اشارہ کر دیا۔ توفضہ چابی اٹھا کر جاتے جاتے خیال آنے پر پلٹ کر اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”اپنی شاپنگ تو دکھائیں؟“

”کوئی خاص شاپنگ نہیں کی، کیونکہ بچے تنگ کرنے لگے تھے، ایک دو دن میں انہیں چھوڑ کر جاؤں گی۔“ اس نے قدرے رک کر کہا، ساتھ ہی شاپر اٹھا کر فضا کو تھما بھی دیا جس پر جھانکنے اور ہاتھ مارنے کے بعد فضا کہنے لگی۔

”سنا ہے۔ کوئیڈ میں اچھا کپڑا ملتا ہے، آپ وہاں سے کیوں نہیں لیتیں؟“

”بچوں کی ورائٹی یہاں زیادہ ہے۔“

”اچھا میں سوچ رہی تھی۔ آپ کے پاس کوئیڈ آؤں گی تو بہت ساری شاپنگ کروں گی۔ آپ عمیر سے کہیں ناں، مجھے لے کر آئیں آپ کے پاس، میں جب کہتی ہوں، ٹال جاتے ہیں، شاید آپ کی بات مان لیں۔“ فضا کو کوئیڈ جانے کا اشتیاق تھا۔

”عمیر نہیں لے کر آتا تو تم امی کے ساتھ آ جاؤ یا ہمارے ساتھ چلنا۔“ وہ اس کے اشتیاق کو دیکھ کر بولی تھی۔

”یہ ہو سکتا ہے لیکن میں عمیر کے ساتھ آنا چاہتی ہوں۔“ فضا نے کہا تو وہ کیوں کہتے کہتے رہ گئی پھر مسکرا کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ میں عمیر سے کہوں گی تمہیں لے آئے۔“

”مجھے یقین ہے، وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے کاش آپ یہاں رہتی ہوتیں تو آپ کے ذریعے میں عمیر سے اپنی ہر بات منوا سکتی تھی۔“ فضا ہنسی ہوئی اٹھ کر چلی گئی اور وہ اس کے لہجے پر غور کرتی رہ گئی جانے وہ سادگی میں کہہ گئی تھی یا جتا گئی تھی۔

پھر اگلے روز وہ بچوں کو لے کر امی کے ہاں چلی گئی اور جب عید سے ایک روز پہلے احسن آئے تب ان کے ساتھ واپس آئی تھی۔ اس بار امی ان کے پیچھے پڑ گئیں کہ اب انہیں کراچی آ جانا چاہیے یا پھر ہال بچوں کو یہاں سیٹ کر دیں عید کی شام عائشہ آئی تو وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔ ”اسے لگا جیسے سب پہلے سے طے کر کے بیٹھے ہوں کل کراہن کو گھیر لیں

گے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ سب کے سامنے ہتھیاڑ ڈالتے، وہ بول پڑی۔

”بہت مشکل ہے ہمارا یہاں آنا کیونکہ میرے بچوں کو یہاں کی آب و ہوا اس نہیں آتی۔“

”کچھ عرصہ پر اہلم ہوگی بھابھی! پھر سیٹ ہو جائیں گے۔“ عائشہ نے کہا تو اس نے صاف منع کر دیا۔

”نہیں۔ میرا خیال ہے۔ ہم وہیں ٹھیک ہے اور کوئی اتنی دیر بھی نہیں ہیں جو یہاں آنے کے لیے سال بھر پلاننگ کرنی پڑے جب امی بلاتی ہیں آ جاتے ہیں، وہ وہی کہہ رہی تھی جو احسن چاہتے تھے اور وہ بھی سمجھے کہ وہ ان کی طرف سے بول رہی ہے۔ اس لیے خود اطمینان سے بیٹھے رہے تھے۔

☆☆☆

کتنا بہت سارا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے احسن کے ساتھ بظاہر بڑی کامیاب زندگی گزاری تھی۔ بظاہر یوں کہ اس کے اپنے اندر ہمیشہ خلش رہی تھی۔ جس پر وقت بھی اثر انداز نہیں ہوا تھا شاید اس لیے کہ وقفا وقفا کوئی ایسی بات ہو جاتی جو اس کے سکون میں تلاطم برپا کر دیتی جیسے شادی کے بارہ سال بعد احسن نے اپنے تئیں اسے خوشخبری سنائی تھی کہ انہیں پردموٹ کر کے ہیڈ آفس بھیجا جا رہا ہے لہذا اب وہ مستقل کراچی میں رہیں گے۔ تو اس پر اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا حالانکہ اس وقت وہ کراچی جانے سے خوفزدہ نہیں ہوئی تھی لیکن مستقل وہاں رہنے کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا بڑی مشکل سے وہ احسن کو یہ سمجھا پائی تھی کہ کراچی کے ہنگاموں سے اسے گھبراہٹ ہوتی ہے پھر فضا کی آلودگی اسے بیمار کر دیتی ہے۔ وہ زیادہ دن وہاں نہیں رہ سکتی۔ پھر تین چار سال کے بعد اس کے بیٹے عثمان نے شوشہ چھوڑا کہ انہیں..... دادی کے پاس رہنا چاہیے جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن بڑی سہولت سے مریم کے گریجویٹشن کرنے تک ٹال گئی تھی۔ گو کہ اب اسے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن خدشہ موجود تھا ایک گھر میں رہنے سے اس کا یا عمیر کا کوئی بھی انداز احسن کو چوٹا لگ سکتا تھا، جیسے فضا ٹوکتی تھی اور عائشہ نے تو دو تین بار حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”آپ کی عمیر بھائی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے کیا؟“

”نہیں۔“ اس نے بظاہر سرسری انداز میں کہا تھا۔

”پھر کیا بات ہے جو وہ آپ کو دیکھتے ہی کترا کر نکل جاتے ہیں اور آپ کو بھیجی میں نے ان سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ عائشہ کو مطمئن کرنے میں اسے کتنی مشکل ہوئی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔

اور احسن کے سامنے تو یوں باتیں بنا کر وہ انہیں مطمئن کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اسے اور غیر کو سامنے بٹھا کر دونوں کا مسئلہ پوچھنے بیٹھ جاتے۔ بہر حال اپنے طور پر اس نے سوچ لیا تھا کہ جب عثمان کی شادی کا وقت آئے گا تب الگ گھر کی ضرورت کا احساس دلا کر وہ کراچی بسٹل ہونے پر آمادگی ظاہر کرے گی اور اس میں کوئی بہت زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ عثمان انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا اور احسن ابھی سے جاب کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ان دنوں بھی وہ اسی سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے تین دن کا کہہ کر گئے تھے اور آج چوتھا دن تھا جب ہی تشویش کا اظہار کرنے کے بعد اس نے عثمان کو فون کر کے معلوم کرنے کا کہا تو وہ کچھ سستی سے بولا۔

”مئی! آپ خود کر لیں ناں، ویسے آپ کو پریشانی کیا ہے؟ پاپا دادی کے پاس آرام سے ہوں گے۔“

”آرام سے ہوتے تو فون ضرور کرتے۔“ اس نے کہا کہ مریم فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں معلوم کرتی ہوں مئی! عثمان بھائی تو بس ایسے ہی۔“

”ہاں کہہ دو، مجھے پاپا سے ذرا محبت نہیں۔“

”ذرا سی تو ہے۔“ مریم ہنستی ہوئی بھاگ گئی تو اس نے پہلے عثمان کو جلدی سونے کی تاکید کی پھر مریم کے پیچھے آئی اور رک کر اسے فون پر احسن سے باتیں کرتے ہوئے سننے لگی۔ جب وہ فون بند کر کے اس کی طرف پلٹی تب اس نے پوچھا۔

”کب آرہے ہیں؟“

”کل شام میں، کہہ رہے تھے۔ ان کا کام تو ہو گیا تھا لیکن دادی نے روک لیا اور ابھی وہ خود فون کرنے والے تھے۔“ مریم بتا کر یوں دیکھنے لگی جیسے اور کوئی کام.....؟“

”اچھا، اب تمہارا اسٹڈی کا پروگرام تو نہیں ہے؟“ اس نے گھڑی دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں سوؤں گی آپ کے ساتھ۔“ مریم نے کہا تو وہ اسے لائٹ آف کرنے کا کہہ کر

اپنی جگہ پر جا لیٹی۔

”کوئی کہانی سنائیں مئی!“ مریم لائٹ آف کر کے اس کے پاس لیٹی ہوئی بولی تو اس کی بچکانہ فرمائش پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

”اب تم بچی نہیں ہو، چلو سو جاؤ، صبح جلدی اٹھنا ہے، کالج جاؤ گی ناں؟“

”جی.....!“ مریم نے بہت سعادت مندی سے اس کے کندھے پر پیشانی ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں تو اسے تھکتے تھکتے وہ خود ہی سو گئی تھی۔

صبح دونوں بچوں کے جانے کے بعد اس نے حسب معمول پہلے ماسی سے گھر کی صفائی کروائی پھر اسے سودا وغیرہ لانے بازار بھیج کر اپنے لیے چائے بنانے کی غرض سے کچن کا رخ کیا تھا کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے آکر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو.....!“

”جی میں عمیر.....!“ دوسرے عمیر نے اسی قدر کہا تھا کہ اس نے روکے انداز میں

پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”وہ بچے کہاں ہیں؟ عثمان اور مریم؟“ عمیر کے سختی سے انداز پر وہ ٹھٹھک کر بولی۔

”کالج گئے ہیں۔ کیوں؟“

”مجھے ان سے نہیں آپ سے بات کرنی ہے۔ احسن بھائی ابھی یہاں سے روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا آپ اکیلی ہوں گی تو۔“ عمیر جھجک رہا تھا۔ یا شاید اسے اپنی بات کہنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ وہ کچھ ناگواری سے اس کے حریف بولنے کا انتقاد کرنے لگی۔

”ایسا ہے کہ رات امی نے ہم بھائیوں کے سامنے اپنی ٹایک خواہش کا اظہار کر کے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“ عمیر قدرے توقف سے گویا ہوا تھا ”آپ سنیں گی تو آپ بھی پریشان ہوں گی لیکن پریشان ہونے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

”تم اصل بات بتاؤ۔“ اس نے تمہید سے اکٹا کر ٹوکا تو دوسرہ جلدی سے بولا۔

”امی، عثمان اور فرح کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“

”پھر؟“ وہ تنک کر بولی ”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے تمہیں اگر اعتراض ہے تو

صاف منع کر دو۔“

”میرے پاس منع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے کہ میری ایک نہیں تین بیٹیاں ہیں اور تینوں میں سے کسی ایک کی شادی بھی عثمان کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ وجہ میں بتاؤں بھابھی بیگم یا؟“

اس کے ہاتھ سے ریسور چھوٹ گیا تھا اور وہ خود بھی گرنے کو تھی۔ بمشکل صوفے کی بیک تمام کر خود کو سہارا دے کر بٹھایا اور خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر جھولتے ریسور کو گھورنے لگی۔ اس کا ذہن ماؤف تھا اور اندر دور تک سناٹا۔ عمیر مرد تھا۔ سارا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر خود یقیناً آرام سے ہو گیا ہو گا کہ اب باقی جنگ اسے لڑنی ہے۔ اور وہ کہاں تک لڑے گی۔ فرح کے لیے منع کرے گی تو امی سحر کا نام لے دیں گی اس کے بعد کرن تھی اور وہ اس گھر کی ساری لڑکیوں کو ریجیکٹ کرنے کا کیا جواز پیش کرے گی۔

”میرے خدا۔“ اس نے دیکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں میں تمام لیا۔ ”اس عمر میں کسی رسوائی سے پہلے مجھے موت دے دے۔“

”بی بی! یہ سووا؟“ ماسی کی آواز پر اس نے سر اٹھائے بغیر اسے کچن میں جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد سارا دن وہ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر چکراتی رہی تھی۔ عثمان کا لُج سے لوٹا تو کھانا کھاتے ہی کہیں نکل گیا تھا اور مریم حسب معمول سو گئی تھی۔ احسن کا اسے پتا تھا کہ وہ سیدھے آفس گئے ہوں گے اور شام میں ہی گھر آئیں گے۔ ان کے آنے تک وہ چاہتی تھی اس ٹینشن سے نکل جائے لیکن ہر کوشش میں ناکامی نے اسے مزید توڑ دیا تھا جب مریم سو کر اٹھی، وہ بخار میں جل رہی تھی۔

”آپ یقیناً سردی میں باہر نکلی ہوں گی بغیر گرم کپڑے کے۔“ مریم نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے کہا تو وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”نہیں، میں تو سارا دن انگاروں پر چلتی رہی ہوں۔ دیکھو میرے پیروں میں کیسے آبلے پڑے ہیں۔“

”ممی! آپ بخار میں پتا نہیں کیا کیا بولتی ہیں۔ دیکھیں پاپا آ رہا ہیں۔ آپ جلدی سے چائے پی لیں پھر وہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لیے جائیں گے۔“ مریم احسن کی گاڑی کی آواز سن کر جلدی جلدی بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی احسن اندر آئے سلام کرنے کے ساتھ کہنے لگی۔

”تیار ہو جائیں پاپا! ممی کو بخار ہے اور آپ کو پتا ہے ایسی حالت میں وہ کیسی باتیں کرتی ہیں۔“

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ احسن بریف کیس مریم کو تھما کر اس کے پاس چلے آئے۔

”رات فون پر تو مریم نے تمہاری طبیعت کا نہیں بتایا تھا۔ کب سے ہے بخار، ڈاکٹر کو دکھایا؟“

”نہیں صبح تک میں ٹھیک تھی۔“ وہ ان سے نظریں نہیں ملا پائی تو کپ رکھنے کے بہانے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”لاؤ مجھے دو۔“ انہوں نے کپ لے کر ٹرے میں رکھا پھر پوچھنے لگے۔ ”ڈاکٹر کو پاس چلو گی یا اسے یہیں بلاؤں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹیبلٹ لے چکی ہوں، معمولی بخار ہے۔ اس سے اتر جائے گا۔“ اس کے ساتھ ہی مریم کو پکار کر ان کے لیے چائے لانے کا کہا تو وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے وارڈروب کھول کر پوچھنے لگے۔

”عثمان کہاں ہے؟“

”کسی دوست کے ہاں گیا ہے، آتا ہو گا۔“ وہ وز دیدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ وہ اپنے کپڑے لے کر واش روم میں چلے گئے، کچھ دیر بعد ادھر وہ نکلے، ادھر مریم ان کے لیے چائے لے کر آگئی تو اس سے کہنے لگے۔

”بیٹا! اپنی ممی کے لیے سوپ بنا دو، اور ہاں میرے بریف کیس میں ایک پیکٹ ہے، آپ کے لیے فرح نے دیا ہے نکال لو۔“

”اور پاپا! سب لوگ کیسے ہیں وہاں؟“ مریم نے رک کر پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔ البتہ آپ کے چاچو کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ احسن، مریم کو جواب دے کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جب ہی مریم نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

”میرا خیال ہے، تم ڈاکٹر کو دکھا دو، کہیں رات میں پریشانی نہ ہو۔“ اس نے کچھ کہنے کے بجائے کبیل اپنے اوپر یوں کھینچا جیسے اس کا کہیں جانے کا موڈ نہ ہو، اور احسن سمجھ گئے اس وقت وہ کچھ نہیں سننے لگی۔ اگر زیادہ کچھ کہا تو ناراض بھی ہو جائے گی اس لیے موضوع بدل کر

ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے اور جوابات وہ سنتا چاہتی تھی، وہ انہوں نے رات کے کھانے کے بعد جب بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تب کی تھی۔

”امی کی خواہش ہے کہ ہم عثمان کے لیے عیسر کی کوئی ایک بیٹی لے لیں۔ میرے لیے تو وہ تینوں بچیاں ایک سی ہیں، اس لیے میں نے انتخاب تم پر چھوڑ دیا ہے۔“

”میرے خدا!“ اس نے بیٹھانی گھٹنوں پر رکھ لی۔ ”جس گناہ کا میرے دل میں خیال تک نہیں تھا۔ اس کی سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔“

”میں جانتا تھا، انتخاب کرنے میں تم بھی چکرا جاؤ گی، چلو عثمان سے پوچھ لیتے ہیں۔“ وہ محفوظ انداز میں کہتے ہوئے غالباً عثمان کو بلانے چلے گئے تھے۔

”الٹی چوبیس برسوں میں، میں ہر بل معافی اور توبہ کے دروازوں پر دستک دیتی رہی ہوں۔ بھابھی نے تو کہا تھا، اس کے بعد گناہ و مل جاتے ہیں جیسے سرزدی نہ ہوئے ہوں بشرطیکہ انسان اسی پر قائم رہے، اور میں قائم بھی رہی، پھر میرے لیے رسوائی کا سامان کیوں ہو رہا ہے۔“ اس کی پلکوں سے قطرہ قطرہ آنسو گرنے لگے تھے جنہیں انگلیوں پر سمیٹ کر اس نے سر اونچا کیا تھا کہ احسن عثمان کے ساتھ اندر آتے ہوئے بولے۔

”لو بھئی! آگیا تمہارا بیٹا ماں سے پوچھو۔“

اس کی نظریں دونوں میں سے کسی ایک پر نہیں ٹھہر رہی تھیں جب کہ دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہ اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پیلو میں کھڑا ہے۔

”کیا پرالم ہے پایا؟“ عثمان نے اس کی نظروں سے الجھ کر پوچھا تو اس کے پرالم کہنے پر احسن ذرا سامنے پھر اسے اس کی دادی کی خواہش بتا کر تینوں لڑکیوں میں سے انتخاب کرنے کو کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”نو پایا! آئی ایم ساری، مجھے ان لڑکیوں میں سے کسی کا انتخاب نہیں کرنا کیونکہ میں پہلے ہی اپنا لائف پازنر منتخب کر چکا ہوں۔“

”واٹ؟“ احسن بے یقینی سے بیٹے کو دیکھ رہے تھے اور وہ یقین کی منہ لیس طے کر رہی تھی کہ اس کی معافی، توبہ، بارگاہِ یزداں میں قبول ہو کر اس رات کی سیاحی پر پردہ ڈال گئی ہے۔ بہت ہلکی پھلکی ہو کر اس نے بیک پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں اور دل ہی دل میں ان باتوں کو دہرانے لگی جن کی اسے ساری نادان لڑکیوں کو تعلیم دینی تھی۔

”دیور بالکل بھائیوں کی طرح ہوتا ہے بھائی لگتا ہے لیکن وہ بھائی نہیں ہوتا، شیطان ہوتا ہے اور اگر کسی نادان لڑکی نے اسے جھٹلانے کی کوشش کی تو اسی کی طرح سنگساری کے عذاب سہتی رہے گی، تاوقتیکہ اوپر سے معافی کا اعلان ہو جائے۔“

”رومیل۔“ احسن کے پکارنے پر اس نے پلکوں کے درکھول کر انہیں دیکھا تو وہ اسی بے یقینی کی کیفیت میں بولے۔

”سنا تم نے، یہ عثمان کیا کہہ گیا ہے؟“

”آپ ہی کا بیٹا ہے۔“ وہ یقین سے کہہ کر مسکرائی تھی۔

☆☆☆

”ہاں!“ وہ طاق پر سے قاعدہ اور سلیٹ اٹھا کر اپنی چارپائی پر آ بیٹھی۔ تو بابا سائیں قدرے حیرت سے پوچھنے لگے۔

”ارے چھوری! تجھے پڑھنا آتا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے پہلے نہیں کہا پھر کہنے لگی۔ ”علی مراد نے تھوڑا تھوڑا سکھایا ہے۔“

”علی مراد نے!“ بابا سائیں کے ساتھ لتاں بھی ہنسنے لگیں۔ پھر اسی طرح ہنسنے ہوئے بولیں۔

”اُس چھورے کو تو ابھی خود پڑھنا نہیں آتا۔ تجھے کیا پڑھائے گا۔“

”اُسے پڑھنا آتا ہے اماں! اور لکھنا بھی۔“ وہ یقین سے بولی۔ ”پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ اور دیکھ اُس نے مجھے بھی لکھنا سکھایا ہے۔“ اُس نے جلدی سے سلیٹ پر دو تین لفظ لکھ کر سلیٹ اماں اور بابا سائیں کی طرف موڑ دی۔

”کیا لکھا ہے یہ؟“ اماں اور بابا سائیں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر سلیٹ اور پھر اُسے دیکھا۔

”اللہ ایک ہے۔“ اس نے فخریہ بتایا پھر کہنے لگی۔ ”علی مراد کہہ رہا تھا۔ میں بہت جلدی پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤں گی۔“

”بس کر۔“ اماں نے فوراً نوک دیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے پڑھنے لکھنے کی۔ برادری میں کوئی اور چھوری پڑھی ہے جو تو پڑھے گی۔“

اس نے بابا سائیں کی طرف دیکھا اور انہیں اماں کی بات پر سر ہلاتے دیکھ کر بہت خاموشی سے قاعدہ پڑھی ہے جو تو پڑھے گی۔“

وہ فطرتاً صلیح جو تھی یا کمزور اور بزدل کہ کسی بات سے اختلاف نہیں کرتی تھی۔ ویسے ابھی اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ سال۔ اور اس عمر میں لڑکیاں عموماً والدین کی بات مان لیا کرتی ہیں۔ اس نے بھی بغیر کسی بحث کے قاعدہ اور سلیٹ رکھ دی تھی۔

اگلے دن وہ اماں کے ساتھ بیٹھی رلیاں جوڑ رہی تھی لیکن اس کا دھیان مسلسل بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ وہ جانتی تھی علی مراد روزانہ کی طرح اسکول سے واپسی پر پہلے اس کے گھر آئے گا۔ اور کل اسے جو سبق پڑھا کر گیا تھا اس کی بابت سوال کرے گا کہ آیا اس نے

سب موسموں کا ساتھی ہو

وہ بونہی چولہے میں دبی راکھ کرید کرید کر اُس میں چنگاریاں ڈھونڈ رہی تھی۔ گوکہ اب اُسے چولہا نہیں جلانا تھا اور نہ ہی باورچی خانے میں اب کوئی کام تھا لیکن یہ شاید اس کا دل پسند مشغلہ تھا کہ وہ رات میں باورچی خانہ بند کرنے سے پہلے اس طرح راکھ کریدنے لگتی تھی۔ کہیں کہیں سے کوئی چنگاری لپکتی یا کوئی بجھتا ہوا کوئلہ اچانک ہوا ملنے ہی پھر سے جلنے لگتا تو اُس کی آنکھیں یوں جھپکے لگتیں۔ جیسے اُس نے کسی بلبے کے ڈیرے سے کسی زندہ انسان کو کھینچ نکالا ہو اور اب اُسے زندگی کی طرف لوٹتے دیکھ رہی ہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کوئلہ پورا جل اُٹھتا اور کبھی یوں ہوتا کہ یہاں میں راکھ ہو جاتا۔ اور ابھی تک تو ایسا تھا کہ ہر دو صورتوں میں اس کی کیفیت ایک ہی رہتی۔ نہ خوش نہ افسردہ۔ بس ایک ذرا سا شوق۔ کوئلہ جل اُٹھتا تو شوق سے دیکھتی اور وہ بجھ کر راکھ ہو جاتا تو اُٹھ کر اندر چلی جاتی۔

”چل آ چھوری!“ اندر سے اماں پکار رہی تھیں۔

”آئی اناں!“ اس نے وہیں سے جوابا کہا پھر ہاتھ میں پکڑی لکڑی چولہے کے نیچے رکھ کھڑی ہو گئی۔ پہلے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی کام رہ تو نہیں گیا۔ پھر اپنا اطمینان کر کے باورچی خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گئی۔ اناں حسب معمول کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کاٹ کر انہیں جوڑنے میں مصروف تھیں۔ اور بابا سائیں اپنی چارپائی پر نیم دراز ادھر ادھر کی باتیں بلکہ ایک طرح سے خبریں سن رہے تھے۔

”آگ اچھی طرح بجھائی تھی؟“ اسے دیکھ کر لتاں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

پھر علی مراد کی کوشش سے زیادہ اس کی لگن کو دخل تھا کہ بہت جلد اس نے پڑھنا سیکھ لیا۔ اماں سے چوری بابا سائیں سے چھپ کر وہ علی مراد کی لائی ہوئی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھا کرتی۔ جن میں شہزادے شہزادیوں کے قصے ہوتے اور وہ..... نو عمر لڑکی انجانے میں اپنے آس پاس ایک نئی دنیا سچاٹھی۔ ساعتوں میں سفید براق کھوڑے کی ٹاپیں اور آنکھوں میں اس ماورائی مخلوق کے سنے جو کسی بھی آواز پر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کہ کہیں پتھر کا نہ ہو جائے اس کے برعکس سارے جنوں کا خاتمہ کر کے شہزادی کو قید سے رہائی دلاتا ہے پھر اس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔

پہلے وہ یونہی کچھ دیر راکھ سے کھیلنا کرتی تھی۔ اب گھنٹوں دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دینے لگی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کی کیفیات بھی بدلتی گئی۔ کبھی خوش ہوتی۔ کبھی افسردہ۔ گوکہ ابھی دونوں کا مفہوم اس پر واضح نہیں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اچانک خوش کیوں ہو جاتی ہے یا پھر ایک دم اس کا دل بجھ کیوں جاتا ہے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ علی مراد ذرا سا سیانا ہوا تو اسے دوسری کتابیں لا کر دینے لگا۔ جن کو پڑھ کر جہاں وہ شہزادے، شہزادیوں کے تصور سے نکلی، وہاں اس پر شعور و آگہی کے در کھلنے لگے تھے۔ جس سے اس کا تجسس یوں بڑھا کہ وہ بے چین رہنے لگی۔ پتا نہیں کس چیز کی کھوج تھی اسے کہ آنکھیں ہر دم متلاشی رہتیں۔ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ گھر کی فضا میں بھی دیکھی ہی تھیں۔ بابا سائیں کی محبت میں کی تھی نہ اماں کی، پھر بھی پتا نہیں کیوں تشنگی کا احساس ہوتا تھا۔ اور ابھی وہ اندر کی تشنگی کا راز جان بھی نہ پائی تھی کہ اس کے ماما، مامی اس کے لیے علی مراد کا رشتہ لے کر آ گئے۔

اس کی برادری میں یہ کوئی انہونی یا معیوب بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے اس کی خالہ زاد اور چچا زاد بہنوں کی شادی اپنے سے آدمی عمر کے لڑکوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن اس روز اس پر ادراک ہوا کہ کوئی سوچے نہ سوچے لیکن وہ ضرور اپنے لیے الگ اعزاز سے سوچتے لگی ہے۔ اس کی بے نام سی بے چینی اس بات کی غماز تھی کہ وہ اندر ہی اندر ایسی، ہی کسی صورت حال سے خوفزدہ تھی۔

”اماں!“ وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔ ”ابھی تو علی مراد بہت چھوٹا ہے۔“
”ابھی چھوٹا ہے ناں۔ ہمیشہ تو چھوٹا نہیں رہے گا۔“ اماں نے یوں جواب جیسے انہیں

یا دیکھنا نہیں۔ اور ہو سکتا ہے، اماں نے پہلے غور نہ کیا ہو لیکن اب وہ ضرور علی مراد کو ٹوکیں گی۔ اس نے سوچا۔ ایسا نہ ہو، اماں کے ٹوکنے سے علی مراد اسے پڑھانے کا خیال چھوڑ دیے۔ جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اماں کے سامنے قاعدہ رکھ ضرور دیا تھا۔ لیکن پڑھنے سے توبہ نہیں کی تھی۔ پھر وہ کوئی بہت زیادہ نہیں بس اتنا چاہتی تھی کہ اپنی مرضی سے پڑھ اور لکھ سکے۔ مرضی سے مراد جو چیز ہاتھ آ جائے۔ پڑھ لے اور جو لکھنا چاہے لکھ لے۔ اگر وہ ذرا سی سمجھ دار ہوتی تو شاید اماں کو سمجھانے کی کوشش کرتی، لیکن ابھی اس کے اندر صرف ڈر تھا کہ اماں سختی سے منع کر دیں گی اور وہ کبھی نہیں پڑھ سکے گی۔ اس لیے وہ چاہتی تھی۔ علی مراد کو خود ہی کسی طرح سمجھا دے کیونکہ وہ ابھی بچہ تھا۔ پہلے جس کی بات سنتا اس کی مانتا۔

”میں روٹی ڈال دوں اماں!“ وہ اسی بہانے اماں کے پاس سے اُٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ پھر جیسے ہی علی مراد دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

”یہاں بیٹھ جا، ابھی روٹی پک جاتی ہے، کھا کر جانا۔“ اس نے پیڑھی اس کے سامنے رکھ دی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو آواز دبا کر سرگوشی میں کہنے لگی۔

”سن، اماں اور بابا سائیں مجھے پڑھنے سے منع کر رہے ہیں۔“
”کیوں ادی؟“

”پتا نہیں اور وہ تجھے بھی کہیں گے کہ مجھے مت پڑھا۔“

”نہیں پڑھاؤں گا۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔

”نہیں علی مراد!“ وہ مت سے بولی۔ ”بس تھوڑا سا اور پڑھا دینا لیکن اماں اور بابا سائیں کو پتا نہ چلے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سہولت سے مان گیا تو وہ خوش ہو گئی۔ اس کے پھولے پھولے پھولے پر خشکی کا نٹے ہوئے بولی۔

”تو بہت اچھا ہے علی مراد!“

”اڈی! تم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ اور میں نے اماں سے کہا ہے، میں تم سے شادی کروں گا۔“

”کیا؟“ وہ پہلے حیران ہوئی پھر ہنس پڑی۔

اس کا ایسی بات کرنا ناگوار گزرا ہو۔

”ٹھیک ہے۔ نہ وہ بڑا ہوگا لیکن اس وقت تک میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔“ یہ سمجھ اسے کتابوں نے دی تھی ورنہ اس سے پہلے کسی لڑکی نے ایسی بات اگر سوچی بھی تھی تو زبان سے نہیں نکالی تھی۔

”کیوں بوڑھی ہوگی۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔“

”صرف میری عمر مت دیکھو اماں! علی مراد کو دیکھو۔ پورے سات سال چھوٹا ہے مجھ سے۔“

”تو کیا ہوا!“ اماں اطمینان سے بولیں۔ ”شادو کا میاں تو اس سے دس سال چھوٹا ہے۔ اب دیکھو کیسا گھبرو جوان لکلا ہے۔ اور شادو اس کے سامنے کوئی بہت بڑی تو نہیں لگتی۔“

”لیکن اماں!“

”بس کر چھوڑی!“ اماں نے ٹوک دیا۔ ”اب تو اپنے بیاہ کی بات کرے گی۔ تیرے بابا سائیں نے سن لیا تو تیری زبان کھینچ لے گا۔“

وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ ہر دم واری صدقے ہونے والی اماں کیسی کھٹور بن گئی تھیں۔ اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑیں اور ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

پھر جب اماں ہی نے اس کی بات سمجھنے سے انکار کر دیا تو اور کون تھا۔ جس سے وہ کہتی۔ چپ چاپ سر جھکا دیا لیکن اندر وہ بُری طرح ٹوٹنے لگی تھی۔ ابھی تو اس نے پوری طرح اُن سہنوں کی آبیاری بھی نہیں کی تھی جو چپکے چپکے پلکوں میں اترنے لگے تھے اور نہ چاہنے اور چاہے جانے والے جذبے کی شدتوں کو پاسکی تھی کہ اس سے پہلے ہی سب راکھ ہو گیا۔

”زینب شاہ!“ حسب عادت چولہے میں سے راکھ کریدتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”اب عمر بھر تمہیں یونہی راکھ ہونا ہے اور کوئی نہیں آئے گا، اس راکھ میں چنگاریاں کریدنے۔“

”اڈی!“ علی مراد کے پکارنے پر وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ الجھا اُلکھا سا

کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ سر جھکا کر پوچھنے لگی۔ تو وہ وہیں چوکھٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”پتا ہے۔ میرے اماں ابا کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”وہ تیری میری شادی کی بات کر رہے ہیں اور اماں!“

”اڈی!“ ذہنی ہوئی راکھ میں سے کہیں چنگاری اس کی انگلی کو چھو گئی تھی۔ ہونٹوں سے

سسکی کی آواز نکلی اور اس نے انگلی کو دانتوں میں دبایا۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں۔“

”دکھاؤ۔ تمہاری انگلی جل گئی ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا تو وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

”یہ سب تیری اور میری شادی کی بات کیوں کر رہے ہیں۔ تم تو میری اڈی ہو اور مجھ سے بڑی بھی۔“

”میں تمہاری اڈی نہیں ہوں۔“ وہ بھیکے لہجے میں بولی۔

”پھر کیا ہو؟“

”پتا نہیں۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔“

”نہیں۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا۔ ”پہلے کہو تم میری اڈی ہو۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“

”میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ تم بڑی ہو مجھ سے۔“

وہ حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی پھر نفی سے بولی ”جا کر ماما، ماما سے کہو۔ مجھ سے کیوں

الجھتے ہو۔“

”تم نے پھوپھی سے کیوں..... نہیں کہا؟“

”میری بات کوئی نہیں سنتا۔“ وہ بے بسی سے بولی اور اٹھ کر جانے لگی تو وہ اس کا دوپٹا

پکڑ کر برابر کھڑا ہو گیا۔

”دیکھو، میں تم سے کتنا چھوٹا ہوں۔“

”ابھی چھوٹے ہو پھر بڑے بھی تو ہو گئے۔“

اس نے اماں کی بات دہرائی پھر اس کے ہاتھ سے اپنا دو پٹا کھینچ کر اندر چلی آئی۔ آنکھوں میں ڈھیر سا راپانی جمع ہو گیا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر سارا پانی اپنے اندر اتار لیا۔ اب اُسے یہی تو کرنا تھا۔

پھر سیکہ کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ علی مراد رو کر فریاد کرتا رہا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرے گا لیکن ابھی وہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ اپنی بات منوا سکتا یا کہیں بھاگ جاتا۔ مجبوراً اس کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھ گیا۔

اگر تین بار ہاں کہلوا۔ دینے سے یا دلہن بن جانے سے شادی ہو جاتی ہے تو اس کی بھی شادی ہو گئی تھی اور وہ اماں کے گھر سے نکل کر ماما، مامی کے گھر آ گئی۔ علی مراد جو پہلے ماموں زاد تھا اور بلا جھجک اس کے پاس آ جاتا تھا اب شوہر بن کر تو اس کے سائے سے بھی بدکنے لگا تھا۔ وہ ایک روٹھا ہوا بچہ نظر آنے لگا تھا۔ ہر وقت جھنجھلایا ہوا سا جیسے مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جانے پر۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کرے۔ گھروالوں سے تو تزاخ سے بات کرتا اور اسے دیکھتے ہی راستہ بدل لیتا۔ جیسے سب کے ساتھ ساتھ وہ بھی قصور دار ہو۔

یہ صورت حال اس کے لیے نہ ہی پریشان کن تھی اور یہ ہی تکلیف دہ۔ بلکہ اُسے تو سرے سے کوئی غرض ہی نہیں تھی کہ وہ علی مراد کے رویے کو سوچتی۔ البتہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اُسے بہت رُلا تھی کیونکہ وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو چکی تھی جب دل کی زم زم زمین پر کوئلیں پھونتی ہیں تو سارے احساسات ایک کے بعد ایک انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ خود اپنی چوڑیوں کی کھنک چوٹکتی ہے تو ہونٹوں کی کلیاں الگ چٹکنے کو بے تاب۔ بس اشارا چاہیے اور اشارے کی تلاش میں غیر ارادی طور پر اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی اس پر جا ٹھہرتیں جو آنکھیں بند کیے بڑی زور زور سے ہل ہل کر سبق یاد کر رہا ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو اُسے لگتا۔ اس کے ہلنے کی رفتار کے ساتھ ہی گھڑی کی سوئیاں بھی بھاگنے لگی ہیں۔ وقت تیزی سے سرک جاتا اور اس کی جگہ ایک مضبوط و توانا مرد سامنے آ جاتا جس کے اشارے اسے گدگداتے تھے کہ وہ ہنس پڑتی اور ایک روز وہ یونہی ہنس رہی تھی کہ کوئی چیز اس کے منہ پر آ گری۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ علی مراد نے کتاب اُسے کھینچ ماری تھی۔

اور غصے میں کھڑا کہہ رہا تھا۔

”تم میرا مذاق اڑاتی ہو۔“

”نہیں۔“ وہ بس اسی قدر کہہ سکی اور وہ منہ ہی منہ میں پتا نہیں کیا کچھ بکتا ہوا باہر نکل گیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ علی مراد نے آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ مامی نے کہنا شروع کر دیا کہ بہت پڑھ لیا۔ اب اپنے ابا کے ساتھ جا کر کھیتوں میں کام کیا کر۔ پہلے کچھ دن وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر ایک دن چیخ پڑا۔

”مجھے نہیں کرنی ڈیڑوں کی نوکری۔ جو ہمیں جانوروں سے بدتر سمجھتے ہیں۔“

”پھر کیا کرے گا؟“ مامی بھی چلا کر پوچھنے لگیں۔

”میں شہر جاؤں گا۔“ وہ شاید شروع ہی سے تھوڑا باغی تھا۔

”شہر میں تو جیسے تیرے لیے محل کھڑے ہیں۔“

”نہیں کھڑے تو میں خود کھڑے کر لوں گا۔“

”دیکھ رہے ہو مراد کے ابا!“ مامی نے فوراً ماما کو مدد کے لیے پکارا تو وہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے۔

”بٹ شہر میں تو اتنے پڑھے لکھے لوگوں کی نوکری نہیں ملتی۔“

”مجھے ابھی نوکری نہیں کرنی۔ میں ابھی بہت سارا پڑھوں گا۔ اس کے بعد نوکری کا سوچوں گا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”میرے پاس تیری پڑھائی کے لیے خرچہ نہیں ہے۔“ ماما نے اسی وقت صاف جواب دے دیا۔ لیکن وہ اپنے ارادے کا پکا تھا۔

”نہیں چاہیے مجھے خرچا۔ میں خود مزدوری کر لوں گا لیکن پڑھوں گا ضرور۔“ وہ جتنی انداز میں بولا تو ماما مایوسی سے کہنے لگے۔

”جانے دوا سے۔ خود ہی دھکے کھا کر واپس آ جائے گا۔“ وہ دندنا تا ہوا کمرے سے چلا گیا اور اس تمام عرصے میں وہ پہلی بار اس کے پیچھے آئی اور پہلی بار اُسے مخاطب کیا۔

”علی مراد! کیا سچ تم جا رہے ہو؟“

”ہاں کیوں“ اس کا لہجہ بگڑا بگڑا تھا۔

”شہر تو بہت بڑا ہوتا ہے اور تم۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ کیا کہے اُس سے کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔

”دیکھو!.....“ وہ اذنی کہتے کہتے رکا اور بے حد جھنجھلا کر بیک میں اپنے کپڑے رکھنے لگا۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔ جب وہ بیک بند کر کے سیدھا ہوا تب پوچھنے لگی۔
”واپس کب آؤ گے؟“

”کبھی نہیں۔“ اس کا جواب غیر متوقع ضرور تھا لیکن تکلیف دہ ہرگز نہیں وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ اور اسے جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں بولی۔
”جاؤ علی مراد! تمہارا اللہ حافظ۔ میرے لیے تمہا زندگی گزارنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت تمہارے ساتھ کے۔“

اور یہ ٹھیک تو تھا۔ وہ کیسے سچ پر بیٹھ کر ایک طویل مدت کا اس انتظار کرتی رہے اور وہ اس وقت آتے جب اس کے اندر کی ساری چنگاریاں راکھ ہو کر ہوا میں بکھر چکی ہوں۔ وہ کہاں کہاں اس راکھ کو ڈھونڈتی پھرے گی کہ شاید اس میں کوئی چنگاڑی ہاتھ آجائے جو اس کے خوابیدہ جذبول کو دکھانے کا سبب بنے۔

”چھوری! تو نے اسے روکا نہیں۔“ مامی اس پر بگڑتے ہوئے آئیں تو وہ ایک دم سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

”بہت روکا پر نہیں رکا۔“ اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

”واپس کا کب بولا؟“ اس کا دل چاہا اُسی کی طرح صاف کہہ دے کبھی نہیں! لیکن پھر مصلحت سے کام کیا۔

”ہنا نہیں۔ کہہ رہا تھا ابھی تو جا رہا ہوں۔ دیکھو، کب آتا ہوں۔“

”عجیب چھوڑا ہے۔ کسی کی سنتا ہی نہیں۔“ مامی بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں تو وہ پھر وہیں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

کوئی مہینے بھر بعد سے ہی علی مراد کے خط آنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنی اماں کے نام خط لکھتا تھا اور پڑھ کر تو وہی سناتی تھی۔ کہیں بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور جب مامی اس سے جواب لکھواتیں تو وہ بھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھتی تھی۔ یوں

دونوں کے درمیان صرف اتنا رابطہ یا تعلق تھا کہ ایک دوسرے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھتے تھے اور بس۔

پھر کتنا بہت سارا وقت گزر گیا۔ علی مراد نے میٹرک کر لیا تو پتا نہیں کیا سوچ کر اُسے چند کتابیں بھیج دیں اور وہ جو یہاں آنے کے بعد سے بالکل ہی کتابوں سے ناتا توڑ بیٹھی تھی۔ پھر سے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اس کا شوق اتنا بڑھا کہ وہ گھر سے قدرے قاصطے پر ایک ٹیچر رہتی تھیں۔ ان کے پاس جا کر اُن سے انگریزی اور حساب پڑھنے لگی۔ یوں سال بھر بعد ہی وہ امتحان دینے کے قابل ہو گئی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اُسے پڑھنے کا شوق تو شروع ہی سے تھا پھر ذہن بھی تھی اس لیے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔

اور جن دنوں وہ اتر کے استخوانوں سے فارغ ہوئی۔ انہی دنوں علی مراد بی اے کر کے لوٹا تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ ماما، مامی کسی عزیز کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ علی مراد کو دیکھ کر وہ بس لمحہ بھر کو ہنسی تھی پھر اعتماد سے چلتے ہوئے اندر جانے لگی تو وہ کہنے لگا۔

”تم ابھی تک یہیں ہو؟“

”کیا مطلب؟“ وہ پلٹ کر پوچھنے لگی۔ ”پھر مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟“

”اپنے گھر۔“

”اپنے گھر۔“ وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ”میرا اپنا ذاتی گھر تو کوئی نہیں ہے۔ وہ میرے

مال باپ کا گھر ہے اور یہ ماما، مامی کا۔“

”میرا مطلب تمہارے مال باپ کے گھر سے ہی تھا۔“

”وہاں بھی چلی جاتی ہوں۔ یہاں بھی رہ لیتی ہوں۔ کوئی خاص فرق نہیں ہے دونوں

گھروں میں۔“

”تمہارا یہاں رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ تم انتظار کر رہی تھیں کہ میں بڑا ہو کر

تمہارے پاس آؤں گا۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھا کر سیدھا کھڑا ہوا تو وہ ایک نظر اس کے

اونچے سر پر پڑا ل کر ہلکے سے کندھا جھٹک کر بولی۔

”میں علی مراد! مجھے کبھی بھی تمہارا انتظار نہیں رہا۔“

”اچھا!“ اس کے انداز میں بے یقینی تھی اور ہلکا سا تسخر بھی جسے وہ فوراً محسوس کر گئی۔

بے گار اور نہ زینب شاہ کو پھوپھی مراد اں بنے دے گا۔

کافی دیر بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ جب سے آیا ہے۔ تنہا تھا ہے۔ اماں، ابا کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ پتا نہیں کہاں تھے۔ وہ اٹھ کر یونہی ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر اس کے کمرے کے سامنے رک کر پہلے کچھ سوچا پھر دروازے پر دستک دے کر بولا۔

”سنو..... کیا میں اندر آ جاؤں؟“

”آ جاؤ۔“ اس کی آواز سن کر وہ اندر داخل ہوا اور بیڈ سے قدرے فاصلے پر رکھے ہوئے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اماں، ابا نظر نہیں آرہے، کہاں گئے ہیں؟“

”وہ چاچا بشیر کی طرف گئے ہیں۔“

”خیریت؟“

”ان کا چھوٹا پوتا کچھ بیمار ہے۔ اسے دیکھنے گئے ہیں۔“

”کیا ہوا ہے اُسے؟“

کہیں بات ختم نہ ہو جائے۔ خاموشی نہ چھا جائے۔ اس لیے اس نے قصداً بات جاری رکھی۔

”مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں ہے۔ کافی دنوں سے اس کی بیماری کا سن رہی ہوں اور میرا خیال ہے بہتر علاج نہ ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔“ وہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ ”چاچا بشیر کو چاہیے، اُسے شہر لے جائیں۔ جب سے پیدا ہوا ہے، مستقل اُسے کوئی نہ کوئی بیماری لگی ہی رہتی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے ہوں کہہ کر پہلے اس کی پشت پر لٹکتے کینڈر کو دیکھا پھر اسے دیکھنے لگا۔ وہ سوئی دھاگے سے کوئی کپڑا سینے میں مصروف تھی۔

”تمہاری اماں اور بابا سائیں ٹھیک ہیں؟“ خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو وہ بول

پڑا۔

”ہاں، سب ٹھیک ہیں۔“ اس نے دھاگے کو دانتوں مدد سے توڑا پھر کپڑا الپیٹ کر

ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

”تم چائے پیو گے یا۔“

جیسی کہنے لگی۔

”کسی خوش فہمی میں مت رہنا علی مراد! تمہارے اور میرے بیچ عمروں کی خلیج ہمیشہ حائل رہے گی۔ تم کبھی بھی مجھ سے بڑے نہیں ہو سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اندر چلی گئی اور وہ حیران حیران سا کتنی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

”یہ تم ہو زینب شاہ!“ وہ طویل سانس لے کر وہیں کھاٹ پر مگر کرنے کے انداز میں بیٹھا تو اس تبدیلی کو بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود بھی خاصا بدل گیا تھا۔ شہری ماحول اور تعلیم نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا اور اس کا لہجہ بھی پہلے والا نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی وہ شروع سے کچھ مختلف مزاج کا تھا جب ہی تو زیادہ عرصہ گاؤں میں رہا نہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو پھر اپنی محنت اور جدوجہد سے معاشرے میں ایک مقام بنائے۔

ابھی اس نے بی اے کیا تھا اور اس کا ارادہ ماسٹر کے بعد ڈاکٹر بننے کا بھی تھا۔ اور اس کے لیے اس کی خواہش تھی کہ وہ کہیں باہر جائے۔ بہر حال اس نے اپنی آئندہ زندگی کا جو پلان بنایا تھا۔ اس میں زینب شاہ کا کہیں گزر نہیں تھا۔ اول تو وہ اس سے نکاح کرنے کے حق میں ہی نہیں تھا لیکن کم عمری کے باعث اپنی بات منوانہیں سکا تھا۔ پھر اس تمام عرصے میں اس نے زیادہ تو نہیں لیکن جب بھی اس کے بارے میں سوچا، یہی فیصلہ کیا کہ وہ اس بندھن کو توڑ دے گا۔ کیونکہ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ زینب پر بھی ظلم ہوا ہے۔ اُسے اب بھی یاد تھی۔ وہ نو عمری لڑکی جو اکثر چولہے میں سے راکھ کریدتے ہوئے اپنی انگلی جلا بیٹھتی تھی۔ اُس وقت وہ بہت سادہ اور محسوس ہونے کے ساتھ اندر سے کچھ ڈری ہوئی سی بھی لگتی تھی۔ جبکہ ابھی وہ بہت پر اعتماد نظر آتی تھی۔ اسے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ کم از کم وہ پھوپھی مراد اں کی طرح اپنی زندگی تباہ نہیں کرے گی۔

پھوپھی مراد اں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ان کی شادی ایک نو سالہ لڑکے سے ہوئی تھی۔ پھر جوان ہو کر اس لڑکے نے دوسری شادی کر لی لیکن پھوپھی مراد اں کو بھی نہیں چھوڑا اور المیہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ کوئی واسطہ کوئی تعلق بھی نہیں رکھا۔ وہ بے چاری ساری عمر سوکن کے بچوں کی نوکرائی بنی رہیں۔ اُسے اپنی پھوپھی پر بے حد ترس آیا کرتا تھا۔ اور جب کم و بیش ویسے ہی حالات اس کی زندگی میں آئے تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نہ تو خود پھوپھی کی طرح

ہوئے بولا۔

”وقتاً فوقتاً خطوں میں اپنے بارے میں لکھتا تو رہا ہوں۔“

”ہاں!“ وہ سر ہلا کر بولی۔ اور اب غالباً تم بی اے کا امتحان دے کر آئے ہو۔“

”ہاں۔“

”آگے کیا ارادہ ہے؟“

”ماسٹر کروں گا پھر ڈاکٹریٹ۔“

”کس سبکیٹ میں؟“ وہ پھر چونک کر دیکھنے لگا۔ یقیناً اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس منہج

پر بھی گفتگو کر سکتی ہے۔ کچھ دیر تک اسی طرح بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

”تم اس عرصے میں کیا کرتی رہی ہو؟“

”میں نے انٹر کیا ہے اور اب بی اے کی تیاری کر رہی ہوں۔“

”واقعی!“ وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن تم نے کبھی

خط میں ذکر نہیں کیا۔“

”میں نے تمہیں کبھی اپنی طرف سے خط نہیں لکھا۔ جو کچھ مامی لکھواتی تھیں، میں لکھ

دیتی تھی۔“ اُس نے پتا نہیں کیا جتایا اور خالی کپ اٹھا کر چلی گئیں۔

”کمال ہے۔“ وہ جب کچھ قیاس نہیں کر سکا تو کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا پھر باہر کی

طرف جاتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

”سنو۔ میں ذرا یاروں دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔“

اس نے بہت خاموشی سے اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا پھر رات کے کھانے کی تیاری

میں لگ گئی۔ بظاہر مصروف لیکن ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ یہ تو نہیں تھا کہ اس تمام عرصے وہ اپنے

آپ سے غافل رہی تھی بار بار اُس نے سوچا تھا اور علی مراد کی طرح اس نے بھی اپنی آئندہ

زندگی کے لیے باقاعدہ پلان بنایا تھا کہ وہ کم از کم گریجویشن کر کے سب سے پہلے اپنے

بیروں پر کھڑی ہوگی اس کے بعد اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے والدین کے اس

فیصلے کو سراسر غلط قرار دیتے ہوئے علی مراد سے علیحدگی اختیار کرے گی۔ اس کا دل کسی طرح

بھی اس کے ساتھ پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ اگر آج اس سے قدم میں اونچا ہو کر آیا تھا تو اس کا یہ

مطلب کہ درمیانی سات سالوں کا فاصلہ بھی مٹا آیا ہے۔ یہ فاصلہ تو کبھی مٹ ہی نہیں سکتا

”جھٹکنس گاڈ!“ اس نے طویل سانس لیا۔ ”تمہیں خیال تو آیا۔“

”مجھے بہت دیر سے خیال تھا لیکن میں ضروری کام کر رہی تھی۔“ پھر اٹھتے ہوئے

بولی۔ ”ابھی سیکینز کو کسی شادی میں یہی کپڑے پہن کر جانا ہے۔ تھوڑی سلائی باقی تھی، دبی

مکمل کر رہی تھی۔“

”تم اس کا کام کیوں کرتی ہو؟“

”تو کیا ہوا۔ بے چاری کا چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ ہر حال تم ہٹاؤ صرف چائے۔“

”چائے بھی پیوں گا لیکن اگر پہلے کچھ کھانے کو مل جائے تو۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ کمرے سے نکلے تو وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلا آیا لیکن پھر

وہیں برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دوپہر کا رکھا ہوا کھانا گرم کر کے لے آئی۔

تخت پر اس کے سامنے دسترخوان بچھا کر کھانا رکھا اور پلٹنے لگی تو وہ پوچھنے لگا۔

”اماں کب تک آئیں گی؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ انہوں نے واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ ہو سکتا ہے

ابھی آجائیں یا پھر رات کو۔“ پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر چائے بنانے کی

غرض سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

وہ خود بھی شام میں چائے ضرور پیتی تھی۔ اس لیے دو کپ بنا لیے۔ پھر جھانک کر

دیکھا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ تب وہ چائے لے کر آگئی۔

”تمہیں میری وجہ سے خاصی تکلیف ہوئی۔“ وہ مرداب بولا۔

”نہیں۔ اس وقت میں ویسے بھی چائے بنا تی ہی ہوں۔“ اس نے عام سے لہجے میں

کہہ کر دونوں کپ وہیں رکھے پھر پہلے کھانے کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ کر آئی

اس کے بعد اپنا کپ اٹھا کر تخت کے دوسرے سرے پر بیٹھی تو کہنے لگی۔

”اب سناؤ۔ شہر میں کیا کرتے رہے ہو۔“

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے لہجے اور انداز میں واضح طور پر بڑا پن محسوس ہو رہا

تھا۔ جیسے وہ باز پرس کر رہی ہو اور اگر جو گزرے ماہ و سال کے بارے میں بتائے ہوئے اس

نے اپنی کسی غلطی کا ذکر کیا تو وہ ڈانٹنے لگے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں اس کا

کان مروڑ کر ڈانٹتی تھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے کان کی طرف چلا گیا اور نظریں چراتے

تھا۔ اب وہ پچیس سال کی عمر میں کافی میچور ہو گئی تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں اٹھارہ سال کا نوجوان اپنے آپ کو لاکھ میچور پوز کرے اس کی ذہنی سطح تک نہیں پہنچی سکتا تھا۔ بہر حال وہ اس کی اچانک آمد سے قدرے پریشان ضرور ہو گئی تھی۔ اور اب سوچ رہی تھی کہ کسی بھی بہانے اماں کے گھر چلی جائے گی اور جب تک علی مراد یہاں ہے وہیں رہے گی۔ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ سیکینہ آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر ہاتھوں میں پکڑا چادلوں کا تسلا رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں نے تمہارا سوٹ تیار کر دیا ہے۔ بیٹھو لے کر آتی ہوں۔“ وہ اندر جانے لگی تو سیکینہ راستہ روک کر پوچھنے لگی۔

”سنا ہے علی مراد آیا ہے؟“

”ہاں!“ اس نے بے حد سرسری انداز میں ہاں کیا۔

”کہاں ہے؟“ سیکینہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اپنے یاروں دوستوں سے ملنے گیا ہے۔“

”تجھ سے مل لیا؟“ وہ سیکینہ کی شرارت سمجھ کر انجان بن گئی اور اس کے قریب سے نکل کر اندر آگئی تو سیکینہ پیچھے چلی آئی۔

”کیا کیا باتیں ہوئیں علی مراد سے؟“

”تو نہیں سمجھے گی۔“ وہ اس کا سوٹ اٹھا کر اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔

”ارے واہ! میں کیوں نہیں سمجھوں گی۔ سچ بتا۔“

”سچ بتاؤں۔“ وہ ہنسی۔ اسی وقت باہر ماما می کی آوازیں سن کر اس نے دل ہی

دل میں شکر کیا اور سیکینہ کو تقریباً کھینچتے ہوئے باہر لے آئی تو اس سے پہلے ہی سیکینہ کہنے لگی۔

”چاچی! تیرا بیٹا علی مراد آیا ہے۔“

”کہاں ہے؟“ ماما، ماما کی خوشی سے بھرپور آواز کے ساتھ میں بے قرار

نظریں ادھر ادھر بھٹکتے لگیں۔

”ابھی باہر نکلا ہے۔“

”جامراد کے ابا! جلدی سے اسے بلا لا۔“ ماما نے کہا تو ماما اسی وقت باہر نکل گئے۔

اس نے کھڑے کھڑے چاچا بشیر کے پوتے کی خیریت پوچھی پھر سیکینہ کے جانے کے بعد

دوبارہ کچن میں آگئی۔

علی مراد، ماما کے ساتھ آگیا۔ پھر ظاہر ہے چھ سال بعد آیا تھا۔ رات دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران اس نے کھانا پکایا پھر سب کے سامنے دسترخوان پر سجایا لیکن خود ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی۔ اس کے بعد کچن کے آخری سب کام نمٹا کر اپنے کمرے میں آئی۔ اس وقت تک وہ اپنے اماں، ابا کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے حسب معمول اور حسب عادت بیڈ پر بیٹھتے ہی ایک کتاب اٹھالی لیکن پھر بہت جلد اکتا کر واپس رکھی اور سونے کے لیے لیٹی تو برآمدے میں سے علی مراد کی آواز آئی۔ وہ غالباً جلالت میں چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”میں جا رہا ہوں اماں! دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔“ پھر اس کی آواز دور سے آئی۔

”دروازہ بند کر لیں۔ ہو سکتا ہے۔ میں صبح آؤں۔“

اس نے طویل سانس لے کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ہلکے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا پھر جب غور کیا تو بیرونی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ پہلے سوچا۔ ماما کو اٹھا دے لیکن پھر خود ہی دروازے کے پاس آ کر پوچھنے لگی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں علی مراد!“ اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ شاید دروازے کے سہارے کھڑا تھا جس کے کھلنے سے اس کا توازن بگڑ گیا۔ چند قدم لڑکھڑایا تو اس نے تمام لیا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“ وہ بمشکل اس کے وجود کو سہارا دے کر تشویش سے پوچھنے لگی۔ اور جب وہ بولا تو جہاں زبان لڑکھڑائی وہاں سانسوں کے ساتھ ناگواری مہک سیدی اس کے نتھنوں میں جا گھسی۔

”علی مراد!“ اُس نے بے حد ناگواری سے اُسے دیکھا۔ اُس کی سرخ آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ دل چاہا زوردار دھکا دے کر اسے دور گرا دے کہ پل میں اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے لیکن وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔ بڑی مشکل سے اسے کمرے تک

لائی۔ بیڈ پر لٹا یا تب سرزنش کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

”کس قدر بے ہودہ حرکت کی ہے تم نے۔ اگر ماما، مامی کو پتا چل جائے تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ آخر گئے کیوں تھے آوارہ لڑکوں کے پاس؟“

ساتھ ساتھ اس کے جوتے بھی اتار رہی تھی پھر موزے اتارے۔ اس کے بعد چادر اوڑھا رہی تھی کہ اس نے اس کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

”زینو! تم میری ہوں ناں زینو!“ وہ یقیناً ہوش میں نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی اور پھر اپنی کوشش میں ناکام ہو کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کسے آواز دے۔ کسے پکارے اور کوئی ابھی گیا تو کیا کہے گی کہ علی مراد بہر حال اس کا شوہر تھا۔ کلائی تھاے یا اس سے آگے کی بات کرے۔ کون روک سکتا تھا اُسے۔

☆☆☆

صبح کے اجالے میں دونوں کے رنگ مختلف تھے۔ وہ بے حد غصے میں تھی لیکن اظہار کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور براہ راست اس سے بات کرنا تو دور کی بات اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ جبکہ وہ پہلے نادم پھر وہی بگڑا ہوا بچہ جو اپنی مرضی کے خلاف بات ہو جانے پر چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیتا ہے۔ وہ کمرے میں بیٹھی اس کی آوازیں سنتی رہی۔ وقفے وقفے سے کسی نہ کسی بہانے چلا رہا تھا۔ دوپہر میں اسے کھانا پسند نہیں آیا تو سب کچھ الٹ کر رکھ دیا۔ اور شام میں مامی سے کسی بات پر تکرار کرتے کرتے یوں اکھڑا کہ اسی وقت اپنا سامان باندھ لیا۔

”میں جا رہا ہوں اور اب دوبارہ کبھی اس گھر میں نہیں آؤں گا۔“

”کیا کہہ رہا ہے علی مراد! میں نے ایسی کیا بات کی ہے جو تو اتنا غصہ کر رہا ہے۔“ مامی ایک دم دھیمی پڑ گئیں۔

”بس اماں! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“

”پر کیوں؟“

”مجھے نہیں پتا۔“

”دیکھ علی مراد! ایسی باتیں نہ کر۔“ مامی نے اسے کھینچ کر اپنے پاس بیٹھا لیا پھر ڈلار سے کہنے لگیں۔

”اتنے سالوں کے بعد ابھی کل ہی تو آیا ہے اور ابھی جاننے کی بات کر رہا ہے۔ میں نے تو ابھی دل بھر کر دیکھا بھی نہیں؟“

”مجھے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہ جو گھر میں ایک چھوکی لاڈالی ہے آپ لوگوں نے۔ صبح شام اسے دیکھا کریں۔“

”کون؟ زنب۔“ مامی اچنبھے سے ہو گئیں۔

”ہاں وہی۔“

”تو ایسے کیوں بول رہا ہے۔ وہ تیری بیوی ہے۔“

”بیوی!“ وہ عجیب سے انداز میں ہنسا پھر اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر ایک طرح سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

”علی مراد! ہوش کر، اپنے ابا کو تو آنے دے۔“ مامی اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”ابا سے میں راستے میں مل لوں گا۔“

”پر تو اتنی جلدی کیوں جا رہا ہے۔ کچھ پتا تو چلے؟“ مامی اس کے پیچھے پیچھے چلتی آئیں لیکن وہ پتا نہیں کیا سوچ چکا تھا کہ اُن کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ جب مامی بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئیں۔

”زنب! تجھے کچھ پتا ہے۔ وہ کیوں چلا گیا ہے؟“

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا پھر کچھ سوچ کر بولی۔

”رات تو اچھا بھلا تھا۔ صبح پتا نہیں کس بات پر موڈ بگڑ گیا۔“

”عجیب چھوڑا ہے۔ اتنے سالوں بعد آیا تھا۔“ اماں تاسف بھرے لہجے میں پتا نہیں کیا کچھ کہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئیں تو اس نے عجیب سے احساس میں گھر کر پیشانی گھنٹوں پر ٹکالی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ جو شعور و آگہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے یہ سوچتی تھی کہ وقت آنے پر اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرے گی تو اب اسے لگتا،

بہہ نکلے۔ اس جیسے کچے مرد سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ سارا الزام اس کے سر رکھ کر خود صاف بچ نکلا تھا لیکن جس بے دردی سے اس کے پندار کو ٹھیس پہنچائی تھی، اس سے وہ مہینوں نہیں سنبھل سکی۔ ایک طرح سے خود اپنی نظروں سے گر گئی تھی۔

ادھر ماما، ماما۔ ادھر اماں اور بابا سائیں اس کی گرتی ہوئی صحت سے کافی پریشان تھے۔ اپنے طور پر ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے۔ لیکن جب وہ خود ہی اپنے آپ سے غافل تھی تو نہ کوئی دوا اثر کرتی نہ خوراک۔ اسی حالت میں اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اور اسے دیکھ کر لمحہ بھر کو اسے یوں لگا۔۔۔ جیسے اس کی ساری سوچیں منجمد ہو گئی ہوں۔ سارے آدرش سمار۔ اور پیروں میں ایسی بیڑیاں جنہیں وہ کبھی نہ توڑ سکے گی۔

”لیکن نہیں۔“ اس نے عزم سے سوچا۔ ”میں یہ ساری بیڑیاں خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دوں گی اور بتا دوں گی علی مراد کو کہ عورت کبھی کبھی ہی مجبور اور بے بس ہوتی ہے، ہمیشہ نہیں۔“

پھر جب وہ خود غفلت سے نکل آئی تو دونوں میں اچھی بھی ہو گئی۔ بچی کو بھی بھرپور توجہ دینے لگی۔ ساتھ ساتھ کتابوں سے بھی دوبارہ ناتا جوڑ لیا تھا اور جب وہ مکن ہو رہی تھی تب پھر علی مراد کا خط آ گیا اُسی کے نام۔

”بیٹی مبارک ہو زینب شاہ! لیکن یہ مت سمجھنا کہ اس کے توسط سے تم میرے دل میں کوئی مقام حاصل کر سکو گی۔ ہرگز نہیں مجھے تم سے اور تمہاری بیٹی سے کوئی لگاؤ نہیں اور جب یہ طے ہے کہ مجھے تمہارا ساتھ کسی صورت منظور نہیں تو میں تمہیں پابند نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں۔“

”اگر میں چاہوں.....“ اس کے اندر ڈھیر ساری تلخی بھر گئی۔ ”یہاں بھی اپنا دامن بچا لینا چاہتے ہو علی مراد۔“

اور اب کی بار وہ خاموش نہیں بیٹھی بلکہ اس وقت کا غد قلم اٹھا کر اسے جواب لکھ ڈالا۔

علی مراد! تم یقیناً میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو۔ پہلے میں تمہاری غلط فہمی دور کر دوں تو سنو۔ مجھے یا میری بیٹی کو تمہارے دل میں مقام بنانے کی نہ ضرورت ہے نہ خواہش۔ اور میں نے اب نہیں بلکہ بہت پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ تم بھلا مجھے دے ہی کیا سکتے ہو۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہو

جیسے اس سے یہ اختیار چھین لیا گیا ہو اور سب سے بڑا غاصب اسے علی مراد ہی لگتا۔ وہ جب اس کے بارے میں سوچتی، اس کے اندر جوار بھانا اٹھنے لگتا۔ جب علی مراد کو واپس جانا ہی تھا تو اس کی نسوانیت کا دامن تار تار کیوں کیا۔ وہ جتنا سوچتی، ابھی چلی جاتی۔

☆☆☆

انہی دنوں اُسے اپنے اندر نئی تبدیلی کا احساس ہوا تو جیسے ہر شے سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ یہ سب کچھ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ علی مراد کے بچے کی ماں بنے گی۔ وہ علی مراد جس کا اس کے خواب و خیال میں کہیں گزر نہیں تھا لیکن وہی بات کہ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ وہ بھی تقدیر کے اس مذاق پر حیران ضرور تھی لیکن کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ شروع شروع میں اس نے ماما سے چھپائے رکھا لیکن یہ چھپنے والی بات نہیں تھی۔ خود ہی ظاہر ہو گئی۔ اس سستی، ہر بات سے بیزاری اور دقت بے دقت سونا۔ ماما کو پہلے تشویش ہوئی پھر جب سمجھ میں آیا تو پھولے نہ سائیں۔

”اب دیکھتی ہوں۔ علی مراد کیسے شہر میں ٹکنا ہے۔ بچے کا سنتے ہی بھاگا آئے گا۔“

ماما اٹھتے بیٹھتے اسی قسم کی باتیں کیا کرتیں اور وہ بس خاموش رہتی۔ اسے دیے بھی ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

علی مراد کو گئے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ اور اس روز اس کا خط آیا۔ وہ بھی اس کے نام۔

زینب شاہ! مجھے تمہارے قول و فعل کے تضاد نے بہت دکھ دیا ہے۔ تم ہی نے کہا تھا ناں کہ تمہیں کبھی میرا انتظار نہیں رہا اور میں تمہاری اس بات سے مطمئن ہو گیا تھا کہ چلو تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے مجھے کسی ملال یا پشیمانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو لیکن تم اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکیں۔ مجھے کہنے دو زینب شاہ! کہ اس رات میں تو نئے میں تھا لیکن تم تو ہوش میں تھیں۔ مجھے روک سکتی تھی پھر تم نے مجھے کیوں نہیں روکا؟ کیا تمہارا ہتھیار ڈال دینا، اس بات کا غماز نہیں ہے کہ تم.....

”علی مراد!“ اس نے بڑی وقوتوں سے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹا تو آنسو ایک تو اتر سے

کہ زمین پر جھوٹا میرا آنچل تمام لو لیکن اس آنچل سے میرے سر پر سائبان تانا تمہارے بس سے باہر ہے اس کے لیے تمہیں درمیانی سات سالوں کا فرق مٹانا ہو گا جو کہ تم ہرگز ہرگز نہیں مٹا سکتے۔ اور گو کہ میں نے ابھی اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں نہیں سوچا پھر بھی تم اگر چاہو تو مجھے طلاق دے سکتے ہو۔“

وہ بڑی خوبصورتی سے اس کی بات لوتا کر اطمینان سے ہو گئی۔ پھر اگلے کئی دن تک اس کی طرف سے جواب کا انتظار بھی کرتی رہی لیکن وہ شاید آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر خاموشی اختیار کر گیا تھا۔

☆☆☆

اُس نے بی اے کر لیا تو وہیں ایک مقام اسکول میں اسے جاب مل گئی۔ اس وقت اس کی بیٹی تین دو سال کی ہو چکی تھی۔ اور وہ محض اپنی بیٹی کی وجہ سے ابھی اس چھوٹے سے شہر یا گاؤں میں رکی ہوئی تھی۔ اور اس نے سوچ لیا تھا جیسے ہی ثانیہ اسکول جانے کے قابل ہوگی وہ اسے لے کر کسی بڑے شہر کا رخ کرے گی جہاں اس کی بیٹی بھی اچھی تعلیم حاصل کر سکے اور وہ خود بھی زندگی کے کسی شعبے میں کوئی مقام بنانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ انہی دنوں علی مراد کا خط ملاں کے نام آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر بٹ کے لیے باہر جا رہا ہے۔ اسے اس خبر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جبکہ ملاں اچانک اس سے متفرق ہو گئیں۔ بالکل روایتی ساس بن کر سارا الزام اس کے سر رکھ دیا۔

”میرا بیٹا ایسا نہیں تھا۔ جب سے تو اسے گھر میں آئی ہے۔ اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا کر دیا ہے تو نے کہ وہ گھر سے دور ہی دور ہوتا جا رہا ہے۔“

پھر ان کی عادت ہو گئی۔ ہر وقت طعنے، کوسنے۔ غرضی ثانیہ کو بھی بات بے بات جھڑکنے لگی تھی اور اپنی حد تک تو اس نے سب برداشت کیا لیکن جب بیٹی کی بات آئی تو وہ خاموش نہیں رہ سکی۔ برابر سے جواب دینے لگی۔ یوں ایک دن جھگڑا اتنا بڑھا کہ وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ ملاں اور بابا سائیں کے پاس آئی تو پہلے تو کچھ دن انہوں نے اس کی دلجوئی کی پھر اُن اُسے سمجھانے میں لگ گئے۔

”کس لیے میں وہاں جاؤں؟ اور کس کے لیے؟ ایک دن وہ پھٹ پڑی۔“ کیا میری

شادی ماما، ماما کی ساتھ ہوئی تھی۔ جو میں ساری زندگی ان کی نوکری کرتی رہوں۔“

”نوکری کیوں، وہ تیرے ساس سر ہیں۔ ان کی خدمت کرے گی تو علی مراد بھی تجھ سے خوش ہوگا۔“

”کیا؟“ وہ چیخ پڑی۔ ”مت نام لیا کریں میرے سامنے علی مراد کا۔ میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں اور مجھے کوئی ضرورت نہیں اُسے خوش کرنے کی۔“ قدرے توقف کے بعد بولی۔

”اب میں سمجھی، دو سالوں گھر سے غافل اتنے اطمینان سے کیسے رہتا ہے۔ اسے پتا ہے ناں کہ اس کے ماں باپ کی دیکھ بھال اور خدمت کو میں جو موجود ہوں۔“

پھر اپنے آپ پر حیرت کرنے لگی۔ ”کمال ہے، میں اب تک سمجھ ہی نہیں سکی۔ مجھے تو بہت پہلے وہ گھر چھوڑ دینا چاہیے تھے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہے۔ پتا بھی ہے، برادری والے کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”برادری والوں کو اور کام ہی کیا ہے۔ میں یہاں آئی ہوں تو باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے کیوں خاموش تھے؟ علی مراد پر انگلیاں کیوں نہیں اٹھائیں۔ اس لیے کہ وہ مرد ہے اور مردوں کی ہر بات جائز سمجھ لی جاتی ہے۔ بس کریں اماں اگر سب یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی پھوپھی مراد اداں کی طرح پہلے اس کے انتظار میں یہ عمر گوا دوں، اس کے بعد سو کن کے بچوں کی آیا گیری پر..... ہو جاؤں تو یہ ناممکن ہے۔“ وہ حتی انداز میں بولی۔

”چار جماعتیں پڑھ کر تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دماغ خراب نہیں ہوا۔ سمجھ آئی ہے مجھے۔“

”یہی سمجھ آئی ہے کہ خاوند کا گھر چھوڑ کر۔“

”وہ خاوند نہیں لیرا ہے۔“ وہ فوراً ٹوک گئی۔

”اے چھوری! بس کر، برادری میں کسی اور نے تیری باتیں سن لیں تو تیرے ساتھ ساتھ ہمارا بھی جینا مشکل کر دیں گے۔“

اماں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر ان کے پاس بیٹھی پھر ان کے ہاتھ تمام کر کہنے لگی۔

”اماں! آپ لوگوں کی باتوں کی پروا مت کریں۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے بھی میں بہت جلد کراچی جا رہی ہوں۔“

”علی مراد کے پاس؟“

”نہیں۔“ اماں کے بے تابئی سے پوچھنے پر اسے نے پھکی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا پھر کہنے لگی۔

”علی مراد کراچی میں نہیں امریکہ میں ہے۔“

”پھر تو کس کے پاس جا رہی ہے؟“

”کسی کے پاس نہیں۔ یہاں اسکول میں ایک استانی کراچی سے آئی ہوئی تھی۔ پچھلے مہینے اس نے اپنا تبادلہ دوبارہ کراچی کرا لیا تھا۔ اور میں نے اس سے کہا تھا وہ وہاں میرے لیے رہائش اور نوکری کا انتظام کرے پھر میں بھی وہیں آ جاؤں گی۔“ اس نے بتایا تو اماں کتنی دیر تک ٹھوڑی پرانگی لٹکائے اسے یوں دیکھے گئیں جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”مجھے یہاں نہیں رہنا اماں!“ وہ رसान سے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”اور یہ فیصلہ میں نے صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بیٹی کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ میں اسے دوسری نینب نہیں بننے دینا چاہتی۔ میرا کیا ہے۔ جتنی زندگی گزر گئی۔ اتنی اور بھی گزر جاتی پھر بھی مجھے پھوپھی مراد اں کسی صورت نہیں بڑھاتا تھا۔ بہر حال ثانیہ کو میں برادری کے رواجوں کی سمیٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔ اس لیے میں اسے یہاں سے لے کر جا رہی ہوں۔“

”پر چھوڑی!“ اماں نے کچھ کہنا چاہا کہ اُس نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”مجھے مت روکیں بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ آپ اور بابا سائیں بھی میرے ساتھ چلیں۔“

”کہاں چلیں؟“ بابا سائیں نے آتے ہی اس کی آخری بات سنی تھی۔ اس نے ایسی نظروں سے اماں کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ اب بابا سائیں کو سمجھانا آپ کا کام ہے پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

یونہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کے ارادوں کی رفتہ رفتہ سب کو خبر ہو گئی اور بظاہر سب ہی نے اعتراض کیا لیکن اُسے اب کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس انتظار میں تھی کہ کب ذکیہ اس کے لیے رہائش اور جاب کا انتظام کر کے اسے بلاتی ہے۔ اس کے ایک دو

خطر آچکے تھے۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اس کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ بہر حال وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی کیونکہ یہاں اب سب اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرنے لگے تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی آ جاتا۔ پہلے سنی سنائی باتوں کی اماں سے تصدیق کی جاتی، خاص طور پر اس کے جانے کی۔ اس کے بعد اس کے منہ پر تو اس کے سب سے بڑے ہمدرد بن کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن اس گھر سے نکلتے ہی طرح طرح کی باتیں شروع ہو جاتیں ان سب میں ایک پھوپھی مراد اں ہی تھیں جنہوں نے آ کر اس سے کہا تھا۔

”تو بہت اچھا کر رہی ہے نینب! جو یہاں سے جا رہی ہے۔ ورنہ تیرا حال بھی میرے جیسا ہوتا۔“ اور وہ ان کے ہاتھ تھام کر محبت سے بولی۔

”پھوپھی! آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ یقین کریں۔ میں آپ کو بہت آرام سے رکھوں گی۔“

”میں جانتی ہوں۔ پر دھیے! اب تو زندگی گزر گئی۔ اُن کے لہجے میں حسرت تھی، دکھ تھا۔ جس سے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

اُس کی زندگی کا نیا باب شروع ہو گیا۔ جس میں فوری طور اسے کسی پریشانی یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ ذکیہ نے جاب اور رہائش دونوں کا انتظام کر کے اسے بلایا تھا۔ شہر کے ایک متوسط علاقے میں ایک کمرے کا پورشن اس کے اور ثانیہ کے لیے کافی تھا۔ کمرہ کافی کشادہ تھا۔ پھر چھوٹا سا کچن اور باتھ روم وغیرہ اس کے علاوہ پوری کھلی چھت۔ نچلے حصے میں مکان مالک خود رہتے تھے۔ جن کی ایک بیٹی اسی اسکول میں پڑھاتی تھی جہاں اسے جوائن کرنا تھا۔ پھر سب سے بڑی سہولت یہ کہ اسکول گھر سے قریب ہی تھا۔ وہ پیدل آ جاسکتی تھی۔

اُس کے پاس اپنی جمع پونجی بہت زیادہ نہیں تھی پھر اسے یہ خیال بھی تھا کہ پتا نہیں یہاں کس قسم کے حالات سے گزرنا پڑے اس لیے کافی سوچ سمجھ کر اس نے خرچ لیا۔ بس ایک بیڈ اور دو کرسیاں کمرے کے لیے اور مہینے بھر کا راشن لے کر باقی پیسے سنبھال

رکھے۔ فی الحال اس سے زیادہ اے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

پھر پہلی تاریخ سے اُس نے اسکول جوائن کیا تو ساتھ ہی ثانیہ کو بھی مونیسٹری میں داخل کر دیا۔ یوں کچھ دنوں میں ہی وہ اپنی اس زندگی میں سیٹ ہو گئی۔ اگر دیکھا جاتا تو اس کی یہ زندگی پہلے کے مقابلے میں بہت سہل تھی۔ کیونکہ سارا دن گھر کے بکھیروں میں نہیں الجھنا پڑتا تھا۔

صبح نماز کے بعد ہی وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دوپہر کے لیے کھانا پکا کر رکھ دیتی تھی۔ پھر خود تیار ہو کر ثانیہ کو تیار کرتی۔ اس کے بعد دونوں ناشتا کر کے اسکول چلی جاتیں۔ جہاں سے واپسی پر کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا۔ بس کھانا گرم کرنا اور کھانا اور اس کے بعد وہ ثانیہ کو سلاتے سلاتے اکثر خود بھی خود سو جاتی تھی۔ شام میں تھوڑی دیر چہل پہل ہو جاتی کیونکہ اس کے پاس کھلی چھت تھی اس لیے عابدہ اور مریم کھلی فضا کی خاطر اس کے پاس آ جاتیں۔ عابدہ اسی کے ساتھ اسکول میں پڑھاتی تھی جبکہ مریم ابھی بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ دونوں کافی ملنسار لڑکیاں تھیں، جلد گھل مل جانے والی۔ جیسی چند دنوں میں ہی اس کی ان سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اور اس نے اپنے بارے میں کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

ایک دن جب عابدہ نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے پوری سچائی سے اپنے تمام حالات کہہ سناتے تھے۔ اس وقت تو انہیں اس کے حالات پر حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا تھا کہ کس طرح ایک نو عمر لڑکے کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن اب اکثر دونوں اس کے ساتھ مذاق کر جاتی تھیں۔

”سنو، علی مراد کے لیے پہل ضرور لیتی آتا۔“ جب بھی وہ ڈبل روٹی وغیرہ لینے کے لیے بیکری تک جانے لگتی دونوں اسے ضرور چھیڑتیں۔

”اب وہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔“

وہ اب ان باتوں کو انجوائے کرنے لگی تھی۔ اور دونوں جگہوں میں یہی واضح فرق تھا کہ وہاں وہ ان ساری باتوں پر کڑھتی رہتی تھی اور یہاں ساری باتیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہی تو ہے کہ اگر حالات کو اپنے اوپر طاری کر کے مسلسل روتے اور کڑھتے رہو تو زندگی انتہائی کٹھن اور دشوار لگتی ہے۔ اس کے برعکس حالات کو تابع کر لینے سے راہیں خود بخود آسان ہو جاتی ہیں اس نے بھی اپنی زندگی کے اس لیے پرکڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اس

کے سامنے ثانیہ تھی۔ اس پر بھرپور توجہ دینے کے بعد بھی اس کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ایم اے کی تیاری کرنے لگی۔

وقت کا یہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا اور نوب شاہ جو بہت حد تک مگن ہو گئی تھی اس روز پھر ڈسٹرب ہو گئی۔ جب ثانیہ نے اچانک اس سے سوال کر ڈالا۔

”میرے پایا کہاں ہیں؟“ وہ کتنی دیر تک بچی کو دیکھتی رہی کہ اسے یہ خیال کیونکر آیا۔ پھر خیال آیا، اسکول میں بچے اپنے پاپا کی باتیں کرتے ہوں گے۔ وہ سوچنے لگی، اسے کیا جواب دے کہ وہ مطمئن ہو جائے۔

”بتائیں ناں ماما۔“ ثانیہ اس کا کندھا ہلا کر اصرار سے پوچھنے لگی۔

”تمہارے پاپا باہر ہیں۔“ وہ پیشانی تک آئے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

”باہر کہاں؟“

”امریکہ۔۔۔۔۔ اور امریکہ بہت دور ہے۔“

”بہت دور۔ میں وہاں نہیں جاسکتی۔“ بچی مایوس نظر آنے لگی۔

”جاسکتی ہو لیکن ابھی۔ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تب۔“ اس نے بہلایا۔

”ریل گاڑی میں بیٹھ کر؟“

”نہیں، ہوائی جہاز میں۔“ وہ مسکرائی۔

”پاپا ابھی ہوائی جہاز میں گئے ہیں؟“

”ہاں اور اب تم سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے۔“ وہ اس کے موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے بولی پھر آہستہ آہستہ اسے تھکنے لگی۔

”ماما!۔“ وہ سوتے سوتے پھر بیدار ہو گئی جیسے اس کا ذہن ابھی تک انہی باتوں میں الجھا ہو۔ ”پاپا کیسے ہوتے ہیں؟“

”جب آئیں گے تو دیکھ لیتا۔“ وہ اکتا کر بولی۔

”کب آئیں گے؟“

”چنانچہ، چلو اب باتیں مت کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“

وہ زور زور سے اسے تھکنے لگی۔ کچھ دیر میں بچی سو گئی اور سونا تو وہ بھی چاہتی تھی لیکن بچی

”آج میں نے نہیں اٹھایا تو خود ہی سے بھی نہیں اٹھی۔“

”بھئی کس کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کی یا ثانیہ کی؟“ مریم آندھی طوفان کی طرح

نازل ہوئی۔ ”عابدہ اتنی غلت میں کچھ کہتے ہوئے گئی ہے کہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔“

”کچھ زیادہ نہیں ہے بس ذرا۔“

”ارے آپ کی تو آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے رات میں سوئیں، نہیں۔

کمال ہے۔ اسی وقت مجھے بلا لیتیں۔“ پھر اسے خاموشی سے دیکھتے پا کر بولی۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں؟“

”تم لوگ خواب خواہ پریشان ہو رہے ہو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ رات بالکل ٹھیک ٹھاک

تھی۔ بس ابھی ذرا طبیعت بوجھل لگ رہی ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ابھی ٹھیک

ہو جاؤں گی۔“

”ٹھیک تو آپ کو ابھی ہونا پڑے گا کیونکہ آپ اس طرح بیٹھی بالکل اچھی نہیں لگ

رہیں۔ خیر، پہلے میں آپ کے لیے چائے لے آؤں۔“ وہ کمرے سے نکل کر کچن میں چلی

گئی تو وہ دل ہی دل میں ان کے خلوص کی معترف ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔

”یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ اتنے اچھے لوگ ملے ہیں ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں

ہوتا۔“

”چائے لیجیے۔“ وہ اتنی جلدی چائے لے کر آگئی۔ گنگا اسے تھمایا پھر ثانیہ کو اٹھانے

لگی۔

”ثانی بیٹا! اٹھ جاؤ۔ اسکول کا وقت نکل چکا ہے آج چھٹی۔“

”اور تم نے کس خوشی میں چھٹی کی ہے؟“ وہ اس سے پوچھنے لگی۔

”عابدہ نے نہیں بتایا؟“

”نہیں۔“ وہ غلت میں تھی، کہہ رہی تھی تم سے پوچھوں۔

”اچھا!“ مریم خوشدلی سے ہنسی پھر کہنے لگی۔ ”اصل میں آج کچھ خاص مہمان آرہے

ہیں۔“

”خاص؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”عابدہ کے لیے۔“

کی باتوں میں ذہن یوں الجھا کہ نیند غائب ہو گئی۔ اب تک اس انچ پر تو اس سوچا ہی نہیں تھا

کہ بچی، باپ کی کمی محسوس کرے گی اور اس کے بارے میں سوالات کرنے لگے گی۔ اسے

علی مراد کا خیال آیا جس نے پہلے مرحلے پر ہی کہہ دیا تھا کہ اسے بچی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ

سوچنے لگی۔ جب میری بچی کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے باپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت

نہیں تو وہ کتنی رنجیدہ ہوگی۔ پھر اس بچ پر سوچتے سوچتے رات کے جانے کس پہر اس کی آنکھ

لگی۔ اور دیر سے سونے کا نتیجہ تھا کہ صبح معمول کے مطابق اٹھ نہیں سکی۔ روزانہ تو یہ ہوتا تھا

کہ وہ تیار ہو کر نیچے چلی جاتی تھی۔ پھر عابدہ کے ساتھ اسکول کے لیے نکلتی اور آج جب وہ

نہیں اُتری تو عابدہ اُسے بلانے آگئی۔ لیکن اُسے سوتے دیکھ کر عابدہ کو خاصی تشویش ہوئی

ہلکے سے اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

”زینو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں!“ اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور عابدہ کو دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ”اتنی

دیر ہو گئی۔“

”کیا آج اسکول نہیں جاؤ گی؟“

”نہیں، میری طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔ تم پلیز میڈم سے کہہ دینا۔“

”وہ تو میں کہہ دوں گی لیکن تمہیں ہوا کیا ہے؟“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر

رات سے طبیعت خراب تھی تو ہم میں سے کسی کو بلا لیا ہوتا۔“

”نہیں۔ رات تو میں ٹھیک تھی۔“

”اچا! اب تم آرام کرو۔ میں مریم کو بھیجتی ہوں۔ وہ تمہیں چائے وغیرہ بنا دے گی۔“

”ارے نہیں، اب ایسی بیمار بھی نہیں ہوں اور کیا مریم کا لُج نہیں جارہی؟“ وہ اٹھنے لگی

تو عابدہ نے روک دیا۔

”چہرے سے ہی بیمار لگ رہی ہو۔ آرام سے بیٹھی رہو۔“ پھر جاتے جاتے بولی۔

”مریم آج بتا نہیں کسی خوشی میں کالج نہیں جارہی۔ یہ تم اسی سے پوچھ لیتا۔“

اس نے ہلکے سے مسکرا کر سر ہلایا تھا پھر تکیہ اونچا کر کے بیک سے ٹیک لگا کر ثانیہ کو

دیکھنے لگی۔ وہ بے خبر سوئی کس قدر معصوم لگ رہی تھی، اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کے

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائی۔

”اچھا!“ اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔ کون لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے، رشتے داروں میں یا۔“

”بہت دور کی رشتے داری ہے۔ یعنی پھوپھی کے دیور کے سارے وغیرہ وغیرہ۔“ وہ اس کے انداز پر بے ساختہ ہنس پڑی تو وہ ثانیہ کو گود میں اٹھا کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”بس آپ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ ایک دم ہشاش بشاش تاکہ آپ کو مہمانوں سے متعارف کرایا جاسکے۔“

”اچھی بات ہے۔ اور یہ تم ثانیہ کو کہاں لے جا رہی ہو؟“

”اس کا منہ دھلا دوں۔“

”ارے نہیں، اسے نیچے اتار دو۔ یہ خود منہ ہاتھ دھولے گی۔“

”اچھا!“ اس نے ثانیہ کو نیچے کھڑا کیا پھر اس کا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بھئی واہ ثانیہ بیٹا تو بڑا ہو گیا ہے۔“

”ابھی میں بڑی نہیں ہوئی۔ جب بڑی ہوں گی تو پاپا کے پاس امریکہ جاؤں گی۔“

ثنانیہ کا ذہن یقیناً رات کی باتوں سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ جیسی فوراً بولی تو مریم کچھ حیران سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور وہ طویل سانس لے کر بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”جاؤ، ثانیہ منہ دھو کر آؤ۔“ مریم نے ثانیہ کو بھیجا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”ثنانیہ کو اس کے پاپا کے بارے میں آپ نے بتایا ہے۔“

”رات وہ خود ہی سوال کرنے لگی تھی اس لیے مجھے بتانا پڑا۔ اور یہ کوئی چھپانے والی بات تو نہیں ہے۔ مریم! آخر کبھی نہ کبھی تو اسے اپنے باپ کے بارے میں پوچھنا ہی تھا۔“

”ہاں اور لگتا ہے آپ نے اس کی باتوں کا اثر لیا ہے۔“ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”نہیں بابی! ابھی تو ابتداء ہے اور آپ ہمت ہارے دے رہی ہیں۔ آپ کو تو بہت حوصلے کی ضرورت ہے۔“

”مجھ میں حوصلہ ہے مریم! بس ایسا ہے کہ میں نے اس بچ پر کبھی سوچا نہیں تھا اس لیے ثانیہ کے منہ سے اچانک ایسی باتیں سن کر میں ڈسٹرب ہو گئی لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر ثانیہ ابھی چھوٹی ہے سمجھدار ہوگی تو میں اس کے باپ کے بارے میں اسے سچ سچ بتا دوں

گی۔“

”مما! آج اسکول نہیں جانا۔“ ثانیہ منہ ہاتھ دھو کر آئی تو پوچھنے لگی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”نہیں بیٹا! آج آپ کی ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے چھٹی۔“ پھر اٹھ کر ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر کچن کی طرف جاتے ہوئے اس سے بولی۔

”میں اور ثانیہ ناشتا بنانے جا رہے ہیں۔ جب تک آپ بھی منہ ہاتھ دھولیں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر ناشتے کے بعد مریم ثانیہ کو لے کر نیچے چلی گئی اور اُسے خاص طور سے تاکید کر گئی کہ وہ ہر بات ذہن سے جھٹک کر کچھ دیر کے لیے سو جائے تاکہ رات کی نیند پوری ہو اور طبیعت کا بوجھل پن دور ہو جائے اور اس نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات پر عمل کیا۔

پھر شام تک وہ نہ صرف بہت بہتر تھی بلکہ آئندہ کے لیے اپنے آپ کو ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ مریم ٹھیک کہتی ہے کہ ابھی تو ابتداء ہے۔ اور آئندہ ہوتا نہیں اُسے کن کن مراحل سے گزرتا پڑے گا۔ بہر حال حالات کیسے بھی ہوں، وہ پھر کبھی اس طرح ہمت نہیں ہارے گی۔

سہ پہر میں ہی وہ نیچے چلی گئی اور آئنی کے منہ کرنے کے باوجود مریم اور عابدہ کا ہاتھ بنانے لگی۔ اس دوران مریم کے ساتھ ل کر اس نے عابدہ کو خوب تنگ کیا کہ وہ بے چاری آخر میں ان دونوں سے خفا ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”دیکھو جا کر کہیں رو کر تو نہیں رہی۔“ اس نے مریم سے کہا۔

”ارے نہیں نہ نہ بابی! روئے گی کیوں۔“ وہ یقین سے بولی۔ ”سب مصنوعی خفگی ہے جبکہ اندر ہی اندر تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔“

”ٹھیک کہتی ہو۔“ وہ ہنسی اس وقت کال بیل بجنے سے دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ پھر مریم سرگوشی میں بولی۔

”میرا خیال ہے، وہ لوگ آگئے ہیں۔“ پھر اپنے امی، ابو کے ساتھ کچھ دوسری آوازیں سن کر بولی۔

”ہاں آگئے ہیں۔ چلیں۔ آپ جلدی سے چائے کا پانی رکھ دیں۔ میں یہ چیزیں ٹرائی میں رکھ دیتی ہوں۔“

”تم پہلے جا کر اپنے جیاجی کو سلام تو کراؤ۔“ وہ کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے۔ ٹرائی لے کر ہی جاؤں۔“

”اور عابدہ؟“

”اُسے اُکر بلایا گیا تو وہ چائے لے کر آجائے گی اور آپ بھی اس کے ساتھ ضرور آئیے گا۔“

”نہیں بھئی، مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔“ اُسی وقت آنٹی آگئیں۔ مریم کو ٹرائی اندر لے جانے کے لیے کہا پھر اُس سے کہنے لگیں۔

”بیٹا! تم عابدہ کو اندر لے آؤ۔ وہ لوگ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”جی!“ وہ اسی قدر کہہ سکی اور پلٹ کر چائے دم کرنے لگی۔ پھر ٹی پاٹ ٹرے میں رکھ کر اندر سے عابدہ کو لے آئی اور ٹرے اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

”چلو مہمان تمہارے ہاتھوں کی بنی چائے پینا چاہتے ہیں۔“

”لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ارے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“

اس نے یوں لا پرواہی سے کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ پھر آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔ عابدہ کے ہاتھوں میں ٹرے تھے، اس لیے اس نے آگے بڑھ کر جیسے ہی پردہ ہٹایا۔ سامنے علی مراد کو بیٹھے دیکھ کر بُدی طرح چونکی۔ غیبت تھا کہ وہ اس وقت کسی اور طرف متوجہ تھا۔ وہ فوراً اوٹ میں ہو گئی اور جیسے ہی عابدہ اندر داخل ہوئی اور وہیں سے پلٹ کر وہ بارہ بچن میں آگئی۔ اس کا دل اچانک بڑے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اور علی مراد کی یہاں موجودگی کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ کس حیثیت سے یہاں آیا ہے اور کیوں؟ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ مریم آگئی۔

”کماں ہے نرسب باجی آپ یہاں بیٹھی ہیں؟ آئیے ناں آپ کو مہمانوں نے

ملواؤں۔“ اس نے چونک کر دیکھا تو بمشکل سنبھل کر بولی۔

”نہیں مریم! مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”کیا اچھا نہیں لگے گا؟“

”تم سب کے درمیان میں اجنبی سی۔“

”آپ اپنے آپ کو اجنبی سمجھتی ہیں۔“ مریم روٹھنے لگی۔ ”ہم نے تو پہلے دن ہی آپ

کو اپنی بڑی بہن کا درجہ دے دیا تھا۔“

”میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں لیکن پلیز اس وقت مجھے مجبور مت کرو۔“ وہ منت سے

بولی۔

”آخر کیوں؟“

”بس اس وقت میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔ شاید مہمانوں سے ٹھیک طرح

سے نڈل سکوں۔ آئندہ..... آئندہ ضرور ملوں گی۔ اب تو یہ آنا جانا رہے گا۔“

”ہاں اور آئندہ میں کوئی عذر نہیں سنوں گی۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ زبردستی مسکرائی اور اس کے جاتے ہی بہت خاموشی سے اوپر

چلی آئی۔

ابھی کچھ وقت پہلے ہی تو اس سے سوچا تھا کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ ہمت نہیں ہارے گی اور اتنی جلدی حالات اسے آزمانے چلے آئے تھے۔ اسے علی مراد سے کوئی نسبت تھی یا نہیں، اس بات سے قطع نظر وہ بہر حال اس کا شوہر تھا اور اس کی یہاں موجود واقعی اجنبی کی بات تھی۔ وہ اس وقت سے سوچ سوچ کر پریشان تھی۔ مسلسل ٹھلٹے ہوئے اس کا ذہن بھی مسلسل الجھتا جا رہا تھا۔ شام ڈھلنے لگی تھی اور رات کی سیاہی پر پھیلاتی چلی آرہی تھی۔ جب مریم، ثانیہ کو گود میں اٹھائے آگئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اور اپنی خوشی کا اظہار ثانیہ کو گود لگا کر رہی تھی۔

”مہمان چلے گئے۔“ وہ یونہی سناٹوں میں گھری پوچھنے لگی۔

”ہاں اور اب وہ مہمان نہیں رہے۔ اپنے اپنے سے ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ابھی جاتے

جاتے عابدہ کو انگلی بھی پہناتے گئے ہیں۔“ مریم نے بے حد خوش ہو کر بتایا۔

”اچھا مبارک ہو۔“ وہ کوشش کے باوجود اپنی آواز میں خوشی کا تاثر پیدا نہیں کر سکتی۔

پھر بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیا نام ہے لڑکے کا اور کیا کرتا ہے؟“

”انور بھائی ایک نیم سرکاری ادارے میں اکاؤنٹنٹ ہیں۔“

”کون کون آیا تھا؟“ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”انور بھائی کے والدین، دو بہنیں اور ایک اُن کا دوست تھا۔

”دوست۔“ وہ طویل سانس لے کر یونہی آسمان پر دور دور تک نظریں دوڑانے لگی پھر اس کی طرف دیکھا تو بولی۔

”یہ تم ثانیہ کو ہر وقت گود میں مٹ اٹھایا کرو۔ اب یہ بڑی ہو گئی ہے۔“

”کوئی نہیں۔ ابھی ننھی سی تو ہے۔ ہے ناں ثانی؟“ مریم نے تصدیق کے لیے ثانیہ سے پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

وہ ایم اے کے امتحانوں سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ گرمیوں کی چٹھیوں کے سبب اسکول بند ہو گئے اور وہ ایک دم جیسے فارغ ہی فارغ ہو گئی۔ تب اُس نے اچانک اماں اور بابا سائیں کے پاس جانے کا پروگرام بنالیا۔ پچھلے سال بھی وہ بس سوچتی رہ گئی تھی لیکن جانیں سکتی تھی۔ اس لیے اب اس نے پروگرام بناتے ہی تیاری کر لی۔

”نہیں باجی! ہمارا بالکل دل نہیں لگے گا۔ خاص کر ثانیہ کے بغیر۔“ مریم اس کے جانے کا سن کر ہی اداس ہو رہی تھی۔

”بس دو مہینے کی تو بات ہے۔ پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔“

”جی نہیں۔ دو مہینے بہت زیادہ ہوتے ہیں یعنی پورے ساٹھ دن اور میں تو ایک دن ثانیہ کو نہ دیکھوں تو مجھے چین ہی نہیں آتا۔“

”ثانیہ بھی تم سے بہت مانوس ہو گئی ہے۔“ وہ مسلسل اپنے کام میں مصروف رہی۔

”تو پھر آپ اسے یہیں چھوڑ جائیں۔“ وہ ایک دم سر اٹھا کر دیکھنے لگی تو مریم ہتا نہیں کیا سمجھی۔ سر جھکا کر بولی۔

”شاید میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔“

”ارے نہیں۔“ وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ ”میں ضرور ثانیہ کو تمہارے پاس چھوڑ دیتی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اماں اور بابا سائیں بھی اسے دیکھنا چاہتے ہوں گے۔“

”یہ تو ہے۔“ مریم نے پرسوج انداز میں سر ہلایا۔

”بہر حال تم اداس مت ہو۔ میں جلد آنے کی کوشش کروں گی۔“

”کچلی بات ہے ناں۔“

”بالکل کچلی بات اور اب جلدی سے ثانیہ کو تیار کر دو۔ ہمارے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔“

اُس نے اٹھ کر ثانیہ کو کپڑے اسے دے پھر سوٹ کیس بند کرنے لگی۔ اس کے بعد نیچے اتر کر آئی تو آنٹی عابدہ بھی ویسی ہی باتیں کرنے لگیں۔ اصل میں اس گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لیے سب ثانیہ سے بہت پیار کرنے لگے تھے۔

تہائیوں کے مارے اماں اور بابا سائیں اس کی آمد پر بے حد خوش ہوئے۔ سونے آگن میں جیسے بہار اُتر آئی تھی۔ وہ یہاں ماما می کے گھر تھی تو ہر دوسرے دن چکر لگالیا کرتی تھی۔ اس لیے کبھی انہیں احساس نہیں ہوا کہ انہوں نے بیٹی بیاہ دی ہے اور اب تو وہ پورے ڈھائی سال بعد آئی تھی۔ کبھی اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیتیں اور کبھی ثانیہ کو گود میں بھر کر یوں پیار کرتیں جیسے نرسب چھوٹی ہو گئی ہو۔ عجیب انداز تھا ان کا۔ ثانیہ کا منہ چومتیں اور کہتیں بالکل میری نرسب ہے۔ دن بھر یہی کچھ ہوتا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے سب کا حال احوال بھی پوچھتی رہی۔ ماما می کے بارے میں اس نے قصداً نہیں پوچھا تھا لیکن اماں خود ہی بتانے لگیں۔

”کوئی چھ آٹھ مہینے پہلے علی مراد آیا تھا۔ ولایت سے بڑھ کر آیا ہے۔ بتا رہا تھا ادھر شہر میں کوئی بڑا افسر لگ گیا ہے۔“

”اچھا!“ اس کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے عابدہ کے گھر میں اسے دیکھا تھا! صحت مند تو انار مرد کے روپ میں۔ اور ناں کہہ رہی تھیں۔

”وہ تو تیرے ماما، ماما کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا تھا پر وہ دونوں مانے نہیں۔“

”کیوں..... کیوں نہیں مانے؟“ وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

”بے جوڑ شادیوں کا بھی انجام ہوتا ہے۔ یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ یہ آپ کا دور نہیں ہے جو عورت خاوند کو پاس پوس کر بڑا کرے پھر بڑے آرام سے دوسری عورت کے حوالے کر دے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ مرد بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جس عورت کے سامنے وہ پل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔ اسے بیوی بنا لے۔ اگر علی مراد مجھے طلاق دے دے گا تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔“

قد رے توقف کے بعد کہنے لگی۔

”پھر وہ اس گاؤں کا پروردہ بھی نہیں ہے جو سمجھوتے کی سوچے گا۔ پڑھ لکھ کر اور ترقی یافتہ ممالک دیکھ کر تو اس کے خیالات مزید بدل گئے ہوں گے۔ اور اگر اس نے معاشرے میں کوئی مقام بنالیا ہے تو اسے اس مقام اور جس معاشرے میں رہ رہا ہے اس کے تقاضوں کو بھی نباہنا ہوگا۔“ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔

”علی مراد کچھوڑیں، میں خود بھی اس بندھن کو نہیں بھا سکتی۔“

”چھوڑی!“ اماں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑی۔

”یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اماں۔ جب دل نہیں ملتے۔ مزاج نہیں ملتا اور ذہن ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے تو کوئی زبردستی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو برداشت کریں۔ ہمارا مذہب ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ صلح صفائی سے رہیں یا پھر ایک دوسرے کو الزم دیے بغیر الگ ہو جائیں۔“

”تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”چلیں چھوڑ دیں اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں بس یہ سوچ لیں کہ اللہ جو کرے گا۔ بہتر کرے گا۔“ پھر اس نے موضوع بدل دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اماں کا دھیان ہٹانے میں بھی کامیاب ہو گئی۔

برادری میں رفتہ رفتہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو گئی تو روزانہ ہی کوئی نہ کوئی اس سے ملنے آ جاتا۔ اس کے پیچھے لاکھ اس پر باتیں بنائی گئی ہوں لیکن اس کے منہ پر سب اسے سراہ رہے تھے۔ کہ اس نے اپنی زندگی بنانے کے لیے جو جدوجہد کی وہ لڑکیوں کے لیے مثال ہے۔ کم از کم آئندہ لڑکیاں اس طرح شوہروں کے انتظار میں بیٹھی نہیں رہ جائیں گی۔ وہ سب کی باتیں سنتی اور مسکراتی رہتی تھی۔ بعد میں جب اماں اسے بتائیں کہ یہی

”دھیے! اپنا گھر کون چھوڑتا ہے۔ یہاں اپنی پوری برادری ہے۔ کوئی دکھ سکھ ہو، سب ساتھ رہتے ہیں اور شہر میں کون ہے۔ بندہ اکیلا دیواروں سے باتیں کرتا رہے۔“

”نہیں اماں! وہاں بھی ہمارے ہی جیسے لوگ رہتے ہیں۔“ وہ دقاع کرتے ہوئے بولی۔ ”جہاں میں رہتی ہوں، وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بالکل انہوں کی طرح ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔“

”سب تو اچھے نہیں ہوتے۔“

”سب اچھے ہوتے ہیں اماں! پھر یہ تو ہم پر منحصر ہے ہم اچھی طرح سے ملیں گے تو دوسرا بھی محبت سے ملے گا۔“

”یہ تو ٹھیک کہتی ہے۔“ اماں نے پرسوج انداز میں سر ہلایا پھر آواز دھیمی کر کے رازداری سے پوچھنے لگیں۔ ”شہر میں علی مراد تیرے پاس آتا ہے۔“

”نہیں۔“

”دھیے! جب ایک ہی شہر میں رہتے ہو تو ساتھ کیوں نہیں رہتے۔“

”ہم ساتھ نہیں رہ سکتے اماں!“ اس کے انداز میں آپ ہی آپ ناگواری سمٹ آئی۔ جیسے اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہتی ہو۔

”کیوں ساتھ نہیں رہ سکتے؟“

”ہمارے راستے شروع ہی سے الگ تھے لیکن آپ لوگوں نے نہیں سمجھا۔ خیر چھوڑ دیں۔ یہ بتائیں۔ علی مراد نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟“ وہ بہت دیر سے یہ بات جانا چاہ رہی تھی۔

”ہاں بلکہ یہاں تو بہت غصے میں آیا تھا کہ تو اس کی اجازت کے بغیر شہر کیوں گئی۔“

”اچھا!“ وہ خواہ مخواہ ٹہکی۔ ”ذرا میرے سامنے تو یہ بات کہے۔ مجھے اس کی اجازت کی ضرورت ہے ہونہہ!“

”تو اس کی بیوی ہے۔“

”نہیں اماں! اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اُسے میری اور بچی کی ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی کہ وہ مجھے طلاق دے سکتا ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہے!“ اماں ششدر سی ہو کر بولیں۔ ”علی مراد طلاق دے گا۔“

”چائے اوپر ہی لے آنا۔ میں جب تک شاور لے لوں۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ وہ ثانیہ کو لیے ہوئے کچن میں چلی گئی تو وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اوپر آگئی۔

اسکول کھلنے میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور ان چند دنوں میں اس نے اطمینان سے کچھ ادھورے کام مکمل کیے پھر عابدہ کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کے لیے بھی اس نے ابھی سے تیاری کر لی۔ وہ اپنی اس زندگی سے غیر مطمئن تو نہیں تھی لیکن پوری طرح مطمئن بھی نہیں تھی۔ کسی کسی وقت خیال آتا کہ اگر زندگی کو اسی حد تک محدود رکھنا تھا تو پھر اپنا گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں بھی وہ اسی طرح ایک اسکول میں پڑھا ہی رہی تھی۔ انہی دنوں اس کا ایم اے کا رزلٹ نکلا اور اپنی چوتھی پوزیشن دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور اس تمام عرصے میں وہ پہلی بار نو عمر لڑکیوں جیسی حرکت کر گئی کہ سیڑھیوں میں چلاتی اور بھاگتی ہوئی آئی۔

”آئی میں نے چوتھی پوزیشن لی ہے۔“ اس نے دسکتے چہرے کے ساتھ بتایا۔
 ”مبارک ہو۔“ آئی کے ساتھ ساتھ عابدہ نے بھی اسے مبارکباد دی جبکہ مریم کہنے لگی۔

”میں پہلے مٹھائی کھاؤں گی پھر مبارکباد دوں گی۔“
 ”صرف مٹھائی!“ وہ بے حد خوش تھی۔ حاتم طائی کی قبر پر لاٹ مارنے کو تیار۔
 ”چلیں، مٹھائی چھوڑیں۔ شام میں طارق روڈ چلیں گے۔ مجھے وہاں کی آکس کریم بہت پسند ہے۔“

”ہوں!“ آئی نے مریم کو گھورا تو وہ کہنے لگی۔
 ”مت ٹوکیں آئی! میری خوشی ہے پلیز اجازت دے دیں۔“
 ”بیٹا! یہ تو یونہی چٹوری ہے۔“
 ”کوئی نہیں۔“ مریم نے منہ پھلایا تو وہ اس کی خاطر آئی کو رام کرنے لگی اور آخر انہیں منا کر ہی دم لیا۔

وہ تینوں اکثر شاپنگ کے سلسلے میں قریبی مارکیٹ تک چلی جاتی تھیں لیکن گھر سے اتنی دور طارق روڈ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ پتا نہیں مریم نے یہاں کی آکس کریم پہلے کب

لوگ پہلے کیسی باتیں کرتے تھے تب بھی وہ کوئی خاص اثر نہیں لیتی تھی اور اماں سے بھی کہتی کہ وہ کسی کی باتوں پر کان نہ دھرا کریں۔

یوں سب سے ملنے ملانے میں دو مہینے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا اور اس نے واپسی کی تیاری کر لی۔ اماں بے حد اداس ہو گئیں۔

”تیرے آنے سے رونق ہو گئی تھی چلی جائے گی تو گھر کاٹنے کا دوڑے گا۔“
 ”اسی لیے تو کہتی ہوں آپ اور بابا سائیں بھی میرے ساتھ چلیں۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔ ”یقین کریں اماں! یہاں کے مقابلے میں وہاں بہت آرام ہے۔“
 ”چھوڑ دو جیسے! ہم نے تو شروع سے ہی سنا ہے کہ شہروں میں سکون نہیں ہوتا۔“
 ”سکون اور اطمینان اپنے اندر ہوتا ہے اماں! باہر نہیں ڈھونڈا جاتا۔ بہر حال آپ وہاں آکر ضرور دیکھیں اگر دل نہ لگے تو بے شک واپس آجائیے گا۔“
 ”آئیں گے۔ تیرے بابا سائیں اور میں کچھ دنوں کے لیے آئیں گے۔“ اماں نے کہا پھر وہ دیر تک ان کے سینے سے لگی رہی تھی۔

☆☆☆

”ننہ بابی!“ مریم نے اُسے دیکھتے ہی چیخ نما آواز کے ساتھ نعرہ بلند کیا تھا پھر بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ ”ایمان سے بابی! آپ نے بہت بور کیا۔ اپنی بات پوری کی ناں۔ پورے دو مہینے بعد آئی ہیں۔“

”کیا کرتی، اماں تو اب بھی نہیں آنے دے رہی تھیں۔“ اس نے بمشکل اپنے آپ کو چھڑایا پھر آئی اور عابدہ سے مل کر کچھ دیر کے لیے دیں بیٹھ گئی۔

”ثانیہ مجھے یاد کرتی تھی؟“ مریم ثانیہ کو گود میں لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔
 ”بہت زیادہ بلکہ اکثر تمہارے پاس آنے کے لیے رونے لگتی تھی۔“
 ”بس تو اسے مجھے دے دیں۔“

”تمہاری ہی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ”اچھا آئی! میں چلوں۔“

لیکن کے سفر نے تھکا دیا ہے۔“

”بیٹھیں ناں۔ میں چائے بنا رہی ہوں۔“

کھائی تھی جو اُسے اب تک یاد تھی۔ یا پھر اس نے یونہی کہہ دیا تھا۔ بہر حال آئس کریم واقعی لا جواب تھی۔ اس کے بعد فوراً گھر جانے کے بجائے وہ تینوں شوکیسوں میں سج فیشن کے ملبوسات دیکھنے لگیں۔ گوکہ انہیں خریدنا کچھ نہیں تھا۔ لیکن مریم کا کہنا تھا کہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے جبکہ وہ اور عابدہ دھیمی آوازوں میں سونوں پر بنے ڈیزائن کے بارے میں ایک دوسرے کو بتاتے لگیں کہ ڈیزائن کس چیز سے اور کس طرح بنایا گیا ہے۔ پھر شرٹ کی کنگن کس طرح کی گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک جگہ اس نے محسوس کیا مریم بہت دیر سے خاموش ہے اور جب اس سے کچھ کہنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو وہ موجود نہیں تھی۔ وہ عابدہ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ایک جگہ وہ کھڑی نظر آگئی اور اس کے ساتھ یقیناً علی مراد تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا تو جلدی سے ثانیہ کو گود میں اٹھایا اور عابدہ کا ہاتھ پکڑ کر دکان کے اندر داخل ہو گئی۔

”کیا لیتا ہے؟“ عابدہ پوچھنے لگی۔

”باہر سوٹ اچھے منگے ہوئے ہیں، ان میں اور کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ کوئی پسند آ گیا تو لے لوں گا۔“ اس نے کہا پھر ایک نظر شیشوں سے باہر ڈال کر دکاندار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر اسے کچھ مخصوص کمرنگا لے کے لیے کہا۔

”یہ مریم کہاں رہ گئی۔“ وہ بظاہر سوٹ دیکھنے میں مگن تھی اور عابدہ کو اتنی دیر بعد خیال آیا تو پوچھنے لگی۔ قصداً اُن سنی کر گئی اور ایک سوٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھو، یہ کیسا ہے۔“

”ہاں، اچھا ہے۔“ اسی وقت مریم نے دکان کے اندر جھانک کر دیکھا اور اُن دونوں کو کھڑے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے قریب آ کر بولی۔

”کمال ہے، آپ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔ وہ تو اچانک نظر پڑ گئی ورنہ میں ڈھونڈتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل جاتی۔“ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ پہلے دکاندار کو سوٹ پیک کرنے کے لیے کہا پھر کاؤنٹر پر پے منٹ کرنے کے بعد مریم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اُن کبھی داستا نہیں سنار ہا تھا۔ اگر علی مراد کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس کے چہرے پر لکھی تحریریں دلچسپی سے پڑھتی لیکن اب وہ اندر ہی اندر ڈوبنے لگی تھی۔

رات بہت دیر تک وہ سوہتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مریم کو اس راستے

پر چلنے سے کیسے روکے۔ کیسے اُسے بتائے کہ جس شخص کے وہ خواب دیکھنے لگی ہے۔ وہ علی مراد ہے، ایک بچی کا باپ اور پتا نہیں اس بچی کے باپ نے اپنا تعارف کس انداز سے کرایا ہوگا۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ علی مراد نے مریم کے سامنے اپنے آپ کو کیا ظاہر کیا ہے لیکن میں موقع دیکھ کر ضرور مریم کو بتاؤں گی۔ آخر میں اس نے سوچا اور قدرے اطمینان سے ہو گئی کہ مریم اب اتنی نادان بھی نہیں تھی کہ علی مراد کی اصلیت جان کر بھی نہ سنبھلتی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ خود بے حد مصروف رہی اس نے یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کیا تھا۔ اس سلسلے میں فی الحال اس کی ساری توجہ اسی طرف تھی۔ پھر اس کی کوشش اور قسمت بھی مہربان تھی کہ اسے لیکچرر شپ مل گئی۔ یوں نئی جاب میں سیٹ ہونے اور اپنی ثانیہ کی نئی روٹین سیٹ کرنے میں کافی دن اُسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔

ثانیہ کے لیے کوئی خاص پرابلم نہیں تھی۔ صبح وہ خود اسے اسکول چھوڑ آتی۔ واپسی میں وہ عابدہ کے ساتھ آ جاتی تھی۔ پھر کیونکہ وہ سب گھر والوں سے مانوس تھی اس لیے اگر اسے یونیورسٹی سے آنے میں دیر بھی ہو جاتی تو وہ مریم کے ساتھ آرام سے رہتی تھی۔

بہر حال ثانیہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ خود اپنی نئی جاب سے زیادہ نئے ماحول سے گھبرائی ہوئی تھی۔ گوکہ وہ اچھی میچور اور پراعتماد تھی لیکن مخلوط ماحول یقیناً اس کے لیے نیا اور اجنبی تھا۔ اپنی اب تک کی زندگی میں اُس نے صرف بابا سائیں کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی شفقتیں اور محنتیں بڑی شدت سے محسوس کی تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی مرد اس کی زندگی میں نہیں آیا تھا۔ ایک علی مراد جو فقط ایک رات کا مہمان ہوا پل میں اسے لڑکی سے عورت تو بنا دیا لیکن اس کے خوابیدہ جذبول کو بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس ڈھٹائی سے سارا الزام اس کے سر رکھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ وہ کبھی بھی علی مراد کے سامنے جم کر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ اس کا کیا بھروسہ۔ اس کے منہ پر بھی کہہ سکتا تھا۔ میں نشے میں تھا، تم تو ہوش میں تھیں۔

اس تمام عرصے میں علی مراد کا یہ جملہ مسلسل اس کے لیے بازگشت بنار ہا تھا۔ اور شاید وہ اندر ہی اندر کچھ خوفزدہ ہی تھی جیسی دوبار اسے دیکھنے کے باوجود اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکی کہ اس کے سامنے جا کھڑی ہو۔ اور یونیورسٹی میں تو کتنے بہت سارے لوگوں کا سامنا

تھا جو اگر علی مرا نہیں تھے تو اس جیسے ضرور تھے۔ جیسی وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اس کی ساری کوشش اس بات پر صرف ہو رہی تھی کہ اس کی یہ کمزوری کسی کی نظروں میں نہ آئے۔ پائے لیکن تاڑنے والے غضب کی نگاہ رکھتے ہیں۔ اُس روز ڈاکٹریز وانی نے کہہ دیا۔

”گلتا ہے، آپ فرسٹ ٹائم گھر سے نکلی ہیں۔“

”جی۔“ وہ بے حد حیران ہوئی۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”پہلے کہیں جاب کی ہے آپ نے؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”میں اس سے پہلے اسکول میں پڑھاتی رہی ہوں۔“

”اچھا،“ انہیں جیسے یقین نہیں آیا۔ اس پر نظریں جما کر کہنے لگے۔

”آپ یہاں کی نہیں لگتیں۔ میرا مطلب ہے کراچی کی۔“

”کیوں، کیا میں اُردو صاف نہیں بولتی؟“

”اُردو تو ٹھیک ٹھاک بول لیتی ہیں لیکن لہجہ۔“ وہ خاموش ہو کر غالباً خود قیاس کرنے

لگے اور وہ بول پڑی۔

”میں شہدادکوٹ سے آئی ہوں۔“

”اچھا ہاں۔“ وہ ہلکے سے مسکرا کر سر ہلانے لگے پھر پوچھا۔

”یہاں کراچی میں کب سے ہیں۔“

”تیسرا سال ہے۔“

”پھر تو اب تک آپ کو خاصا لیکنو ہو جانا چاہیے تھا۔“ اس کے دیکھنے پر کہنے لگے۔

”یہاں کے ماحول کا تقاضا یہی ہے۔ زینب شاہ۔ اور جب آپ گھر سے نکلی ہی ہیں تو

آپ میں اتنا حوصلہ ضرور ہونا چاہیے کہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کر سکیں۔“

”ڈاکٹریز وانی۔“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش اور وہ سر جھکا گئی۔ کتنا عجیب سا لگ رہا تھا

کہ کوئی شخص اس کی اندرونی کیفیات سمجھ کر بات کر رہا تھا۔

”جتنا پر اعتماد آپ اپنے کو ظاہر کرتی ہیں حقیقتاً آپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس نے

بس ایک پل کو ذرا سی پلکیں اٹھائیں اور کبھی کبھی زندگی میں بس..... ایک پل اتنا زور آور

ہوتا ہے کہ پوری حیات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا یا شاید کچھ بھی نہیں۔ بس

اتنا تھا کہ زینب شاہ کی سماعتوں میں پہلے اس براق گھوڑے کی ٹاپیں گونجی تھیں جو وہ

برسوں پہلے چولہے کی راکھ کریدتے ہوئے سنا کرتی پھر اچانک آس پاس ایک نئی دنیا جگمگاتی تھی۔

”زینب شاہ۔“ اس نے اندر ہی اندر دھیرے دھیرے اپنے آپ کو یکارنا شروع کیا لیکن لگتا تھا جیسے وہ کھو گئی ہو۔ اتنے بڑے ہجوم میں نہیں بلکہ سامنے بیٹھے اس تنہا شخص کی ذات میں۔

زندگی میں یہ موڑ آیا بھی تو کب جب وہ ایک بچی کی ماں تھی۔ اس میں اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔ اگر بہت پہلے بھی ایسا کوئی موڑ آتا تب بھی اگر وہ بچی کی ماں نہیں تھی تو علی مراد کی بیوی تھی۔ اور یہ ایسی تلخ حقیقت جس نے خوابوں کو پلکوں تک اترنے سے پہلے ہی ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے کبھی ان ریزوں کو چھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک طرح سے خود پر زندگی کے دروازے بند کر دیے تھے اور گو کہ اس نے بہت پہلے ہی سوچ لیا کہ وہ علی مراد کے ساتھ نہیں رہے گی لیکن یہ تو کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی زندگی میں داخل ہو سکتا ہے اور یہ ضروری تو نہیں کہ جس بات کا گمان نہ ہو، وہ ہو بھی ناں۔ ڈاکٹریز وانی نے پتا نہیں کب اور کیسے اس کے اندر کی لڑکی کو پالیا تھا۔ جسے وہ اپنے طور پر وہ ہیں کہیں راکھ کے ڈھیر میں دفن کر آئی تھی۔

☆☆☆

وہ مریم اور علی مراد والی بات بھولی نہیں تھی بس وقتی طور پر ذہن سے نکل گئی تھی اور اس وقت اُسے گزشتہ بات بھی یاد آگئی جب اس نے ایک بار پھر ان دونوں کو ساتھ دیکھا۔ اس روز اسے لائبریری سے کچھ کتابیں اشو کروانے میں دیر ہو گئی تھی، جس سے پوائنٹ مِس ہو گیا اور وہ اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وائٹ کرولا میں اس نے علی مراد کے ساتھ مریم کو بیٹھے دیکھا۔ اتفاق سے مریم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور بے حد گھبرا کر اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا جبکہ وہ آج چوکی نہیں تھی بلکہ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ مریم اپنے گھر والوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہی ہے۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ مریم سے بات کرے گی لیکن آج جب مریم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا تو اس نے قصداً خاموشی اختیار کر لی تھی۔ دو دن وائٹ سے نیچے نہیں گئی نہ ہی مریم اس کے پاس آئی۔

تیسرے دن چھٹی تھی۔ اور چھٹی کا دن ہفتے بھر کے جمع شدہ کاموں کی نذر ہو جاتا

تھا۔ سارا دن وہ مصروف رہی۔ شام میں چائے کا کپ لے کر وہیں صحن میں رکھی کرسی پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ مریم آگئی اور اسے دیکھتے ہی اس کی نگاہوں میں تین روز پہلے کا منظر گھومنے لگا۔ پھر بھی انجان بن گئی اور ہمیشہ والے انداز سے بولی۔

”اگر چائے پیو گی تو پلیز کپ میں ڈال کر لیتی آؤ، کیتلی میں کافی چائے ہے۔“
مریم سیدھی کچن میں چلی گئی پھر چائے لے کر دوسری کرسی کھینچتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھی تو وہ کہنے لگی۔

”ثانیہ کو نہیں لائیں؟“

”وہ ابو کے ساتھ باہر گئی ہے۔“

”بہت تنگ کرنے لگی ہے تم سب کو۔“

”نہیں۔“ مختصر جواب دے کر مریم نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ تو وہ یونہی سروانچا کر کے آسمانی پراڑتی اُکاؤ کا پتنگوں کو دیکھنے لگی۔

”آپ پوچھیں گی نہیں کہ اُس روز میرے ساتھ کون تھا۔“ جس طرح مریم نے اچانک کہا اس طرح وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی تھی۔ پھر فوراً سنسبیل کر بولی۔
”تم جانتی ہو اُسے؟“

”ہاں، اُس نے اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔“

”مثلاً کیا؟“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”وہ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے۔“

”تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔“ اس کے لہجے میں آپ ہی آپ

تاسف سمٹ آیا۔

”اہمیت ہوتی اگر جو بیوی بچہ اس کے ساتھ ہوتے۔ وہ انہیں چھوڑ چکا ہے۔“ پھر اُس کے کیوں کہنے سے پہلے ہی تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگی۔

”اصل میں اس کے ماں باپ نے اس کی شادی ایک جاہل اور گنوار لڑکی سے کر دی تھی۔ جبکہ وہ خود امریکہ سے اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آیا ہے اور یہاں بہت اچھے عہدے پر فائز ہے۔ وہ کسی طرح اس لڑکی سے نباہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کبھی بھی اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ بس والدین کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔ وہ چاہتے تھے

کہ وہ امریکہ جانے سے پہلے شادی کر لے اور یوں اس کے باپ نے زبردستی، اپنی بھانجی اس کے لیے باندھ دی۔ جو کسی طرح بھی اس کے قابل نہیں تھی۔“ قدرے توقف کے بعد اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھتی ہوں یہ ڈاکٹر علی کے ساتھ واقعی زیادتی ہے۔ وہ اتنا ابجو کیفڈ اور نفیس بندہ اور اس کے ساتھ ایک جاہل گنوار لڑکی کا تصور عجیب سا لگتا ہے وہ اپنی زندگی کے اس ایسے پر بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہے نہ نہ باجی۔ اگر اُسے سہارا نہ ملا تو وہ بکھر جائے گا۔“

”ہاں علی مراد۔“ وہ طویل سانس لے کر سوچنے لگی۔ ”تھوڑا بہت جھوٹ تو چل ہی

جاتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ تم نے اپنا شادی شدہ ہونا چھپایا نہیں۔“

”آپ کچھ کہیں گی، نہیں۔“ مریم اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”میں کیا کہوں۔ البتہ تم یہ بتاؤ کہ کس حد تک سنجیدہ ہو۔ میرا مطلب ہے محض اُسے سمیٹنا چاہتی ہو یا کوئی اور جذبہ بھی ہے۔“

”میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی باجی! میں اُسے بہت پسند کرتی ہوں۔ اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ اُس کے بغیر میری زندگی میں کچھ بھی نہیں۔“

”کیا وہ اپنی بیوی کو باقاعدہ طلاق دے چکا ہے۔“ وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

”ہاں نہیں۔“

”تو اس سے کہو، پہلے اپنی بیوی کو باقاعدہ طلاق دے پھر تم اس سے شادی کرو گی۔“

”نہیں نہ نہ باجی، میں ایسا نہیں کہہ سکتی۔“

”کیوں؟“ وہ واقعی حیران ہوئی۔

”اس لیے کہ میں نے اس سچ پر سوچا تھا اور مجھے وہ لڑکی انتہائی مظلوم لگی۔ پھر میرے

دل نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں اس مظلوم پر اپنی طرف سے کہہ کر مزید کوئی ظلم کراؤں۔“
”تو کیا اس کے شوہر سے شادی کر کے تم اس پر ظلم نہیں کرو گی۔“ وہ عجیب سی ہنسی کے

درمیان بولی۔

”نہیں۔ اس لیے کہ ڈاکٹر علی ہر صورت دوسری شادی کرے گا۔ میں نہیں تو کوئی اور

سہی۔“

”یہ تو ہے جب وہ فیصلہ کر ہی چکا ہے تو پھر کوئی اور کیوں تم کیوں نہیں۔“ وہ تصور کی

آنکھ سے اُسے علی مراد کے پہلو میں دیکھنے لگی اور جو اُسے علی مراد سے کوئی نسبت ہوتی تو ضرور دل دکھتا لیکن ایسا کوئی ربط تو شروع ہی سے نہیں تھا۔ اور پھر وہ اوّل روز سے ہی جانتی تھی کہ کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہوگا۔ اس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔ بس پھوپھی مراداں نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے برادری سے نکل آئی تھی۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں۔“ مریم اپنے چہرے پر جچی اس کی نظروں سے گھبرا کر بولی۔

”کیا میں غلط کر رہی ہوں؟“

”غلط یا صحیح کا فیصلہ میں نہیں کر سکتی مریم۔ تم خود سمجھدار ہو یا پھر تمہارے والدین جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔“ وہ سہولت سے اپنا دامن بچا گئی۔ پھر قدرے توقف کے بعد ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”ایک مزے کی خبر سناؤں تمہیں۔ وہ علی مراد بھی دوسری شادی کر رہا ہے۔“

”کیا۔“ مریم چوکی۔ ”لیکن کیوں۔“

”ظاہر ہے ابھی اس کی شادی کی عمر ہے۔“

”شادی کی عمر ہے تو باقی آپ بھی تو اتنی اسمارٹ ہیں۔“

”اسمارٹ ہوں تو کیا ہوا۔ ہوں تو اس سے بڑی۔ اور غالباً وہ میرے ساتھ چل کر لوگوں کے ایسے ریماکس نہیں سننا چاہتا کہ علی مراد اور اس کے بے بے۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہو کر ہنسی۔

”آپ کو اس کی اس حرکت سے افسوس نہیں ہو رہا؟“ مریم اسے ہنستے دیکھ کر تعجب سے پوچھنے لگی۔

”نہیں بلکہ مجھے خوشی ہے کہ اس نے ایک اچھی لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔“ وہ اس کے پڑے سر اپنے پر نظر ڈال کر بولی۔

”آپ سے اچھا کون ہو گا باجی، اگر مجھے مل جائے تو میں ضرور اس سے کہوں گی کہ در

بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عابدہ اور ثانیہ کو آتے دیکھ کر اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ارے آپ کو پتا ہے باجی، اگلے جمعے کو عابدہ کی شادی کی تاریخ رکھی جائے گی۔“ مریم کو اچانک یاد آیا تو بتایا۔

”اچھا۔“ اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔ پھر دیر تک وہ اور مریم، عابدہ کو چھیڑنے کے ساتھ ساتھ شادی میں پہننے والے کپڑوں پر ڈسکس کرتی رہی تھیں۔

☆☆☆

اُس روز ثانیہ پھر اپنے پاپا کی باتیں کرنے لگی تھی اور اسے تو وہ بڑے تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کرتی رہی لیکن اندر ہی اندر بہت اُلجھنے لگی تھی۔ ایک بار خیال آیا علی مراد یہیں کہیں موجود ہے۔ وہ ثانیہ کو اس سے ملو ادے لیکن پھر فوراً علی مراد کی بات یاد آئی۔

”مجھے تم سے اور تمہاری بچی سے کوئی لگاؤ نہیں۔“ اس سے سر جھٹک کر سوچا۔

”نہیں، ابھی ثانیہ چھوٹی ہے۔ کچھ نہیں جانتی۔ ایسا نہ ہو۔ یہ تو شوق میں پاپا پاپا کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھے اور جواب میں وہ اُسے جھڑک دے ایسی صورت میں بچی یقیناً دلبرداشتہ ہوگی اور وہ اپنی بچی کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز برداشت نہیں کر پائے گی۔“

اگلے دن وہ بظاہر بڑی نارمل سی تھی لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو بہت خاموشی سے اس کے اندر تک سفر کر آتا تھا اور وہ تھے ڈاکٹر یزدانی۔

”کچھ پریشان ہیں۔“ پہلے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا پھر سرسری انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ سچ سچ اُن سے ڈرنے لگی تھی۔ قصداً اُن کی طرف دیکھنے سے گریز

کرتی۔

”آپ واحد خاتون ہیں نہ نب شاہ جو جھوٹ بولتے ہوئے بھی اچھی لگتی ہیں۔“

”جی۔“ وہ بے اختیار سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”جی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ذرا سا مسکرائے۔

”عجیب شخص ہے۔“ اس نے نظریں چرا کر سوچا۔

”ہتا نہیں کیوں میری کھوج میں ہے اور مجھے کم از کم اس سے نہیں چھپنا چاہیے۔ اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے تاکہ کسی پیش رفت سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ لے۔“

”آپ کیا سوچنے لگیں۔“ انہوں نے چونکا دیا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”آپ کو ہتا ہے نہ نب شاہ، میں نے اب تک شادی نہیں کی۔“ وہ شاید اس کا دھیان

بنانے کی خاطر اپنے بارے میں بات کرنے لگے۔

”کیوں؟“ اس نے بلا ارادہ پوچھ لیا۔

”اس لیے کہ میں نے بہت پہلے ذہن کے کیونوس پر ایک تصویر بنائی تھی۔ پھر اُسے اپنی مرضی میرا مطلب ہے، اپنے پسند کے رنگوں سے سجایا تھا۔ اس کے بعد عمر گزری اسے کھوجتے کھوجتے۔“ اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگے۔

”آپ پوچھیں گی نہیں کہ میں نے اُسے کھوج لیا یا نہیں۔“ اور اب وہ اتنی نادان بھی نہیں تھی۔ اُن کی آنکھوں کے رنگ دیکھ کر ہی جان گئی کہ اس کے پوچھنے پر وہ کہہ دیں گے ہاں، میں نے اُسے کھوج لیا اور وہ تم ہو نہ نب شاہ۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ پہلے وہ اعتراف کریں اور بعد میں اس کی حقیقت جان کر نظریں چراتے پھریں۔ اس لیے اُٹھتے ہوئے بولی۔

”میں چلوں ڈاکٹریز دانی، مجھے کلاس لینا ہے۔“

”اچھا۔“ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر ہلکے سے سر ہلایا تو وہ ان کے پاس چلی آئی۔ اور اُسی روز اس نے سوچ لیا کہ وہ پہلی فرصت میں ڈاکٹریز دانی کو اپنے بارے میں بتائے گی کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچی کی ماں بھی ہے۔ پھر اگلے روز وہ یونیورسٹی

نہیں گئی اور اسے سے اگلے روز اس کی توقع کے عین مطابق ڈاکٹریز دانی پوچھنے لگے۔

”آپ کل کیوں نہیں آئی تھیں۔“

”میری بچی کی طبیعت خراب تھی۔“ اس نے کل سارا دن جو سوچا تھا، وہ فوراً کہہ دیا۔ پھر اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اُن پر نظر ڈالی تو خود ہی اندر ہی اندر خجل سی ہو گئی، کیونکہ وہ نہ چونکے تھے نہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ بلکہ یوں سنا جیسے اُن۔

”کیا ہوا تھا اُسے اور اب کیسی ہے۔“

”معمولی بخار تھا اب ٹھیک ہے۔“

”ڈاکٹر کو دکھایا؟“

”جی۔“ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بچوں کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی ہیں۔ اور اس سے اپنا ہوش ہی بھلا دیتی ہیں۔ حالانکہ انہیں سوچنا چاہیے کہ جس طرح انہیں بچے کی ضرورت ہے بچے کو اس سے کہیں زیادہ اُن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور انہیں بچوں ہی کی خاطر اپنا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔“ وہ اُن کی بات کے جواب میں کیا کہتی۔ خاموش ہی رہی تب انہوں نے پوچھا۔

”کتنے بچے ہیں آپ کے؟“

”بس ایک بیٹی ہے۔“

”اور آپ کے شوہر کہاں ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے کیا کرتے ہیں۔“

”میرے خدا!“ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ بات یوں بڑھے گی یہ تو

اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

”کوئی پرابلم ہے؟“ اُسے راہِ فرار ڈھونڈتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”جی..... نہیں۔“ شاید بتانا چاہتی تھی اور شاید بتانے سے قاصر بھی تھی۔ پھر وہ نفی میں

سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”ویسے تو آپ کو بھی سہارے کی ضرورت یہ نذیب شاہ۔ حیرت ہے کہ آپ نے اب تک اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا۔ سچ بتائیں قصد اپنی ذات سے نظریں چراتی رہی ہیں یا اپنے معیار کا کوئی ملا نہیں۔“

”مجھے کبھی ایسا خیال نہیں آیا۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”جب علی مراد سے میری شادی ہوئی تھی، اسی وقت ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا اور میں نے اپنی زندگی کے لیے ایک پلان بنا لیا تھا لیکن اُس پلان میں کہیں کسی مرد کا گزر نہیں تھا۔ اس کے بعد جب ثانیہ میری زندگی میں آئی تو میری ساری سوچیں اُسی کے گرد گھومنے لگیں۔“

”کمال ہے، زندگی کی اتنی بڑی حقیقت کو آپ نظر انداز کر گئیں۔ پہلے اپنے لیے اور اب بیٹی کے لیے۔“ کچھ دیر..... خاموش ہو کر اُسے دیکھتے رہنے پھر کہنے لگے۔

”تصور آپ کا نہیں ہے۔ اگر علی مراد نے ہی کبھی انجانے میں ہی سہی، احساسات کو نرمی سے چھو لیا ہوتا یا محبتوں کی ہی کوئی چھب دکھلائی ہوتی تو آپ اپنی ذات میں یوں مقید نہ ہو جاتیں۔ بلکہ زندگی میں اور جو بے شمار رنگ ہیں تو کوئی رنگ تو آپ کو ضرور متوجہ کرتا۔“ وہ اُن کی باتوں سے اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرنے لگی تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چلوں۔“ بس اسی قدر کہا اور کرسی پیچھے دھکیل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”نذیب شاہ۔“ انہوں نے پکار لیا تو وہ وہیں رُک کر بس ذرا سا پلٹ کر دیکھنے لگی۔

”دل راکھ کا ڈھیر ہو جائے تب بھی اندر کہیں کوئی چنگاری دہکتی رہ جاتی ہے۔ بس ذرا سی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد شعلہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر اجازت ہو تو میں.....“ وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے باہر نکل گئی۔

”نذیب شاہ! اب عمر بھر تمہیں یونہی راکھ ہونا ہے اور کوئی نہیں آئے گا اس راکھ میں چنگاریاں کریدنے۔“ کبھی اس نے خود سے کہا تھا اور اس رات اس نے بس ذرا سا اپنے اندر جھانکا تھا۔ ڈاکٹریز دانی کی باتوں نے دہلی ہوئی چنگاریوں کو یوں ہوا سے دی تھی کہ تن من دھیمی دھیمی آج میں سلگنے لگا تھا۔

”بیٹھ جائیں نذیب شاہ۔“ اُن کے لہجے میں تحکم نہیں تھا۔ اصرار بھی نہیں تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”چائے چلے گی۔“ انہوں نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ملازم کو بلا کر چائے لانے کے لیے کہا پھر کسی کتاب میں مصروف ہو گئے۔ ملازم چائے رکھ کر چلا گیا تب کتاب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولے۔

”کیا آپ دونوں میں علیحدگی ہو گئی ہے؟“

”علیحدگی کی بات تو جب ہو، جو ہم کبھی ساتھی رہے ہوں۔ ہم تو کبھی ساتھ رہے ہی نہیں۔“ سامنے بیٹھا شخص پتا نہیں سا رہ گیا، پلٹنا تاثر کرنا جانتا تھا کہ وہ اپنی کتاب زندگی کا ورق ورق کھولتی چلی گئی آخر میں کہنے لگی۔

”میرا خیال تھا، میں نے جینے کا ڈھنک سیکھ لیا ہے اور اب بقیہ زندگی سہولت سے کٹ جائے گی لیکن جب ثانیہ اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے تو میں بے حد ڈسٹرب ہو جاتی ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہیں ایسا نہ ہو علی مراد بچی کو دھتکار دے اور میری بچی ٹوٹ پھوٹ جائے۔“ وہ خاموش ہو گئی اور فوراً وہ بھی کچھ نہیں بولے۔ کتنے پل یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ جیسے سوچ کر کہنے لگے۔

”کیا ضروری ہے کہ ثانیہ کو باپ کی صورت میں صرف علی مراد ہی ملے۔ میرا مطلب ہے کوئی اور۔“

”نہیں ڈاکٹریز دانی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”میں نے اس طرح کبھی نہیں سوچا۔“

”اب تک نہیں سوچا ناں لیکن اب ضرور سوچیں اس لیے نذیب شاہ کہ کوئی بھی شخص خاص طور سے عورت کے لیے ایک طویل عمر تھا گزارنا بے حد دشوار ہے۔ پھر آپ کے پاس بیٹی ہے۔ جو اگر آج چھوٹی ہے تو کل بڑی بھی ہوگی اور اس وقت آپ محسوس کریں گی کہ اس کے لیے صرف آپ کی پناہ گاہ کافی نہیں ہے۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

اونچا تھا پھر بھی غیر ارادی طور پر ایک سیڑھی اور اوپر ہو گیا۔ اور اس کی غیر اختیاری حرکت پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

”اس آنچل سے میرے سر پر سائبان تانا تمہارے بس سے باہر ہے۔ خواہ تم مجھ سے کتنی ہی سیڑھیاں اوپر کھڑے ہو جاؤ۔ بے نیازی سے کہہ کر زینب شاہ نے ہلکے سے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں سے اپنا آنچل چھڑایا اور جیسے ہی پلٹی، وہ ایک دم ہوش میں آ گیا۔ یہی مرد کی فطرت ہے۔ خود جتنی بھی عورت کی تذلیل کر لے لیکن اپنی توہین ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ وہ اب نو عمر لڑکا نہیں تھا۔ ستائیس اٹھائیس سال کا میچور مرد تھا۔ اس نے ایک جیت میں درمیانی ساری سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے بازو کو گرفت میں لے لیا۔

”کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو۔“

”میرا بازو چھوڑ۔“ وہ آواز دبا کر سختی سے بولی۔ ”یہ گھر نہیں ہے۔ لوگوں کے سامنے تماشا بننے کا شوق ہے تو اس کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرو۔“

”مجھے تماشا بننے کا شوق نہیں ہے لیکن تمہیں ضرور تماشا بناؤں گا۔“ وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے بولا۔

”تم اور کرہی کیا سکتے ہو۔“ وہ تاسف سے کہہ کر جانے لگی پھر اچانک خیال آیا تو پلٹ کر بولی۔

”سنو، مریم نہیں جانتی کہ تم نے اپنی جس جاہل اور گنوار بیوی کا ذکر کیا ہے، وہ میں ہوں اور تم اسے بتانا بھی مت ورنہ۔“

”تم۔“ اس کے منہ سے مریم کا نام سن کر وہ حیرت میں مبتلا ہو کر بس اسی قدر کہہ سکا تھا کہ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ پھر جب گاڑی میں سے آنٹی کا بیک لے کر واپس آئی تو وہ ریلنگ کے پاس مریم کے ساتھ کھڑا تھا۔ مریم کی گود میں ثانیہ بھی تھی۔ وہ پہلے خاموشی سے نکل جانا چاہتی تھی پھر کچھ سوچ کر مریم کے پاس آگئی اور اس کی گود سے ثانیہ کو لیتے ہوئے بولی۔

”یہ ثانیہ تمہیں بہت تنگ کرنے لگی ہے۔“ پھر ایک نظر علی مراد پر ڈال کر سوالیہ نظروں سے مریم کو دیکھنے لگی تو وہ قدرے جھینپ کر بولی۔

”میں نے اُس روز آپ سے ذکر کیا تھا ناں، یہ ڈاکٹر علی ہیں۔“

”اچھا ہاں۔“ اس نے یاد آنے کی ایکٹنگ کی پھر اس سے بولی۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی ڈاکٹر علی۔“

”شکریہ۔“ وہ حتی الامکان لہجہ کو نارمل رکھ کر بولا اور اس کے بجائے ثانیہ کو دیکھنے لگا تو اُسے کہنا پڑا۔

”یہ میری بیٹی ہے ثانیہ۔“ وہ کچھ نہیں بولا۔ بلکہ ذرا سی گردن موڑ کر نیچے روڈ پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگا تو وہ بھی ان کے پاس سے ہٹ آئی۔ گوکہ علی مراد کا رویہ خلاف توقع نہیں تھا۔ پھر بھی اُسے رنجیدہ کر گیا تھا کہ بقیہ سارا وقت وہ ثانیہ کو لے کر ایک کونے میں بیٹھی رہی تھی۔

☆☆☆

غالباً عابدہ کی شادی میں علی مراد نے مریم کے والدین سے مراسم بڑھالیے تھے کہ اب وہ اکیلا اُن کے گھر بھی آنے لگا تھا۔ ہر دوسرے دن اس کی گاڑی گیٹ پر کھڑی نظر آتی۔ ایسے میں وہ ثانیہ کو اپنے ساتھ مصروف کر لیتی تاکہ وہ مریم کے پاس جانے کی بات نہ کرے۔ اور اگر ثانیہ پہلے سے نیچے ہوتی تو جب تک علی مراد اُن کے گھر موجود رہتا وہ بہت بے چینی سے ٹہلتی رہتی تھی۔ اُسے غالباً یہ خدشہ تھا کہ کہیں کسی دن علی مراد ثانیہ کو لے نہ جائے۔ گوکہ اس نے بچی سے لگاؤ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کا خیال تھا وہ محض اُسے تنگ کرنے کی غرض سے بھی ایسا کر سکتا ہے۔ جس روز ثانیہ نیچے علی مراد سے مل کر آتی۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے پوچھتی۔

”انکل نے تم سے کیا بات کی۔“ اور ہر بار ثانیہ کا ایک ہی جواب ہوتا۔

”انکل بات نہیں کرتے۔“ اُسے جہاں اطمینان ہوتا وہاں علی مراد کی سنگ دلی پر

افسوس بھی ہوتا کہ کیسا بات ہے بچی کو سامنے دیکھ کر بھی منہ موڑ لیتا ہے۔

پھر ایک دن آنٹی نے اُسے بتایا کہ ڈاکٹر علی مریم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کے بارے میں جو کچھ مریم نے اُسے بتایا تھا وہی سب باتیں آنٹی ایسے بتا کر اُس سے مشورہ لینے لگیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ سہولت سے دامن بچانا چاہتی تھی لیکن جس طرح آنٹی اُسے اپنا سمجھ کر بات کر رہی تھیں اس سے وہ دامن نہیں بچا سکی۔ پہلے یہی کہا جیسا آپ مناسب سمجھیں لیکن پھر سوچتے ہوئے بولی۔

”اُس کی پہلی بیوی خواہ کیسی بھی ہے آپ کو اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مرد کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا ہوتا کب دل میں کیا سا جائے اور وہ پہلی کی طرف لوٹ جائے۔“

”یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ آنٹی پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگیں۔

”اس لیے آپ پہلے ہی صاف کر لیں۔ اگر وہ اُسے نہیں رکھنا چاہتا تو چھوڑ دے۔ یہ اس لڑکی کے لیے بھی بہتر ہوگا۔ وہ نئی زندگی شروع کر سکے گی ورنہ ساری زندگی اس کے نام پر بیٹھ کر اُسے کیا ملے گا۔“

”میں نے یہ بات کہی تھی اس سے۔“ آنٹی نے کہا تو وہ پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”پھر کیا کر اُس نے؟“

”کہہ رہا تھا وہ لڑکی طلاق نہیں لینا چاہتی۔ کہتی ہے بے شک دوسری شادی کر لو، میرے ساتھ کوئی وابستہ نہ رکھو لیکن طلاق مت دو۔“ پھر خود ہی کہنے لگیں۔

”تم تو جانتی ہو، گاؤں کی گنوار لڑکیاں ایسے ہی زندگی گزار دیا کرتی ہیں۔ مرد خواہ پوچھے نہ پوچھے اس کے نام پر بیٹھ..... کر سمجھتی ہیں بڑا ثواب کما لیا۔ یہ نہیں سوچتیں کہ اپنی زندگی برباد ہوئی۔“

”جی جی“ وہ بس اسی قدر کہہ سکی جبکہ اس کا ذہن کہیں اور الجھنے لگا تھا۔ ”کیا فرق ہوا پھوپھی مراد اداں میں اور مجھ میں۔ صرف اتنا کہ وہ اب بھی اس مرد کی دست نگر ہے جو

اس پر ایک نگاہ غلط بھی ڈالنا پسند نہیں کرتا اور میں خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ کیا فائدہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا جب اپنے حق کے لیے لڑ نہ سکوں۔“

”گاؤں کی گنوار لڑکیاں ایسے ہی زندگی گزار دیا کرتی ہیں۔“ رات میں جب وہ تنہا تھی تو اُسے آنٹی کی باتیں یاد آئے لگیں۔

”مرد خواہ پوچھے نہ پوچھے اس کے نام پر بیٹھ کر سمجھتی ہیں بڑا ثواب کما لیا۔ یہ نہیں سوچتیں کہ اپنی زندگی برباد ہوئی۔“

”لیکن میں اپنی زندگی برباد نہیں کروں گی۔“ اُس کے اندر جوار بھانا اُٹھنے لگا۔ ”علی مراد کو یہ خوش فہمی۔ کیوں ہے کہ میں اس کے نام پر بیٹھی رہوں گی یا وہ قصداً مجھے اپنا پابند رکھنا چاہتا ہے۔“

سراسر خود غرضی و خود پسندی۔ کہ شاہراہ حیات پر چلنے کے لیے خود تو اپنے لیے نیا ساتھی منتخب کر لیا اور میرے لیے چاہتا ہے کہ ہمیشہ تنہا چلتی رہوں۔

”مجھے تنہا ہی چلنا تھا علی مراد۔“ وہ دل ہی دل میں اُسے مخاطب کر کے بولی۔

”لیکن تمہاری سوچ کی پستی مجھے نئے راستے دکھا رہی ہے جنہیں اگر میں نے خود پر بند کر لیا تو برادری میں ہر دور میں تمہارے جیسے مرد پیدا ہوتے رہیں گے اور دوسری صورت میں بیٹیوں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے لوگ کم از کم..... نرنب شاہ کو ضرور سوچیں گے۔ اور نرنب شاہ اپنی برادری کی لڑکیوں کے لیے مثال بنے گی۔ انہیں یہ پکھی دے گی کہ زندگی پر اُن کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اُن کے مردوں کا۔“

اُس نے فیصلہ گن انداز میں سوچا تھا اور اگلے ہی دن علی مراد کے آفس چلی گئی۔

”نرنب شاہ۔“ اُسے دیکھ کر وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں خود بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔“

”کس سلسلے میں؟“ اُسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا پھر بھی یکسر انجان بن گئی اور بے حد

سرسری انداز میں پوچھا

”یہ بھی بتا دوں گا، پہلے تم بتاؤ چائے پیوگی یا بلکہ یہ بتاؤ یہیں بیٹھ کر بات کریں یا کہیں اور چلیں۔“ وہ انٹرکام پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

”اگر یہاں کوئی حرج نہیں ہے تو یہیں ٹھیک ہے۔“

”اوکے۔“ اس نے انٹرکام پر چائے کے لیے کہا۔ پھر بیٹھا تو اُسے نظروں کی گرفت میں لیتے ہوا بولا۔

”ہاں اب بتاؤں کیسے آتا ہوا؟“ وہ فوراً کچھ نہیں بولی بلکہ پہلے کچھ باتوں کو ذہن میں ترتیب دیا پھر کہنے لگی۔

”وکیو علی مراد، تم نے تو مریم اور اس کے گھر والوں کو جو کہانی سنائی یا حقیقت کہہ لو۔ مجھے بہر حال اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تمہاری صرف ایک بات کی تمہارے سامنے ترویید کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے تمہارے نام پر بیٹھے رہنے کا کوئی شوق نہیں۔“

”گویا طلاق چاہتی ہو۔“ پھر وہی ضد والی بات کہ ”تم اگر چاہو تو میں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں۔“ اور وہ اس کے لیے پہلے بھی تیار تھی فوراً بولی۔

”میں تمہاری منت کرنے نہیں آئی علی مراد۔ محض تمہیں بتانے آئی ہوں۔ تم طلاق دینا چاہو تو دے دو بات سہولت سے ختم ہو جائے گی ورنہ مجھے تم سے علیحدگی کا دوسرا راستہ بھی معلوم ہے۔“

”میں جانتا ہوں تم بہت سے راستوں سے آشنائی حاصل کر چکی ہو۔“ وہی ایک عام سے روایتی مرد والا شبہات سے پر لہجہ اور انداز جس پہ وہ اندر ہی اندر تلملانے کے باوجود بڑے ضبط کا مظاہرہ کر گئی۔

”نہیں تم کچھ بھی نہیں جانتے۔“

”اچھا۔“ وہ خواہ مخواہ ہنسا پھر اُسے سنجیدہ دیکھ کر فوراً ہنسی روک لی اور خود بھی سنجیدہ

ہوتے ہوئے بولا۔

”میں بھی تم سے اسی سلسلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اپنی برادری کے رسم و رواج اور فرسودہ قسم کی روایات تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ اور میں ان روایات سے بغاوت کرک اس لیے نہیں نکلا تھا کہ صرف اپنی زندگی بنالوں۔ مجھے تمہارا بھی خیال رہا اور میں چاہتا تھا کہ تم خود اپنے بارے میں سوچو۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک آس پر مت بیٹھی رہو۔“ اور زینب شاہ کا پورا وجود اچانک گہری خاموشیوں کے حصار میں مقید ہو گیا۔ ایک نکل اُسے دیکھے گئی جو کہہ رہا تھا۔

”میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اکثر لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی کیوں لگتی ہیں۔ چہروں پر یاس و حسرت، آنکھوں میں وحشت اور آہٹوں پر چونکنے کے بجائے دہشت ہیں۔ یقیناً وہ سب اس بات سے خوفزدہ تھیں کہ کہیں اُن کی قسمتوں کا فیصلہ عمر میں اُن سے کئی گنا چھوٹے لڑکوں کے ساتھ نہ کر دیا جائے۔“ اُس نے ایک گہری سانس لے کر ہونٹ بھیج لیے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”مجھے آج بھی تمہارا ان وہ روپ یاد ہے زینب شاہ۔ جو دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف نظر آتا تھا۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر جب تم تھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لیتیں۔ پھر راکھ میں سے چنگاریاں کریدتے ہوئے کبھی کبھی بس لمحہ بھر تمہاری آنکھوں میں دھنک رنگ اُترتے تھے اور اُس پل تم مجھے اتنی اچھی لگتی تھیں کہ میرا دل چاہتا تھا۔ میں اُن رنگوں کو ہمیشہ کے لیے تمہاری آنکھوں میں امر کر دوں۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ میرا تمہارا نکاح ہو گیا اس کے بعد تمہاری آنکھوں میں ایسی وحشتیں سائیں کہ میں تم سے ڈرنے لگا اور میں تم تمہیں بتاؤں زینب شاہ۔ کہ میں نے گاؤں اس لیے نہیں چھوڑا تھا کہ میں اس وقت باغی ہو گیا تھا۔ نہیں، اُس وقت تو مجھے اتنی سمجھ بھی نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ تمہاری شکل دوسری لڑکیوں کی طرح ہو گئی تھی اور کچھ کچھ پھوپھی مرادوں سے بھی ملنے لگی تھی۔ پھر بہت سارا وقت گزرنے کے بعد جہاں مجھ پر اور بہت ساری باتوں کا اور اک ہوا وہاں میں نے یہ بھی جانا کہ سب شکلیں ایک جیسی کیوں لگتی ہیں اور اُسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میرے اختیار میں زیادہ نہیں ہے

پھر اٹھتے ہی بولی۔

”میں اب چلوں۔ ثانیہ اسکول سے آچکی ہوگی۔“ اور علی مراد نے خاصا مایوسی ہو کر کرسی کی بیک سے سرٹکا لیا اور اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ دروازے کے قریب وہ رکی پھر پلٹ کر کہنے لگی۔

”سنو علی مراد، جب یہ طے ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا اور یہ بھی کہ میں تمہارے نام پر بیٹھی نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے میرا خیال ہے تم مریم سے شادی کرنے سے پہلے مجھے طلاق دے دو۔“

”نہنب۔“ وہ پتا نہیں کیوں اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ کہنے کے لیے غالباً الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ باہر نکل آئی۔ اور آفس کے سامنے اسٹاپ پر کھڑی ہونے کے بجائے وہ یونہی چلتی چلی گئی۔ علی مراد نے اسے پہلا قطرہ بنا تو دیا تھا لیکن اب اُسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے پوری برادری ہاتھوں میں سنگ لیے اور اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہو۔ اس نے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ موڑ کاٹتے ہوئے اگر دوسری طرف سے آتی گاڑی نے بروقت بریک نہ لگائے ہوتے تو وہ روڈ پر پڑی ہوتی۔

”نہنب شاہ۔“ وہ اپنے حواس درست کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ دیکھا ہی نہیں ڈاکٹر یزدانی گاڑی سے نکل کر اس کے پاس آگئے۔

”آپ ٹھیک تو ہیں۔“ وہ پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔ تب وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”آئیے گاڑی میں بیٹھیں۔“ انہوں نے کہا تو وہ خاموشی سے اُن کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”کہاں جانا ہے؟“ وہ احتیاط سے گاڑی بیک کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”گھر۔“

”گھر۔“ انہوں نے دہرایا پھر اس کے گھر کا پتہ پوچھنا چاہتے تھے۔ معاصر۔

میں اس پر نظر پڑی تو خاموش ہو رہے۔ کیونکہ وہ بہت آپ سیٹ لگ رہی تھی۔ کچھ دیر

تب بھی اتنا تو رہے کہ میں صرف ایک شکل کو ہی اس کا اصل روپ دے دوں۔ تمہاری آنکھوں سے وحشتوں کی دھند صاف کر کے انہی رنگوں کی برسات بخش دوں جو تمہیں سب سے الگ کرتی تھی۔

انہی دنوں میں بی اے کر گاؤں گیا تھا اور تمہیں اتنا پر اعتماد دیکھ کر اور یہ جان کر تم نے انٹر کر لیا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش ہوا تھا اور اُسی وقت میں تمہارے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر یہ بات کرنا چاہتا تھا جو تم آج کر رہی ہو۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ میں وہاں سے چلا آیا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

”اس کے بعد میں نے تمہیں لکھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں اور تم نے میری اس بات کو غلط انداز سے سوچا۔ تم غالباً یہ سمجھی تھیں کہ میں اپنا دامن بچانا چاہتا ہوں۔ نہیں نہنب شاہ ایسی بات نہیں تھی بلکہ میں تو تمہیں پہلا قطرہ بنانا چاہتا تھا کہ تم اتنی پر اعتماد اور مضبوط ہو جاؤ کہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاؤ۔ جسے برادری کے سب لوگ سنیں۔ خاص کر وہ لڑکیاں جن کی آنکھوں میں سپنوں کے وحشتیں اُتری ہیں تاکہ آئندہ کبھی ان کے ساتھ ایسا ہو تو تمہاری دیکھا۔ یکسی وہ بھی آواز اٹھائیں لیکن تم.....“ وہ خاموش ہو کر آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ پھر طویل سانس لے کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ جو تیزی اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی کچھ نزوس ہو کر سر جھکا گیا۔

”اب بتاؤ کیا چاہتی ہو؟“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں تک آنے سے نہیں روک سکا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ وہ بمشکل بول سکی۔

”اپنے منہ سے نہیں کہو گی۔“

”یہاں کون سے برادری والے بیٹھے ہیں جو میری آواز سنیں گے۔“

”میں جو ہوں اور بڑی شدید خواہش رکھتا ہوں کہ میری برادری کی کوئی لڑکی اپنے لیے آواز اٹھائے۔ اگر یہاں کوئی نہیں ہے۔ تب بھی میرے توسط سے تمہاری آواز سب تک پہنچ جائے گی۔“ اُس نے کتنی دیر سے سینے میں دبئی سانس کو ہونٹوں کی قید سے آزاد کیا

تک خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے پھر کہنے لگے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

”جی!“

”پھر کیا بات ہے؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“

”اچھا۔“ وہ ہلکے سے ہنسے۔

”شاید آپ کو یاد ہو، ایک بار میں نے کہا تھا کہ آپ واحد خاتون ہیں جو جھوٹ بولتے ہوئے بھی اچھی لگتی ہیں۔“

”اس وقت میں نے کیا جھوٹ بولا ہے۔“

”یہی کہ کوئی خاص بات نہیں جبکہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے ساتھ جو بھی بات ہو گئی ہے۔ وہ آپ کے لیے اتنی اہم ہے کہ آپ ابھی تک اُسی کے زیر اثر ہیں۔ اور آپ کو یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ روئیں یا ہنسیں۔“

”ڈاکٹر یزدانی!“ اس نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا تو وہ مر مر میں اُس پر نظر ڈال کر بولے۔

”کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے نذیب شاہ۔ متضاد کیفیات انسان کو پریشان..... کر دیتی ہیں۔ میری مائیں تو پہلے خوب جی بھر کر رو لیں۔ مدتوں سے جو آپ کے گرد اداسیوں اور مایوسیوں کے بادل چھائے ہیں۔ رونے سے جہاں وہ چھٹیں گئے وہاں دل کے درپچوں پر لگے قفل بھی ٹوٹ جائیں گے۔“ قدرے توقف کے بعد بولے۔

”رونے کے لیے اگر کندھے پر سر رکھنا ضروری ہو تو میں اپنا کندھا مستعار دے سکتا ہوں۔ لیکن اس شرط پر کہ آج کے بعد پھر کبھی نہیں رونا۔“ اور وہ اُن کے کندھے پر تو نہیں ہاتھوں میں چہرہ اچھپا کر رو پڑی۔ انہوں نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور ایک افسردہ سی مسکراہٹ اُن کے لبوں پر اُن ٹھہری تھی۔

”بس کرو نذیب شاہ۔“ کتنی دیر بعد جب وہ کسی طرح چپ نہیں ہوئی تب وہ بڑی منت سے بولے۔

”اس طرح مت روؤ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ بخدا میں نے کبھی تمہیں روتے ہوئے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کیا۔“ اس نے بہت آہستگی سے چہرے سے ہاتھ ہٹائے پھر چادر کے پلو سے آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی۔

”اب کیا محسوس کر رہی ہیں؟“ کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

”قدرے بہتر۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ”لیکن آپ کیسے جانتے تھے کہ میں رونا بھی چاہتی ہوں اور ہنسا بھی۔“

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ برسوں پہلے میں نے ذہن کے کینوس پر ایک تصویر بنائی تھی پھر اُسے اپنی مرضی اور پسند کے رنگوں سے سجایا تھا تو کیا اپنے ہی رنگوں کو میں نہیں پہچانوں گا۔“ کچھ دیر رُک کر بولے۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ اُسی روز جان گئی تھیں پھر بھی اس وقت اگر میں اعتراف کر لوں تو کیا بُرا ہے۔ میرے جذباتوں میں کہیں کھوٹ نہیں تھی نذیب شاہ جی تو آپ حقیقت بن کر میرے سامنے آ گئیں۔ یقین کریں میرے پاس آپ کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے سارے سکھ، ساری چھوٹی بڑی خوشیاں سنبھال رکھی ہیں۔ محبتوں کی حسین رگڑ پر چلتے ہوئے جب آپ میرے گھر تک آئیں گی تو احسن یزدانی اپنی قسمت پر نازاں و شاکر ہو کر وہ سارے سکھ، وہ ساری خوشیاں آپ کے قدموں میں نچھاور کر دے گا۔“

”لیکن میں تنہا نہیں ہوں یزدانی۔ میرے ساتھ ثانیہ بھی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولے۔

”میری محبتوں کا سائبان بہت وسیع ہے نذیب، جس میں تمہاری ذات سے وابستہ ہر شے سما سکتی ہے اور پھر ثانیہ تو تمہاری ذات ہی کا ایک حصہ ہے۔“

”اس طرف موڑ دیں۔“ وہ راستے کی نشاندہی کر کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اصل

میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کہے۔ اُن کی بات پر دل اگر یقین کر بھی رہا تھا تو بھی کچھ اندیشے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ گھر کے سامنے گاڑی رکھا کر کچھ کہنے بغیر اترنے لگی تو وہ اسے روک کر بولے۔

”سنو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ فیصلے کا اختیار تمہیں ہے اور جو بھی فیصلہ کرنا اپنا اور بچی کا مفاد سوچ کر کرنا۔ لیکن پلیز کسی بھی مقام پر میری محبت پر شبہ مت کرنا کہ ایک یہی بات مجھے مار ڈالے گی۔“ اس نے لمحہ بھر کو اُن کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اسی خاموشی سے اتر گئی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ پہلے کئی دن تک تو وہ ابھی ہوئی سی رہی۔ کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔ پھر جب اپنے آپ کو حالات کو سمجھنے اور سوچنے پر آمادہ کیا تو اُسے ڈاکٹر یزدانی کے پروپوزل میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئی۔ کیونکہ اس کے پیش نظر اپنے آپ سے زیادہ ثانیہ کی ذات تھی اور ظاہر ہے جب یزدانی، ثانیہ کو محبت کے ساتھ قبول کر رہے تھے تو پھر اُسے اور کیا چاہیے تھا جبکہ اُس کے لیے بھی بقول یزدانی کے اُن کے پاس بہت کچھ تھا۔ پھر یہ تو فطری سی بات ہے کہ جب ہر طرف سے طمانیت کا احساس مل جائے تو پھر اپنی ذات سے غفلت بھی نہیں رہتی۔ اور نذیب شاہ ابھی اتنی بوڑھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ دل کے درد اذوں پر کوئی محبت سے دستک دیتا رہے اور وہ مسلسل اپنے کان بند رکھے۔ بہت آہستگی سے اس نے دل کے سارے کواڑ کھول دیے اور آنکھوں کے بھی جن میں دھنک رنگ برسات اترنے کو بے تاب تھی۔

اُن دنوں وہ اپنے آپ پر کچھ زیادہ توجہ دینے لگی تھی اور اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ بات لیے بات کھلکھلا کر کہنے لگی ہے۔ ایک دن مریم نے رازداری سے پوچھ لیا۔

”سچ بتائیں۔ نذیب باجی! کیا پالیا ہے؟“

”کیا.....؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کہیں علی مراد نے کوئی سندیرہ تو نہیں بیجا۔“

”علی مراد نے!“ وہ جیسے خوابوں سے چونکی تھی۔ نظریں مریم اور ذہن کہیں اور بھٹکنے لگا تھا۔ اُس روز کے بعد سے پھر علی مراد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ اُس نے کہا تھا کہ جلد ہی علیحدگی کے سلسلے میں کارروائی کر کے اُس سے رابطہ کرے گا۔ اور ابھی تک اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اب تک تو اُسے فکر نہیں تھی لیکن ابھی جب مریم نے علی مراد کے سندیرے کی بات کی تب وہ سوچنے لگی اور اُسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوئی کہ وہ اس مسئلے سے اتنی لاپرواہ کیسے وہ گئی ہے جب کہ آئندہ زندگی کی بنیادیں بھی وہ اسی وقت تک نہ رکھ سکتی تھی جب تک وہ مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔

”کیا میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔“ مریم اُسے سوچوں میں گم دیکھ کر نادم ہو کر بولی تو وہ ایک بار پھر چونکی اور سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر آپ کیا سوچنے لگی تھیں؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائی۔

”نہیں زنیب باجی! کوئی بات ضرور ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔“ مریم یقین سے بولی۔ پھر اصرار کرنے لگی۔ ”بتائیے ناں۔ آخر مجھ سے بھی تو جب آپ نے ڈاکٹر علی کے بارے..... میں پوچھا تھا تو میں نے صاف صاف بتا دیا تھا آپ بھی بتائیں۔“

”کیا بتاؤں۔“ وہ یونہی ہنس پڑی۔

”آپ کے بدلے بدلے انداز اس بات کے غماز ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی آچکا ہے۔“ مریم کی آنکھوں میں معنی خیزی اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ نے اُسے بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

”تم تو اچھی خاصی سمجھدار ہو گئی ہو مریم! اور یہ یقیناً ڈاکٹر علی کی محبت کا اثر ہے۔“

”آپ میری بات چھوڑیں۔ اپنی سناں کہ آپ کے ہونٹوں نے بات بے بات

مسکرانے کے ڈھنگ کہاں سے سیکھے ہیں۔“

مریم غالباً جاننے کا تہہ کر چکی تھی، اس لیے اس وقت تک اس کے پیچھے پڑی رہی جب تک اس نے ہتھیاڑ نہیں ڈال دیے۔

”ڈاکٹر احسن یزدانی، وہیں یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔“ اُس نے بتایا پھر کہنے لگی۔
”پہلے میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب جب کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی ہوں تو بقیہ زندگی سہولت سے گزر جائے گی، لیکن پھر ڈاکٹر یزدانی نے مجھے احساس دلایا کہ میں زیادہ عرصہ تک تنہا حالات کا مقابلہ نہیں کر سکوں گی۔“
”کیا انہوں نے آپ کو پروپوز کیا ہے؟“

”ہاں!“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ جلدی سے علی مراد سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔“
جس انداز سے مریم نے یہ بات کہی، وہ بغور اُسے دیکھنے لگی، اگر اس وقت وہ اسے بتا دیتی کہ علی مراد اور ڈاکٹر علی ایک ہی شخصیت ہے تو یقیناً اسے خاصا شاک لگتا۔ اور ہو سکتا ہے وہ اس سے متنفر بھی ہو جاتی اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں علی مراد فطرانِ اُمرا نہیں تھا پھر اس نے مریم سے اپنا شادی شدہ ہونا بھی نہیں چھپایا تھا جس سے ظاہر تھا کہ اسے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بہر حال اس وقت اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مریم کو کوئی شبہ ہو۔ لیکن وہ سوچ ضرور چکی تھی کہ کسی مناسب وقت میں مریم کو بتائے گی۔ اس وقت وہ خامی سنجیدگی سے بولی۔
”میں اس سلسلے میں مراد سے ملتی تھی۔“

”پھر کیا کہا اس نے؟“ مریم نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

”کہتا کیا۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا بس میرے منہ سے سننا چاہتا تھا۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ”مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ہے مریم وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اگر ہماری عمروں میں اتنا زیادہ فرق نہ ہوتا یا ہماری شادی اُس دور میں نہ ہوتی جب وہ بچہ اور میں بڑی تھی تو شاید ہم ایک دوسرے کو قبول کر لیتے۔ لیکن قبل از وقت شادی نے ہمارے

درمیان جو خلج حائل کر دی اُسے پاشا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ بہر حال اب دیکھو، وہ کب اس نام نہاد بندھن سے مجھے بھی آزاد کرتا ہے اور خود بھی آزاد ہوتا ہے۔“

”ثانیہ کے بارے میں اُس نے کوئی بات کی تھی؟“ مریم ہتا نہیں کس خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”لیکن آپ ضرور بات کر لیں ایسا نہ ہو کل کلاں کو وہ ثانیہ کا دعویٰ دار بن کر آجائے۔“
مریم بڑی سمجھداری کی بات کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔
”ثانیہ کی طرف سے میں زیادہ فکر مند یوں نہیں ہوں مریم! کہ علی مراد سے میرا ماموں زاد والا رشتہ تو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اگر ثانیہ اس کے پاس چلی بھی جائے تو یہ خدشہ تو نہیں ہوگا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین کر لے گیا ہے۔ وہ بہر حال اس کا باپ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اس کے دل میں بیٹی کے لیے محبت جاگے گی تو میں سمجھتی ہوں یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔“

”چلیے۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیے کہ ڈاکٹر یزدانی سے کب مل رہی ہیں۔“

”کیا کروگی اُن سے مل کر؟“

”انہیں بتاؤں گی کہ آپ کتنی اچھی ہیں۔“

”تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ مجھے جانتے ہیں۔“

”ارے!“ مریم زور سے اُسی تو وہ سراونچا کر کے آسمان پر دور تک نظریں دوڑانے لگی۔

وہ شدت سے علی مراد کی طرف سے کسی بات کی منتظر تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے اس روز کے بعد سے خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے۔ اس کے کہنے کے باوجود طلاق کے سلسلے میں پیش رفت کیوں نہیں کی۔
”کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا ارادہ بدل گیا ہو۔“

وہ پھر اندیشوں میں گھرنے لگی۔ ایک دو بار اُس کے آفس فون کیا تا کہ اس سے معلوم کر سکے لیکن وہ ملا ہی نہیں۔ تب کچھ مایوس سی ہو کر اپنا محاسبہ کرنے بیٹھی تو احساس ہوا کہ وہ نئی راہوں میں بڑی دور تک نکل گئی ہے جہاں سے واپسی کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ ڈاکٹریز دانی نے بڑی خوبصورتی سے اس کے احساسات کو چھو کر اپنا آپ منوایا تھا کہ اب اگر وہ کوشش بھی کرتی تو دامن نہیں جھٹک سکتی تھی اور وہ دامن جھٹکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”زینب شاہ!“ اُس روز ڈاکٹریز دانی نے اُسے روک لیا۔ ”میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اذیت دینا بھی جانتی ہیں۔“

”میں.....!“ اس نے حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کیا۔

”دوماہ سے مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر آپ کتنے اطمینان سے ہیں۔“

”میں اطمینان سے نہیں ہوں۔“ وہ فوراً بولی۔

”کیا کوئی پرابلم ہے؟“

”ہنا نہیں۔ میرا مطلب ہے، ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”کیوں.....؟“

”کیونکہ ابھی پرانے بندھن کا طوق میرے گلے میں پڑا ہے۔“

”تو اتار پھینکیے اسے یا ڈرتی ہیں۔“

”نہیں۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔ بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ

ان کے پاس سے چلی آئی تھی۔

اُسے واقعی احساس تھا کہ ڈاکٹریز دانی کس شدت سے اس کے جواب کے منتظر ہیں۔ جیسی اس روز وہ یونیورسٹی سے نکلی تو سیدھی علی مراد کے آفس چلی گئی۔ وہاں سے معلوم ہوا۔ وہ پچھلے کئی روز سے چھٹی پر ہے۔ تب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا کرے۔ اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا ورنہ وہاں بھی چلی جاتی۔ مجبوراً گھر آگئی۔ وہ خاصی دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بیک اور چادر پھینک کر بیڈ پر ڈھسے سی گئی۔

کچھ دیر بعد ثانیہ بھی نیچے سے آگئی تو اس نے پہلے اس سے کھانے کا پوچھا جب اس سے بتایا کہ وہ مریم آنٹی کے ساتھ کھانا کھا کر آئی ہے۔ تب وہ اسے پہلو میں لٹا کر تھکنے لگی اور اسے سلاتے سلاتے وہ خود بھی سو گئی تھی۔

شام میں ابھی تو حسب معمول پہلے چولہے پر چائے کا پانی رکھا پھر ثانیہ کا منہ دھلا کر اس کے کپڑے بدلے۔ اس کے بعد خود منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی۔ اور ابھی چائے دم کر رہی تھی کہ مریم آنٹی۔ اس نے دوسرا گم بھی اتار لیا پھر دونوں میں چائے ڈال کر باہر لے آئی۔

”میں ابھی پی کر آ رہی ہوں۔“ مریم اس کے دونوں ہاتھوں میں مگ دیکھ کر کہنے لگی۔
”کوئی بات نہیں۔ اور پی لو۔“ اس نے زبردستی ایک مگ اسے تھما دیا۔ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھی تو کہنے لگی۔

”بڑے دنوں سے عابدہ نہیں آئی۔“

”اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

”وہی جو شادی کے بعد ہوتا ہے۔“

”اچھا!“ مریم کے شرارت سے کہنے پر وہ ہنسی بیٹھکی مبارک ہو۔“

”شکریہ! آپ کو بھی مبارک ہو۔“ وہ ہلکے سے سر ہلا کر چائے پینے لگی۔ پھر اچانک

کچھ خیال آیا تو کہنے لگی۔

”جب وہ عابدہ کے سرال والوں کے ساتھ پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا۔ اس روز میں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔“

”پھر آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں تھا۔“

”اُس وقت میں نے کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن جب میں نے تمہیں اُس کے ساتھ دیکھا تب میں نے تم سے پوچھا تھا اور تمہیں کیونکہ اس کے شادی شدہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے میں نے نہیں بتایا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اُسے محض میری وجہ سے رنجیکٹ کرو۔ مجھے تو ویسے بھی اُس کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ ہاں اگر اس میں کوئی اور بُرائی ہوتی تب میں ضرور بتاتی اور تمہیں منع بھی کرتی کہ اُس سے مت ملو۔“

”لیکن باجی! مریم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔“

”خواخواہ پریشان مت ہو۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”کیا تمہیں یاد نہیں ہے۔ میں نے خود تم سے کہا تھا کہ مجھے خوشی ہے، علی مراد نے ایک اچھی لڑکی منتخب کی ہے۔ اس طرح یقین رکھو۔ علی مراد بھی بہت اچھا ہے۔“

”لیکن.....!“

”میرے حوالے سے مت سوچو مریم! بلکہ مجھے درمیان میں لاؤ ہی مت۔ ورنہ میں کہوں گی کہ میں نے تمہیں بتا کر غلطی کی حالانکہ میں نے محض اس لیے تمہیں بتایا ہے تاکہ بعد میں کسی اور کی زبانی سن کر تمہیں دکھ نہ ہو۔“

”مجھے اب بھی دکھ ہو رہا ہے۔“

”بے وقوف ہو تم۔ دکھ کی بات تو جب ہوتی جب تم نے انجانے میں میرے حق پر ڈاکا ڈالا ہوتا جبکہ یہاں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے تو پلیز تم اپنے آپ کو مجرم مت محسوس کرو۔“

وہ مسکرا کر اسے انجانے احساس سے نکالنے لگی۔ جب کہ مریم بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے علی مراد کی طرف سے رجسٹری موصول ہوئی۔

”سنو۔ بہت دنوں سے تمہارے ڈاکٹر علی بھی نظر نہیں آئے۔“

”وہ اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔“ مریم نے بتایا تو وہ کتنی دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔

”آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔“

”کس سلسلے میں گئے ہیں؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

”غالبا اپنے والدین کو لینے گئے ہیں تاکہ باقاعدہ یہاں پر پوزل بھیج سکیں۔“

”اچھا.....“ وہ اس قدر کہہ کر ہٹا نہیں کیا سوچنے لگی۔ پھر خیال آیا تو پوچھا۔ ”اور اپنی پہلی بیوی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے انہوں نے۔“

”کہہ رہے تھے۔ اسے طلاق دے دیں گے، حالانکہ میں نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی۔“

”ایک بات بتاؤ مریم! وہ اچانک اُسے بتانے پر آمادہ ہوئی۔“ اگر کبھی تمہارا اس عورت سے سامنا ہو جائے تو تمہارے کیا احساسات ہوں گے۔“

”پتا نہیں باجی؟ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔“

”چلو اب فرض کر لو کہ وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔“ یہ بات کرتے ہوئے وہ بالکل غیر ارادی طور پر اپنی طرف اشارہ کر گئی تھی۔ کہ مریم غیر یقینی سے بولی۔

”آپ.....!“ اُس نے فوراً اپنے سینے سے ہاتھ ہٹایا لیکن مریم جان گئی تھی اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”سچ بتائیں باجی! کیا آپ ہی ہیں؟“

”ہاں میں ہوں۔“ اسے اعتراف کرنا پڑا۔

”تو کیا علی مراد۔“

”ہاں علی مراد ہی ڈاکٹر علی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”کیا آپ شروع سے جانتی تھیں؟“ مریم کی عجیب حالت ہو رہی تھی اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو تھپکا پھر کہنے لگی.....

اس نے غلت میں لفافہ چاک کیا تو پہلے کچھ کاغذات ہاتھ آئے۔ وہ بغور دیکھنے لگی اور دھیرے دھیرے اس کے آس پاس سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ حالانکہ یہ شروع سے طے تھا اور اب تو وہ ان کاغذات کی منتظر بھی تھی پھر بھی اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے بہت خاموشی سے ان کاغذات کو تکیے کے نیچے کھسکا دیا اور یہ شدہ کاغذ کھول کر پڑھنے لگی۔

نائب شاہ! میں نے تمہاری آواز برادری والوں تک پہنچا دی ہے۔ بڑوں کے بارے میں مت پوچھو، سب حیران ہیں اور ہمارا مقصد سب کو حیران کرنا تو نہیں تھا بلکہ ہم تو انہیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کے غلط فیصلے ہماری زندگیوں پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نوعمر لڑکیوں کی آنکھوں سے وحشتیں بھی سمیٹنا چاہتے تھے۔ کبھی آؤ تو دیکھنا، اب ان آنکھوں میں کیسے الیلے سہانے خواب سجے ہیں۔ طلاق کے کاغذات بجھوار ہا ہوں۔ اس نام نہاد بندنہ کو توڑنے کے ساتھ یہ دعا بھی ہے کہ آئندہ زندگی میں تم بہت خوش رہو۔ زندگی کے خوبصورت راستوں میں تمہیں ایسا ہمسفر ملے۔ جو تمہارے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔

اُس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی چپ چاپ پلکوں سے نیچے تک چھلک آئی جسے انگلیوں پر سمیٹ کر اس نے بہت آہستگی سے اپنا سر بیڈ کی پٹی پر رکھ لیا۔ خوشیاں اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں لیکن اس نے سوچا۔ پہلے اسے اپنے اندر کی آرزو کیوں کو سمیٹ لینا چاہیے۔ بندنہ خواہ کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، ٹوٹ جائے تو دکھ تو ہوتا ہی ہے۔

☆☆☆